# غازی

پرویز بلگرامی

دہلی کے درودیوار رنگین ہو رہے تھے، بے گناہوں کا خون گلی کوچوں میں بہہ رہا تھا، ننھے ننھے بچوں کو کرپانوں پر اچھالا جا رہا تھا۔ معصوم بچیوں کی آبرو سے کھیلا جا رہا تھا۔ کبھی قرول باغ کے اجڑنے کی خبر آتی تو کبھی پہاڑ گنج سے دھواں اٹھتا دکھائی دیتا۔ مسلمانوں پر زمین تنگ کر دی گئی تھی، کئی دوسرے علاقوں کی طرح کشمیری گیٹ کے مسلمان بھی اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن سے متصل ہونے کی وجہ سے پورا علاقہ ہندو بلوائیوں کا ہدف بنا ہوا تھا۔ ساداتوں کی وہ چھوٹی سی بستی، ہندوؤں کی نظروں میں چبھ رہی تھی۔ کشمیری گیٹ سے سکڑ کر لوگ پنجہ شریف میں جمع ہو گئے تھے۔ ''جو بولے سونہال، ست سری اکال'' کے جواب میں ادھر سے بھی ''نعرہ تکبیر'' سنائی دے جاتا۔

ہر روز کے ٹکراؤ سے خوفزدہ ہو کر زیادہ تر لوگوں نے علاقہ خالی کر دیا تھا اور مٹیا محل بلی ماراں کی طرف بھاگ لیے تھے۔ میری امی نے بھی ابو کو مشورہ دیا کہ بلی ماراں چلے چلئے لیکن ابو نے صاف انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا ''اسٹیشن سے سیس گنج گردوارہ تک سکھ اور ہندو ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں، وہ سب بھوکے بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھے ہیں۔ ہم اسی محلے میں محفوظ ہیں۔ باہر نکلے کہ انھوں نے گھیرا۔''

لیکن یہ ان کا خیال خام تھا۔ صبح اذان کے وقت ٹڈی دل کی طرح ہندو ہمارے محلے پر ٹوٹ پڑے۔ گلیاں لاشوں سے پٹ گئیں۔ دم بہ دم مسلم جیالوں کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی۔ انھی میں میرے ابو بھی شامل تھے۔ ہم سب زندگی سے مایوس ہو گئے تھے کہ غیبی امداد کی طرح ایک ٹرک نمودار ہوا۔ بلوائیوں کو روندتا، کچلتا گلی میں داخل ہونے والا ٹرک رکتے ہی ڈرائیور کی کھڑکی سے فائرنگ ہونے لگی۔ بلوائی تو پہلے ہی گھبرا گئے تھے، رہی سہی کسر فائرنگ کے دھماکوں نے پوری کر دی۔ بزدلوں کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ اپنے لیڈر کی لاش بھی اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

سکوت چھاتے ہی ٹرک کا دروازہ کھلا اور ایک پٹھان باہر نکلا۔ سنسنان ہو جانے والی گلی کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے بندوق کو کندھے سے لٹکایا اور لاشوں کو پھلانگتا ہوا آگے

بڑھنے لگا۔ یکا یک وہ چونک کر رک گیا۔ اس کی نگاہیں ایک لاش پر ٹھہر گئی تھیں۔ اس نے جھک کر لاش کو اٹھالیا۔ دونوں ہاتھوں پر سنبھالی ہوئی لاش کو وہ ایسے دیکھ رہا تھا جیسے آنکھوں کی زبان سے کچھ پوچھ رہا ہو۔

اپنی امی اور باجی کے ساتھ چوبارے میں کھڑا میں بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے کپڑے اور ٹرک پر لادے سامان کو دیکھ کر میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ علی شیر خان تھا۔ ابو کی فتح پوری بازار میں خشک میوے کی دکان تھی۔ وہ اسی پٹھان سے میوہ خریدتے تھے۔ ہر دوسرے مہینے ٹرک بھر کر وہ میوہ لاتا تھا۔

''امی، یہ تو خان چچا ہیں، پشاور والے۔'' میں نے کہا۔

''جاؤ دروازہ کھول دو۔'' امی نے حکم دیا۔

اتر کر میں نے دروازہ کھول دیا دروازہ کھلتے ہی وہ اندر داخل ہو گئے آنگن میں وہ لاش رکھ کر انھوں نے مجھے سینے سے لگالیا۔ ''بیٹا، مجھے آنے میں دیر ہوگئی ورنہ تُو یتیم نہ ہوتا۔ تیرا یہ چچا پہلے اپنا سینہ پیش کر دیتا۔''

ان کے پیچھے پیچھے کئی لوگ آ گئے تھے، ان میں نقی چچا بھی تھے۔ محلے بھر کے چچا۔ انھوں نے پوچھا۔ ''کہاں سے آ رہے ہو بھیا؟''

''پشاور سے، فسادات کی خبر مجھے میوات میں ملی، پھر بھی میں کہیں نہیں ٹھہرا۔ پیشگی لے چکا تھا اس لئے مال لے آیا۔''

''آپ نے خواہ مخواہ جان خطرے میں ڈالی۔'' حالات کی نزاکت نے امی کو بھی پردہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ بھی آنگن میں نکل آئی تھیں۔

''بہن، ایسا نہ کہو۔ پٹھان موت سے نہیں ڈرتا۔ یہ جان خدا کی دی ہوئی ہے۔ وہی لے سکتا ہے۔ کافر کی جرأت کہاں کہ وہ ہم سے ٹکرائے، خیر یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ آپ سب تیاری کر لیں۔ میں دیکھ آیا ہوں۔ چاروں جانب سے یہ محلّہ گھرا ہوا ہے۔ یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔''

''لیکن نکلیں گے کیسے؟'' نقی چچا نے کہا۔

''ہم خود ان پر حملہ کر دیں گے۔ اس طرح محاصرہ ٹوٹ جائے گا۔ یوں بھی جب مر ہے تو کیوں نہ مار کر مریں۔''

''آپ کا کہنا درست ہے۔'' ایک نوجوان نے کہا۔



''آپ سب کو جمع کریں۔ میرے ٹرک میں سو آدمی سوار ہو سکتے ہیں۔ اگر محلے میں کسی کے پاس کوئی گاڑی ہے تو باقی کو اس میں سوار کر لیں۔''

نقی چچا اور اس نوجوان نے لوگوں کو ٹرک پر سوار کرنا شروع کر دیا۔ زندہ بچ رہنے والوں کی تعداد پچاس سے بھی کم تھی۔ اس میں بھی عورتوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ میوے کی بوریوں کو آڑ بنا کر عورتوں اور بچوں کو سوار کرا دیا گیا۔ تین بندوقیں تھیں۔ دو بندوق برداروں کو سامنے کی طرف اور ایک کو پیچھے کی جانب بٹھایا گیا۔ علی شیر چچا نے اللہ کا نام لے کر ٹرک اسٹارٹ کیا اور آندھی طوفان کی طرح گلی سے نکلے۔ سڑک پر تیر، تلوار، بھالا، بلم سے لیس بلوائی کھڑے تھے۔ ٹرک کو دیکھتے ہی ان لوگوں نے ''ہر ہر مہا دیو'' کا نعرہ لگایا۔ بندوق برداروں نے جواب میں گولیاں داغیں۔

گولیوں کی بوچھاڑ اور ٹرک کی تیز رفتاری نے محاصرہ توڑ دیا۔ کوڑیا پل پر کھڑے بلوائیوں نے سنگ باری شروع کر دی، لیکن چچا کا ٹرک تو طوفان کا جھکڑ بنا ہوا تھا۔ وہ سب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے اور ہم سب سکھ کا سانس لیتے کافی آگے نکل آئے۔ اثنا عشری جامع مسجد اور مدرسہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پہنچتے ہی دل کبیدہ ہو گیا، دونوں جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ آگ بجھانے کا وقت نہیں تھا اس لئے ہم سب آگے بڑھتے رہے۔ کشمیری گیٹ ریلوے پُل کے نیچے سے ہوتے ہوئے جیسے ہی ہم سیس گنج گردوارے کے پاس پہنچے، میرا دل بے طرح دھڑک اٹھا۔ خوف کی سرد لہر پورے جسم میں پھیل گئی، دور دور تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ نیلی، پیلی، لال، سبز پگڑیوں والے کرپانوں کو ہوا میں لہرا لہرا کر نعرے لگا رہے تھے۔ سنہری مسجد جل کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ برج کو توڑ دیا گیا تھا۔

''اب کیا ہوگا علی شیر؟'' نقی صاحب نے پوچھا۔

''اللہ مسبب الاسباب ہے۔ نعرہ تکبیر کافروں کے دل پر ہیبت طاری کر دیتا ہے۔ سب مل کر نعرہ لگائیں۔'' علی شیر چچا نے کہا۔

فلک شگاف نعرہ تکبیر کی ہیبت، فائروں کی دہشت اور ٹرک کی برق رفتاری سے بلوائیوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ انھیں روندتا ہوا ٹرک چاندنی چوک کی جانب مڑ گیا اتنے بڑے طوفان کو پار کر لینے پر سب نے رب کا شکر ادا کیا۔ ہم سب موت کے منہ سے نکل آئے تھے۔ ورنہ وہ سب جتنی بڑی تعداد میں تھے با آسانی ٹرک روک سکتے تھے لیکن بزدلی نے انھیں بھگوڑا بنا دیا تھا۔

وحدہ، لاشریک کا شکر ادا کرتے ہوئے ہم سب آگے بڑھ رہے تھے کہ بلی ماراں کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے سکھوں کے ایک جتھے نے ہمیں دیکھ لیا۔ شاید وہ سب چھوٹے چھوٹے محلوں سے بچ کر آنے والوں کی تاک میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمیں لقمہ تر سمجھتے ہوئے گھیرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جواب میں ٹرک سے بندوقیں گرجیں۔ کئی بلوائی زمین بوس ہوئے اور باقی نے مکانوں کی آڑ لے لی۔ گلی کافی تنگ تھی مجبوراً علی شیر چچا کو رفتار دھیمی کرنا پڑی۔ چھتوں پر مورچہ بند بلوائیوں نے پتھراؤ شروع کر دیا، ونڈ سکرین ٹوٹ کر بکھر گئی۔ کانچ کی کرچیوں نے علی شیر چچا کا چہرہ لہولہان کر دیا، نقی چچا اور میں بھی زخمی ہو گیا۔ چھتوں سے برسنے والے پتھروں نے پیچھے عورتوں اور بچوں کو بھی زخمی کر دیا لیکن علی شیر چچا کا حوصلہ پست نہ ہوا وہ ٹرک بڑھائے لیے جا رہے تھے۔

گلی سیتا رام پار کرتے ہی ایک نئی اُفتاد آن پڑی۔ کسی جانب سے ایک گولی ٹرک کے ٹائر میں لگی اور ٹائر زوردار آواز سے پھٹ گیا۔ اس نئی مصیبت سے گھبرا کر عورتوں نے نادِ علی کا ورد شروع کر دیا۔

''حوصلہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت ضرور کرے گا''۔ یہ کہتے ہوئے علی شیر چچا نے ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

تنگ سی گلی، لنگڑاتا ہوا ٹرک اور چاروں جانب سے کافروں کی یلغار! ہم سب زندگی سے مایوس ہو چکے تھے۔

''مسلم آباد بہت قریب ہے۔ نعرہ لگائیں۔'' علی شیر چچا نے کہا۔

خوف سے کانپتی آوازوں میں ہم سب نعرے لگانے لگے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور نعروں کی گونج نے ہمیں نئی زندگی دے دی۔ مسلم علاقے سے بھی نعرے سنائی دینے لگے۔ کچھ سر پھرے جانباز نعرہ تکبیر لگاتے ہوئے ہماری جانب بڑھتے نظر آئے، انہیں دیکھ کر بلوائی پیچھے ہٹ گئے۔

آگ و خون کا سمندر پار کر کے ہم سب بلی ماراں میں داخل ہو گئے۔ ہندوستانی دواخانے کے سامنے علی شیر چچا نے ٹرک روک کر سب کو اتارا۔ وہاں پہلے سے ہی سینکڑوں لٹے پٹے مسلمان جمع تھے۔ جسے جہاں جگہ ملی وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ علی شیر چچا نے خشک میوے کی بوریاں اتاریں اور ان لوگوں میں تقسیم کرنے لگے۔ بھوکے پیاسے لوگوں کے لئے یہ میوہ [illegible] غیر مترقبہ تھا۔ ہم لوگوں نے بھی اسی سے پیٹ کی آگ بجھائی۔



''بہن تم، بچوں کے لئے ٹرک پر چادر تان لو۔ جب تک پاکستان جانے کی سبیل نہیں ہوتی، یہی گھر ہو گا ہمارا۔'' علی شیر چچا نے امی سے کہا۔

امی مجھے اور باجی کو لے کر پھر ٹرک پر چڑھ گئیں۔ علی شیر چچا کو سب سے زیادہ فکر باجی کی تھی۔ کنیز باجی پندرہ سال کی ہو چکی تھیں۔ ان کی منگنی ہو چکی تھی اور اسی سال ان کی رخصتی ہونے والی تھی، لیکن فساد پھوٹ پڑے۔ اس آگ نے ان کی خوشیوں کو راکھ کر دیا۔ وہ رخصتی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئیں۔ ان کے ہونے والے شوہر بھی پنجہ شریف میں بلوائیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ باپ اور شوہر کے غم میں ان کے آنسو ہمہ وقت بہتے رہتے۔ آنسو پونچھنے کا فرض بھی علی شیر چچا ادا کر رہے تھے، یوں بھی اس شہر بے مہر میں وہی تو ایک ہمدرد تھے۔ انھیں سب سے زیادہ فکر ہمیں پاکستان تک پہنچا دینے کی تھی۔ اسی لئے وہ اسٹیشن تک بحفاظت پہنچنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے۔

ترک وطن کرنے والوں کے لئے پرانے قلعے کے نزدیک عارضی اسٹیشن بنا دیا گیا تھا۔ وہاں تک پہنچنا محال تھا لیکن چچا نے راہ نکال ہی لی۔ گورکھا فوج کے ایک افسر کے ساتھ ہم سب فوجی ٹرک پر سوار ہو کر وہاں پہنچ گئے۔ وہاں پہلے ہی اژدھام تھا۔ تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ لٹے پٹے مسلمانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ریل کے آتے ہی لوگ دوڑ پڑے۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ ہر کوئی پہلے سوار ہونا چاہتا تھا۔ شاید موت کی وادی سے فرار ہونے کے لئے لوگ دیوانے ہو گئے تھے، دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین بھر گئی۔ جنھیں جگہ نہیں ملی وہ چھتوں پر چڑھ گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد جب ریل چلی تو لوگ دروازوں سے باہر ابلے پڑ رہے تھے، اس کے دروازوں، کھڑکیوں پر چیونٹیوں کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ انہی میں ہم بھی شامل تھے۔

دہلی کی حدود سے نکلتے ہی سب نے خدا کا شکر ادا کیا، لیکن یہ خوش فہمی زیادہ دیر قائم نہ رہ پائی۔ سونی پت میں ریل پر حملہ ہوا۔ اس کے بعد تو حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر اسٹیشن پر گاڑی روک کر قتلِ عام کی کوشش ہوئی لیکن گورکھا سپاہی اپنی جان پر کھیل گئے۔ وہ تعداد میں کم تھے، پھر بھی انسانیت کے نام پر ان بھیڑیوں سے نہتے مسلمانوں کو بچا رہے تھے۔ مگر امرتسر پہنچ کر وہ بھی ریل سے اتر گئے۔

پاکستان کی سرحد قریب [illegible] چکی تھی [illegible] خطرہ ٹل گیا تھا اس لئے خوف کا نام و نشان بھی مٹ گیا تھا لیکن موت کا وقت بھی کبھی ٹلا ہے۔ موت [illegible] گاڑی کے تعاقب میں تھی۔

امرت سر سے کچھ آگے بڑھتے ہی گاڑی رک گئی۔ ریلوے لائن پر کاٹ کر درخت ڈال دیے گئے تھے۔ پھر رکی ہوئی گاڑی پر بلوائی، ٹڈی دل کی طرح ٹوٹ پڑے۔ علی شیر چچا نے مجھے اور باجی کو سیٹ کے نیچے ٹھونس کر سامان کی گٹھریوں سے ڈھک دیا۔ چیخ وپکار مچی ہوئی تھی۔ سر تنوں سے جدا ہو کر گر رہے تھے۔ میں نے امی کو بھی گرتے دیکھا لیکن میں ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ ہر شخص کی طرح مجھے بھی اپنی جان کی پڑی تھی۔ صرف ایک شخص تھا جو تن تنہا شیر کی طرح گرج رہا تھا۔ وہ علی شیر چچا تھے جو اس وقت واقعی شیر بنے ہوئے تھے۔ بلوائیوں سے چھینی ہوئی تلوار سے وہ حملہ آوروں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنے ہی خون میں نہا رہے تھے کہ بلوچ رجمنٹ کی مدد پہنچ گئی۔ فوجیوں کے ڈر سے بلوائی سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ فوجیوں نے کچھ لوگوں کی مدد سے ریلوے لائن صاف کی اور گاڑی پھر روانہ ہوگئی۔ خون میں لت پت علی شیر چچا نے ہم دونوں بہن بھائی کو پکارا اور پھر امی کو تلاش کرنے لگے۔ وہ کئی لاشوں کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ ان کے سر پر کاری ضرب لگی تھی۔ علی شیر چچا کی پکار پر انھوں نے آنکھیں کھولیں اور چچا کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولیں۔ ''بھیا میرے بچوں کا خیال رکھنا۔''

''بہن، مجھے غیر مت سمجھو، خون کا رشتہ نہیں ہے تو کیا ہوا، مذہب تو ایک ہے پھر تم لوگوں کا احسان بھی تو کم نہیں ہے۔ خیبر سے چٹا گانگ تک سب نے مل کر کوشش کی تھی نا! تبھی تو یہ پاکستان ملا ہے۔ جو اب ہم سب کا وطن ہے۔ کچھ ہی دیر میں تم اپنے وطن میں ہوگی۔''

نہیں بھیا، میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ وطن پاک کو میں دیکھ نہیں پاؤں گی۔ وہاں کی مٹی سے میرا اسلام کہہ دینا۔''

''نہیں، بہن! تم اس پاک وطن کو ضرور دیکھوگی۔ جہاں اسلام کا بول بالا ہوگا، جہاں مسلمانوں کا کوئی دشمن نہیں ہوگا۔''

''کاش میں اس پاک زمین کو سلام کر سکتی۔ اس کی مٹی کو چوم سکتی۔ میری سانس اکھڑ رہی ... ہے ...... میری ..... لا ..... ش ..... کفر...... ستان ...... میں مت ..... چھوڑنا..... اللہ حافظ!'' ان کا سر ڈھلک گیا۔

قسمت کے ٹھکرائے ہوئے ہم دونوں بھائی، بہن علی شیر چچا سے لپٹ کر رونے لگے۔

مہاجر کیمپ میں دو دن ستانے کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا اس بار ہماری منزل پاڑے تھی، علی شیر چچا کا گاؤں۔ لاہور سے ہم لوگ راولپنڈی آئے، پھر وہاں سے ہنگو



اور کوہاٹ ہوتے ہوئے پاراچنار پہنچے۔ پاراچنار سے دس میل کا سفر گھوڑے پر طے کر کے شلوزان پہنچے اور وہاں سے پاڑے۔

مینگل قبیلے کا وہ گاؤں مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ ثابت ہوا۔ ہر گھر ہمارے لئے اپنا گھر بن گیا تھا۔ زبان کی اجنبیت، مذہب کے مقدس جذبے میں گم ہوگئی۔

پھر گاؤں والوں کی شفقت ومحبت کے سائے میں دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے بیت گیا۔

علی شیر چچا نے پھر سے اپنا کاروبار جما لیا تھا۔ وہ سمندری راستے سے خشک میوہ، مشرقی پاکستان لے جانے لگے۔

ایک ڈیڑھ ماہ تک وہ آس پاس کے علاقوں سے میوہ خرید کر جمع کرتے، پھر اسے لے کر کراچی جاتے اور وہاں سے اسے چٹا گانگ کے لئے بک کر دیتے ان کی پارٹی، مشرقی پاکستان میں مال چھڑا لیتی۔

ایک بار میں نے بھی کراچی دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ میری فرمائش رد کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ انھوں نے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔

اپنا ٹرک وہ خرید نہیں پائے تھے اس لئے کرائے کے ٹرک سے کام چلاتے تھے۔ ڈرائیور کے ساتھ انھوں نے مجھے بھی بٹھا لیا۔

ہوا سے باتیں کرتا ہوا ٹرک کراچی کی جانب دوڑ رہا تھا۔ تین دن کا سفر ہم لوگوں نے طے کر لیا تھا، چوتھا دن بھی گزرنے والا تھا۔ مغرب میں سورج غروب ہونے کا منظر بہت دلکش تھا۔ میں اس حسین منظر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ زوردار دھماکہ ہوا۔ ڈرائیور نے فوراً ٹرک روک دیا اور بولا۔ ''ٹائر برسٹ ہوگیا ہے۔''

دوسرا ٹائر لگانے کے لئے ان لوگوں نے جیک لگایا ہی تھا کہ جھاڑیوں کے پیچھے سے کئی نقاب پوش نکل آئے۔ سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ان لوگوں نے آگے آتے ہی علی شیر چچا اور ڈرائیور کو بندوقوں کی زد میں لے لیا۔ ان لوگوں نے شاید علی شیر چچا کو چوہا سمجھا تھا۔

ان کے ہاتھ میں ابھی تک بھاری بھرکم جیک تھا۔

جیسے ہی وہ سب نزدیک آئے، علی شیر چچا نے جیک گھما دیا۔ سامنے والے کے سر سے بھاری جیک ٹکرایا اور وہ زمین بوس ہوگیا۔ پھرتی سے چچا نے اس کی رائفل اٹھائی اور

دوسرے حملہ آور پر فائر کر دیا۔ ٹرک ڈرائیور بھی پاراچنار کا تھا، سرحدی خون اسے کیسے تماشائی بنائے رکھتا۔ اس نے بھی چچا کے ہاتھوں زخمی ہونے والے دوسرے حملہ آور کی رائفل اٹھالی اور فائر کھول دیا۔ وہ دو تھے لیکن حق پر تھے۔ اللہ بھی حق پرستوں کا ساتھ دیتا ہے۔

اسی وقت گھوڑوں کی ٹاپوں سے ویرانہ گونج اٹھا اور تقریباً دس گیارہ گھڑ سوار نمودار ہوئے، وہ سب مسلح تھے۔ ان میں سے ایک نے ہوائی فائر کرتے ہوئے اجنبی زبان میں حکم دیا۔ حملہ آور فوراً دور ہٹ گئے۔ ہوائی فائر کرنے والے نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”خان تم واقعی بہادر ہو۔“

”ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کبھی بزدل نہیں ہوتا۔“ میں نے جواب میں کہا۔

”او، تم مہاجر ہو۔“ اس نے میری جانب مڑ کر کہا۔

”نہیں، مسلمان۔“ میں نے کڑے لہجے میں کہا۔

میرے الفاظ اور لہجے نے اسے قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا، پھر اس نے چچا سے پوچھا۔ ”خان! اس بچے کو کہاں سے پکڑا ہے؟“

”یہ میرا بھتیجا ہے۔“

”بھتیجا! تم مقامی آدمی ہو اور یہ ہجرت کر کے آیا ہے، پھر بھتیجا کیسے ہو گیا۔“

”یہ مذہب اور انسانیت کے رشتے سے میرا بھتیجا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انھوں نے میری کہانی سنادی۔

ہوائی فائر کرنے والے نے کہا۔ ”میں اسے اپنے گوٹھ لے جا رہا ہوں۔“

”نہیں، یہ میرے ساتھ جائے گا۔“ چچا نے کڑے لہجے میں کہا۔

ان کے لہجے نے اس شخص کے ساتھیوں کو چوکنا کر دیا۔

وہ سب گھیرا بنانے لگے تھے کہ اس شخص نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ایک موقع ہمیں بھی دو خان، میں بھی آخرت میں سرخ رو ہونا چاہتا ہوں۔ شہید کے بیٹے کی دعوت کرنا میرا بھی حق ہے۔“ زخمی شیر کی طرح بل کھاتے چچا کو اس شخص کی التجا نے موم بنا دیا اور وہ نرم لہجے میں بولے۔

”چلیے!“

”تم انھیں باندھ کر حویلی لے آؤ۔“ اس شخص نے اپنے ساتھیوں کو حملہ آوروں کے متعلق ہدایت دی اور ہمارے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں اس نے بتایا کہ میں اس علاقے کا



وڈیرا ہوں اور میرا نام علی ابڑو ہے۔ مجھے اطلاع ملی کہ کچھ ڈاکو میرے علاقے میں آئے ہوئے ہیں۔ ان کا پیچھا ہی کرتے ہوئے میں یہاں پہنچا تھا۔

علی ابڑو کے گوٹھ میں پہنچ کر محسوس ہوا جیسے فرشتوں کے گاؤں میں پہنچ گئے ہیں۔ اتنے معصوم اور بھولے بھالے تھے وہ سب کہ ان پر انسان ہونے کا گمان ہی نہیں ہو رہا تھا۔ چالاکی اور عیاری تو انھیں چھو کے بھی نہیں گزری تھی۔ فرشتوں ایسے معصوم فطرت لوگ میری ایک جھلک دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ جو بھی ملنے آتا اس کے ہاتھ میں کھانے کی ایک نہ ایک چیز ہوتی پھر وہ ہمیں زبردستی کھلانے کی کوشش کرتا، مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔ میں وہاں سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک ضعیف العمر شخص دودھ کا کٹورا لیے ہوئے آیا اور اپنی زبان میں پتا نہیں کیا کہنے لگا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے علی ابڑو کی طرف دیکھا تو انھوں نے کہا۔ ”یہ میرا ہاری ہے۔ اپنی بکری کا دودھ لایا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ تم شہید کے بیٹے ہو، اس کے حق میں دعا کر دو۔“

مجھے ہنسی آ گئی۔ پھر بھی اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے دودھ پی لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے لئے اندرون خانہ بستر لگا دیا گیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹی سی بچی دوڑ کر آئی اور پتا نہیں، کیا کیا کہنے لگی۔ علی ابڑو نے بتایا کہ یہ میری اکلوتی بیٹی زبیدہ ہے، تم سے دوستی کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بھی مسکرا کر رضامندی ظاہر کر دی۔

مجھے وہاں چھوڑ کر چچا دوسرے ہی دن، کراچی چلے گئے تھے۔ میں اس گھر میں پانچ دن ٹھہرا۔ اگر چچا کراچی میں کچھ دن مزید رک جاتے، تو پھر بھی میں اکتاہٹ محسوس نہ کرتا۔ مجھے کراچی نہ دیکھنے کا ذرا بھی غم نہیں تھا۔ ان لوگوں نے اتنی محبت دی تھی کہ کراچی کی بات ہی ذہن سے نکل گئی تھی۔

واپسی کے وقت آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، مجھے سب سے زیادہ دکھ زبیدہ سے بچھڑنے کا تھا۔ دس گیارہ سال کی اس بچی نے اپنی عمر سے بڑھ کر میری خدمت کی تھی۔

پاڑے لوٹ کر بھی دل بے چین رہا۔ وہاں میں اکیلا گیا تھا لیکن لوٹتے وقت یادوں کا میلہ ساتھ لے آیا تھا۔ سوتے جاگتے وہاں کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

اس دن بھی میں چچا کے والد افراسیاب خان کو وہاں کے واقعات سنا رہا تھا کہ چچا آ گئے۔ خان بابا کو سلام کرنے کے بعد انھوں نے کہا۔ ”بابا، میں ضیغم کو ڈھاکا لے جانا چاہتا ہوں۔“

"کیوں؟" بیٹے کی بات سنتے ہی ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"اسے تجارت میں لگانا چاہتا ہوں۔"

"کیا تُو نہیں جانتا کہ یتیموں سے مشقت لینا گناہِ عظیم ہے؟" خان بابا نے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"لیکن میں نے تو وہ دکان اس کے نام پر خریدی ہے۔ یہ وہاں نوکر نہیں مالک بن کر بیٹھے گا۔ اس کی آمدنی سے دونوں بہن بھائی کی زندگی خوشحال طریقے سے گزر جائے گی۔"

"تیرا دماغ تو صحیح ہے۔ لڑکی ہمارے گھر کی عزت ہے وہ کہیں نہیں جائے گی۔"

"لیکن آپ خود سوچیں ضیغم، بہن کو چھوڑ کر جائے گا؟ مشرقی پاکستان، پشاور نہیں ہے، ہزاروں میل کی دوری پر ہے۔"

"تیرا کہنا ٹھیک ہے۔ ڈھاکہ بہت دور ہے لیکن یہ بھی تو سوچ کہ بہن زندگی بھر بھائی کے پاس نہیں رہتی۔ ایک نہ ایک دن اسے جدا ہونا پڑتا ہے۔ وہ ہماری عزت ہے۔ اسے ہم عزت و تکریم سے رخصت کریں گے۔ وہ اس گھر سے نکل کر شوہر کے گھر جائے گی۔"

"میری خواہش تھی کہ اسے اپنی بہو بنا لوں لیکن یہی مسئلہ آڑے آ رہا ہے۔ فروعی مسئلے میں ہم دخل بھی تو نہیں دے سکتے۔"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا" افراسیاب کے بھائی رستم خان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "اسے اپنے پوتے سے بیاہ دوں لیکن ہم مجبور ہیں۔ ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب پھر بھی فروعی مسائل کی آڑ میں گروہ بندی کی لعنت نے ہمیں مجبور بنا رکھا ہے۔"

"چھوڑو ان باتوں کو" افراسیاب خان نے بیٹے سے کہا۔ "کل تم زیڑان چلے جاؤ۔ علی نقی سے کہنا۔ وہ مسئلے کا حل نکال دے گا۔"

اگلی صبح، چچا زیڑان کے لئے نکل پڑے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ تپتی دھوپ میں پہاڑیاں پھلانگتے ہوئے دونوں زیڑان پہنچے۔ علی نقی بڑے تپاک سے ملے۔ وہ مجھے پہچانتے تھے۔ محرم کا چاند طلوع ہوتے ہی خان بابا، ہم دونوں بھائی بہنوں کو دس دن کے لئے توریوں کے اسی گاؤں میں بھیج دیتے تھے۔ ہم علی نقی ہی کے گھر ٹھہرا کرتے تھے۔

"کہیے سید صاحب کیسے آنا ہوا؟" علی نقی نے مجھ سے پوچھا۔

چچا نے میرے بولنے سے پہلے ہی سارا مسئلہ بیان کر دیا۔ علی نقی توری نے مدد کا



وعدہ کر لیا۔

نمازِ ظہر کے بعد انھوں نے مسجد میں ایک چھوٹی سے تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ تم میں سے کون اس لڑکی کو اپنے گھر کی عزت بنانا چاہتا ہے جس کا خاندان پاک وطن کے نام پر شہید ہو گیا۔

جواب میں آدھے سے زیادہ لوگوں نے رشتہ پیش کر دیا۔

اتنے سارے امیدوار دیکھ کر مسجد کے امام نے استخارہ دیکھنے کی صلاح دی۔

پہلا نام علی نقی نے اپنے بیٹے ابوتراب کا پیش کیا۔ اتفاق سے پہلا ہی نام سعد آ گیا۔ علی نقی نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ "انشاء اللہ تیرہ رجب کو شہید کی بیٹی میری بہو بن جائے گی۔"

میں نے بھی ابوتراب کو دیکھا تھا۔ وہ پشاور میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ باجی بھی دہلی میں پڑھتی تھیں، پانچ جماعت پاس تھیں۔ انھیں کسی جاہل کے پلے نہیں باندھا جا رہا ہے، اس کی خوشی مجھے بھی تھی۔ چچا کو بھی رشتہ پسند آیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے تیرہ رجب کی تاریخ آ گئی اور باجی رخصت ہو کر کرمان چلی گئیں۔ رخصتی کے وقت پورا گاؤں اُمڈ آیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔

ایک ماہ بعد میں نے بھی گاؤں چھوڑ دیا اور چچا کے ساتھ ڈھاکہ چلا آیا۔ انھوں نے کیپٹن بازار میں دکان خریدی تھی۔ میں اسے سنوارنے میں جت گیا۔

آہستہ آہستہ دکان چل نکلی۔ میرا دل بھی بنگال کے اس حسین شہر میں لگ گیا تھا۔ سال میں ایک بار ہی پاڑے جاتا۔ پاڑے جاتے وقت اور لوٹتے وقت کرمان کا چکر بھی لگا لیتا تھا۔ نوشے بھائی نے تعلیم مکمل کر لی تھی اور انھیں محکمہ خفیہ میں نوکری مل گئی تھی۔ میں ایک ننھے منے بھانجے کا ماموں بھی بن گیا تھا، اسی کی کشش مجھے کرمان کھینچ لے جاتی تھی۔ ڈھاکہ واپس آ کر سب سے زیادہ اسی کی یاد آتی تھی۔

میں نے بونوگرام محلے میں مکان خرید لیا تھا۔ کئی بار باجی کو دعوت بھی دی کہ ایک بار آ کر کچھ دن گزار لیں لیکن نوشے بھائی راضی ہی نہیں ہو رہے تھے۔ ان کی نوکری ہی کچھ ایسی تھی کہ چھٹی ملنا مشکل تھی۔

اس دن بھی میں ان کے نام خط ڈال کر لوٹا تھا، جانتا تھا کہ جواب میں وہ کیا لکھیں گے، پھر بھی باجی کے آنے کی امید لیے تھا اور خیالوں میں اپنے سُونے آنگن کو بھانجے کی چہکار

سے گونجتا دیکھ رہا تھا۔ کئی خریدار آئے لیکن میں نے توجہ نہیں دی۔

آہستہ آہستہ بازار میں سناٹا چھانے لگا۔ تھک کر میں بھی دکان بند کرنے والا تھا کہ آندھی طوفان کی طرح ایک لڑکی دکان میں گھس آئی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور چہرہ زرد تھا۔ وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے التجا نکلی۔

''بھیا مجھے بچالو، غنڈے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔''

میں اس کی التجا پر غور ہی کر رہا تھا کہ باہر سے آواز آئی۔ ''لڑکی اسی دکان میں داخل ہوئی ہے۔'' اسے گودام کی طرف جانے کا اشارہ کر کے میں باہر نکل آیا۔ خطرناک چہروں والے تین غنڈے وہاں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ''خان! نیلی ساڑھی والی لڑکی کو دیکھا ہے؟'' پاڑے کی محبت نے مجھے شلوار قمیض کا عادی بنا دیا تھا، اسی وجہ سے لوگ مجھے پختون سمجھتے تھے اور خان کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس نے بھی مجھے پختون سمجھا تھا۔

''پوچھنا کیا ہے، میں نے خود اسے اسی دکان میں گھستے دیکھا ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''تلاشی لے لیتے ہیں۔'' تیسرے نے لقمہ دیا اور آگے بڑھا۔

اسے آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے گرج کر کہا۔ ''خبردار! میری دکان میں کوئی نہیں گھسے گا؟''

''جانتا نہیں ہے ہم کس کے آدمی ہیں۔'' ایک غنڈے نے غصے سے کہا۔

''ہاں ہاں جانتا ہوں۔''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ایک غنڈہ آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے زقند بھری اور چاقو والے ہاتھ پر ٹھوکر مارتا ہوا دوسرے غنڈے سے جا ٹکرایا۔ چاقو اندھیرے میں دور جا گرا۔ جس کے سینے سے میرا سر ٹکرایا تھا وہ سینہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ زمین پر گرتے ہی میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تیسرا غنڈہ جو اس اچانک حملے سے حواس باختہ ہو گیا تھا، میری جانب لپکا۔ میں نے پوری قوت سے اچھل کر اسے لات ماری اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ میری رگ رگ میں بجلی سی بھر گئی۔ کوندے کی طرح لپک کر کبھی ایک پر گرتا اور کبھی دوسرے پر۔ کچھ ہی دیر میں وہ تینوں زمین چاٹنے لگے۔

''کیوں، دکان کی تلاشی نہیں لو گے؟'' میں نے طنز کیا۔

''تم نے بہت برا کیا ہے خان! ہم سے ٹکرا کر اپنی موت کو للکارا ہے تم نے۔'' ایک



غنڈے نے ہانپتے ہوئے کہا۔

جواب میں میری بھرپور لات اس کے چہرے سے ٹکرائی اور دبی دبی سی چیخ کے ساتھ وہ دہرا ہو گیا۔ ایک دو دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔

منہ سے نکلتے خون کو پونچھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یاد رکھوں گا خان، سب یاد رکھوں گا۔'' بری طرح پٹنے کے بعد بھی اس کی اکڑ ختم نہیں ہوئی تھی۔

تینوں ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے لوٹ گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے لڑکی کو باہر نکالا اور پوچھا۔ ''اب بتاؤ تم کون ہو، یہ لوگ تمہارے پیچھے کہاں سے لگے؟''

''آرزو ہوٹل سے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''آرزو ہوٹل! تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں؟''

''لمبی کہانی ہے۔'' لڑکی نے نظریں جھکا کر کہا۔

''خیر۔'' میں نے بات ختم کرنے کے لئے کہا۔ ''اب کہاں جاؤ گی؟''

''یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔''

''عجیب مصیبت ہے۔'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ''رات کا وقت ہے۔ تمہیں اکیلا دیکھ کر پھر غنڈے پیچھے پڑ جائیں گے۔''

''رات بھر کی بات ہے، اپنے گھر میں ٹھہرا لیں۔'' لڑکی نے معصومیت سے کہا۔

''کیسے ٹھہرا لوں میں اکیلا رہتا ہوں۔''

''تو کیا ہوا، مجھے آپ پر بھروسا ہے۔''

اس بنگالی لڑکی پر مجھے رحم آ گیا۔ ''چلو۔ لیکن تم نے تو کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔''

''نہیں۔'' لڑکی نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''نواب پور روڈ پر امینیہ ہوٹل کھلا ہوگا، ٹھونگا (تھیلی) میں بریانی لے لیتے ہیں گھر چل کر کھا لیں گے۔''

لڑکی نے جواب نہیں دیا اور سر جھکائے ہوئے پیچھے پیچھے چل دی۔ امینیہ سے بریانی لے کر پی سی سی روڈ سے ہوتے ہوئے ہم دونوں بونوگرام پہنچے۔ گھر کا تالا کھول کر اندر داخل ہوتے ہی میں نے کہا۔ ''اسٹوو، جلا کر بریانی گرم کر لو، باورچی خانہ ادھر ہے۔'' میں نے اشارے سے اسے بتایا۔

لڑکی کچن کی جانب بڑھی اور میں اپنے کمرے کی طرف۔ کھانے سے فارغ ہو کر

میں نے دوسرے کمرے کی چابی اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''سونا چاہتی ہو تو یہ کمبل لے جاؤ۔ اگر نیند نہیں آ رہی ہے تو اپنی کہانی سنادو۔''

''میں بکرم پور کی رہنے والی ہوں۔ میرے والد کاشتکار ہیں۔ بہت تھوڑی سی زمین ہے اور تین افراد کا بوجھ! ہم سب مفلسی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ عسرت بھرا ماحول نہ مجھے پہلے پسند آیا اور نہ اب پسند ہے۔ اپنی بے چارگی پر رو دھو کر زندگی گزار رہی ہوں۔ پتا نہیں خدا نے کیوں ہم لوگوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ جب کہ میری سہیلی رخسانہ دولت میں کھیلتی ہے۔ اس کی بڑی سے بڑی خواہش بھی پل بھر میں پوری ہو جاتی ہے۔ اس کی مسرت بھری زندگی دیکھ دیکھ کر میں کڑھتی رہتی تھی۔ کسی تقریب میں جانا ہوتا تو اس کے کپڑے مانگنا پڑتے تھے۔ اس وقت دل کو سمجھا لیتی تھی کہ جب شادی ہوگی تو شوہر سارے ارمان پورے کر دے گا لیکن پھوٹی قسمت بھی کبھی سنبھلی ہے۔ ابا نے میری شادی بھی اپنے جیسے مفلوک الحال سے کر دی۔ میرے سارے خواب بکھر گئے۔ شوہر دوسروں کے کھیتوں میں کام کرتا تھا اور مجھے اپنا پیٹ پالنے کے لئے ڈھیکی چلانا پڑتی۔ موڑل (چودھری) کے گھر میں دن بھر چاول کوٹنے کے لئے ڈھیکی چلاتی۔ زندگی بوجھ بن گئی تھی کہ ایک دن ابا آ گئے۔ مجھ سے دو سال چھوٹی بہن فردوس کے لئے وہ لڑکا تلاش کرنے آئے تھے۔ واپسی میں مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ دس دن کے وعدے پر شوہر نے اجازت دی تھی۔ میں گھر پہنچتے ہی رخسانہ سے ملنے اس کے گھر کی طرف چل دی۔ اس کے کمرے میں گھستے ہی میں چور کی طرح ٹھٹک گئی۔ وہ بے حجابانہ انداز میں لیٹی تھی اور ایک نوجوان اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ میں واپس مڑنا چاہتی تھی کہ اس نے پکارا، ارے رک کیوں گئی، آؤ اندر آ جاؤ۔ مجبور ہو کر مجھے اس کے نزدیک جانا پڑا۔

''تو سسرال سے کب آئی۔'' اس نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''آج ہی، لیکن تیرے وہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔''

''انھیں دکان سے فرصت کہاں۔ میں تو ان کے ساتھ آئی ہوں۔ یہ میرے دیور ہیں رشید سکدار۔''

رشید نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیا۔ مجھے بھی جواب دینا پڑا۔

''آپ کھڑی کیوں ہیں بیٹھیں نا۔'' رشید نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کی گفتگو نے میری ہچکچاہٹ دور کر دی۔ وہ بھی کافی بے تکلف ہو گیا۔ چراغ جلنے تک ہم تینوں باتیں کرتے رہے۔ رشید کی سحر آفریں باتیں، مسحور کن شخصیت اور



نمایاں انداز نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ گھر لوٹنے کے بعد بھی وہ میرے ذہن پر چھایا رہا۔

وہ دو دن تک ٹھہرا اور پھر ڈھاکا لوٹ گیا لیکن ایک ہفتے بعد وہ پھر بکرم پور آیا اس بار وہ میرے لئے بھی تحفے لایا تھا۔

آہستہ آہستہ وہ میرے خوابوں پر چھاتا جا رہا تھا کہ اس نے ایک نئی راہ پر مجھے گھسیٹ لیا۔ مجھے سبز باغ دکھا کر ڈھاکا لے آیا۔ تین دن تک آرزو ہوٹل کے کمرے میں رکھ کر اس نے اپنی آرزو پوری کی اور آج صبح خاموشی سے کہیں چلا گیا۔ دوپہر کو ہوٹل والے نے زبردستی مجھے ہوٹل سے نکال دیا۔ پھر بھی میں ہوٹل کے باہر بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی لیکن جب شام نے رات کا لبادہ پہن لیا تو میں پریشان ہو اٹھی۔ مجھے تنہا دیکھ کر وہ تینوں پہنچ گئے اور زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان سے بچنے کے لئے بھاگ رہی تھی کہ آپ کی دکان کھلی نظر آ گئی۔'' اس نے اپنی کتھا ختم کر کے سر جھکا لیا۔

''اپنا پتا دے دو میں کل تمہارے ابا کو بلا لیتا ہوں۔ وہ خاموشی سے تمہیں سسرال پہنچا دیں گے۔''

''میں گھر نہیں جاؤں گی۔ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔''

''تم نے مجھے بھائی کہا ہے نا! بھائی کا فرض بھی ادا کرنے دو مجھے۔''

''آپ جیسا مناسب سمجھیں۔'' فریدہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

اگلی صبح میں صدر گھاٹ پہنچ گیا۔ بکرم پور جانے والی لانچ کھڑی تھی۔ ٹکٹ لے کر سوار ہو گیا۔ چار گھنٹے کا اکتا دینے والا سفر طے کر کے میں فریدہ کے گھر پہنچا۔ اس کے ابا گھر میں تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر میرا دل رو اٹھا۔ بیٹی کے غم میں وہ بستر سے لگ گئے تھے۔ بیٹی کے فرار کی بات انھوں نے گاؤں والوں سے چھپا لی تھی اس لئے انھیں میرا مشورہ بھا گیا اور وہ اسی وقت ڈھاکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

شام تک ہم دونوں گھر پہنچ گئے۔ میں انھیں روکنا چاہتا تھا لیکن وہ رکے نہیں اور فریدہ کو ساتھ لے کر کاندی جانے والی لانچ پر سوار ہو گئے۔ وہ جلد سے جلد بیٹی کو سسرال پہنچا دینا چاہتے تھے۔ ٹکٹ خرید کر انھیں سوار کراتے وقت میں نے پچاس روپے بھی دے دیے۔ نوٹ لے کر فریدہ رو پڑی شاید اسے یاد آ گیا تھا کہ اسی نوٹ کی لالچ میں وہ گندگی میں ڈوب گئی تھی۔

اسے روتے دیکھ کر میں نے کہا۔''مت رو بہن! ابھی تیرا بھائی زندہ ہے اور ایک بھائی اپنی بہن کو کبھی بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اپنی دکان کے لئے ایک مددگار کی ضرورت ہے۔دو چار دن بعد تمہارے ابا تمہارے شوہر کو یہاں لے آئیں گے۔ یہاں رہے گا تو سارے مصائب خود بہ خود دور ہو جائیں گے۔''

اسی وقت لانچ نے سائرن بجا کر چلنے کا اشارہ دیا اور میں اترنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔اس کے ابا ابوالکلام کے ہاتھ میں سو کا نوٹ دیتے ہوئے میں نے تاکید کی کہ دو چار روز بعد فریدہ کے شوہر کو لے آیئے گا۔نوٹ دیکھ کر وہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔اتنا بڑا نوٹ انھوں نے شاید پہلی بار دیکھا تھا۔وہ وقت تھا ہی ایسا۔اس وقت چیزیں سستی اور نوٹ مہنگا تھا۔اسی وجہ سے ان کے آنسو نکل پڑے تھے۔

یہ آنسو ہوتے ہی ہرجائی ہیں،خوشی زیادہ ملے تو نکل پڑتے ہیں اور غم کا بار آپڑے تو بھی نکل پڑتے ہیں۔انھیں بلکتے دیکھ کر میں نے مزید پچاس روپے دے دیے اور بولا۔''فریدہ میری بہن ہے اس رشتے سے آپ کو جتنی ضرورت ہو، بے کھٹکے مانگ لیجئے گا۔''

''خدا تمہیں خوش رکھے بیٹا۔''انھوں نے آنسو پونچھتے ہوئے دعا دی اور میں نیچے اتر آیا۔بوڑھی گنگا کے پانی پہ تیرتی لانچ آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆======☆=====☆



دوسرے دن میں دکان کھول کر اگر بتی جلا رہا تھا کہ ایک ساتھ تین آدمی اندر گھس ئے۔ان کے چہروں کو دیکھتے ہی میں نے جان لیا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ایسے لوگوں ی تو میں بو سونگھ لیا کرتا تھا۔سب سے آگے والا کسی بھینسے کی طرح خوب موٹا تازہ تھا۔اس کا نگ بے حد سیاہ تھا، بالکل جیسے الٹا توا۔اس کے دونوں رخساروں پر زخم کے کئی نشان تھے جو اس کے چہرے کے بھونڈے پن میں اضافہ کر رہے تھے۔اس کے دونوں ساتھی بھی مضبوط جسموں الے تھے۔

کالیے نے اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔''خان!''اس کی واز بھی بھاری اور بے ہنگم تھی۔

''کیا ہے؟''میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں مرنے کی بہت جلدی ہے کیا؟''اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔''زندگی سے نگ ہو؟''

''میں سمجھا نہیں۔''میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''سئور کے بچے!''وہ بڑے زور سے گرجا۔''بکا کے آدمیوں پر ہاتھ اٹھاتا ہے مچھر ی اولاد! مار مار کر بھیجا نکال دوں گا۔''

گالی سنتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا اور میری مٹھیاں آپ ہی آپ بھینچ گئیں۔

''خبردار گالی مت دینا۔''میں نے بھی چیختے ہوئے کہا۔

''سالے آواز اونچی کرتا ہے ہمارے سامنے!''اس نے چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

سے آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے چھلانگ لگا دی۔دکان چھوٹی تھی، مقابلے کے ئے موزوں بھی نہیں تھی۔اسی لئے میں چھلانگ مار کر سڑک پر آ گیا تھا۔وہ بھی چاقو لہراتا ہوا پکا اس کا ساتھ دینے کے لئے اس کے ساتھی بھی لپکے۔میں نے ان کی غلطی سے فائدہ اٹھالیا۔ب سے آگے والے کے سینے پر زوردار لات ماری وہ پیچھے والے پر جا پڑا اور پیچھے والے کا

چاقو اس کی پیٹھ میں دھنس گیا۔ اس کی چیخ سے وہ سب چونکے۔ میں نے انھیں موقع دینا مناسب نہیں سمجھا اور داہنی جانب والے کو ٹانگ اڑا کر گرا دیا۔ وہ گرا ہی تھا کہ دوسرے کو بھی اس پر دھکا دے دیا۔ میرے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ کبھی میں اچھل کر ایک کو ٹکر مارتا تو کبھی دوسرے کے سینے پر لات۔ تینوں غنڈے اپنے ہی ساتھیوں کے چاقوؤں کا شکار ہو چکے تھے۔ مجھے بھی کئی زخم آئے تھے۔ اپنے ہی خون میں نہا کر میں اور زیادہ غضب ناک ہو گیا تھا۔ موت سے ٹکراتے ہوئے مجھے دشمنوں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں نے سارے غنڈوں کو زمین چٹا دی۔ ان سے فرصت پا کر دور کھڑے تماشائیوں کی بھیڑ میں ایک پولیس والے کو دیکھ کر میں آواز دی۔ وہ ڈرتا سہمتا نزدیک آ گیا۔

’’یہ تینوں مجھے قتل کرنے آئے تھے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’آ......آپ تھانے میں رپورٹ لکھا دیں۔‘‘ سپاہی نے کہا۔

’’تمہارے ساتھ ایک اور سپاہی تھا وہ کہاں گیا؟ کچھ دیر پہلے میں نے دو سپاہی دیکھے تھے۔‘‘

’’وہ تھانے گیا ہے، بلوے کی خبر دینے۔‘‘

میں اس سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ پولیس جیپ پہنچ گئی۔

’’حضور یہ سب مجھے مارنے آئے تھے۔‘‘ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

’’تم کیا کرتے ہو؟‘‘ افسر نے پوچھا۔ اس کے لہجے سے میں پہچان گیا تھا کہ وہ پنجابی ہے اس لئے میں نے بھی پنجابی میں کہا۔

’’یہ میری دکان ہے میں بیٹھا ہوا تھا کہ یہ لوگ آ گئے۔‘‘

’’اوہ۔‘‘ افسر نے کہا۔ ’’ضرور بھتا مانگ رہے ہوں گے۔ اس حرام خور بکا نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ آپ کسی وقت تھانے آ جائیے گا۔ رپورٹ لکھوانا ضروری ہے۔‘‘

’’جو حکم، لیکن میں اسے فضول سمجھتا ہوں۔ میں انھیں اچھی خاصی سزا دے ہی چکا ہوں۔‘‘

’’جیسی آپ کی مرضی۔ میں دو سپاہی دکان پر چھوڑے جا رہا ہوں۔‘‘

’’میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ کے سپاہی کتنے بہادر ہیں۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’سب کے سب نئے ہیں۔ تقسیم سے پہلے یہاں صرف ہندو سپاہی تھے جو



ہندوستان چلے گئے۔ بنگالی مسلمانوں کو فوج یا پولیس میں بھرتی کیا نہیں جاتا تھا۔ زمینداروں نے پابندی لگا رکھی تھی، اس لئے کچھ پریشانی ہے۔‘‘ افسر نے کہا۔

’’ان نئے سپاہیوں کے بھروسے پر کام کیسے ہوگا؟‘‘ میں نے کہا۔

’’جنوری 1948ء میں ایوب خان یہاں کے جنرل آفیسر کمانڈنگ بن کر آئے تھے، آتے ہی انھوں نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ انصار کے نام سے نیم فوجی رضا کار تنظیم بنائی۔ ایسٹ پاکستان رائفلز نامی نیم فوجی جمعیت قائم کی اور ایسٹ بنگال رجمنٹ کی بنیاد ڈالی۔ تینوں فورسز ٹریننگ پر ہیں، بہت جلد ہمیں ضرورت کے مطابق ٹرینڈ سپاہی ملنے لگیں گے۔ یہاں سے جاتے وقت ایوب خاں نے حکم دے دیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بنگالی نوجوانوں کو پولیس میں لیا جائے۔‘‘

’’اگر ایسا ہو رہا ہے تو مستقبل درخشاں ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’آپ باتیں چھوڑیں۔ پہلے جا کر طبی امداد لیں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے افسر نے تینوں غنڈوں کو جیپ میں لدوایا اور چل پڑا۔

مرہم پٹی کرا کر جب میں لوٹا تو دکاندار چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے آواز دے کر آس پاس کے دکانداروں کو بلوایا۔ وہ سب ڈرتے سہمتے ہوئے نزدیک آ گئے۔

’’ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھانا بھی کفر ہے۔ ظالموں کا احتساب کرنا بھی جہاد ہے۔ آج سے آپ سب ظلم کے خلاف متحد ہو جائیں۔ بکا کو بھتہ دینا بند کر دیں۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔‘‘ میں نے ان سے نرم لہجے میں کہا۔

’’اس کے آدمی بازار اجاڑ دیں گے۔‘‘ ایک دکاندار نے سہم کر کہا۔

’’رزق خدا دیتا ہے، بکا نہیں۔ اسے مالی امداد دے کر آپ بھی گنہگار ہو رہے ہیں۔ آپ کی عبادت و ریاضت پر پانی پھر رہا ہے۔ یہ ملک ہمیں بھیک میں نہیں ملا ہے، قربانیوں کے بدلے حاصل ہوا ہے۔ یہاں گناہ کی کھیتی کرنے والوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔‘‘

’’ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔‘‘ کئی دکانداروں نے ایک ساتھ کہا۔

’’اب آپ سب اپنی دکان میں بیٹھیں۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔‘‘

میں نے بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب سے رکھنا شروع کر دیا۔ دن بھر لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ جو بھی آتا میری بہادری پر شاباشی دیتا۔ یہ سلسلہ رات نو بجے تک چلتا رہا۔

حسبِ معمول رات نو بجے میں نے دکان بند کی اور سنسان بازار پار کرتا ہوا بونوگرام کی طرف چل دیا۔ ٹھٹیری بازار کے موڑ پر پہنچا تھا کہ مجھ پر کسی نے مچھلی پکڑنے کا جال پھینکا اور میں اس میں الجھ گیا، ہاتھ پیر چلا ہی رہا تھا کہ مجھ پر ڈنڈوں کی بارش شروع ہوگئی۔ پتا نہیں کتنے ڈنڈے پڑے۔ متواتر ضربوں نے میرے حواس گم کردیئے۔

خدا جانے کب تک میں بے ہوش رہا۔ آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک کرسی سے بندھا ہوا پایا۔ دروازہ بند تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بکا نے مجھے اغوا کرلیا ہے۔ وہاں سے رہائی کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔

یکا یک میری نظر کمرے میں جلتے چراغ پر ٹھہر گئی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آہستہ آہستہ میں نے چراغ کی جانب کھسکنا شروع کردیا۔ توازن برابر رکھتے ہوئے کرسی کے ساتھ سرکنا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی میں ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں انچ انچ کھسکتا ہوا چراغ تک پہنچ ہی گیا۔ چراغ کے نزدیک پہنچ کر نیا مسئلہ سامنے تھا۔ میں نے جسم کو گردش دینا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ کرسی گھوم گئی۔ اندازے سے میں نے چراغ پر ہاتھ رکھ دیا لیکن اندازہ غلط ثابت ہوا اور ہاتھوں کی جلد جھلس گئی۔ جلن کی شدت کو دبانے کے لئے میں نے ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔ دوسری بار پھر کوشش کی اور رسی کی گانٹھ کو چراغ کے اوپر رکھنے میں کامیاب ہوگیا۔ ہاتھ جلے لیکن رسی کھل گئی۔ میرے لئے مٹی کے تیل کا معمولی چراغ رحمت بن گیا تھا۔

رسی کھلتے ہی میں نے ہاتھوں کو سامنے کیا۔ دو جگہ آبلے پڑ گئے تھے۔ آبلوں پر زبان پھیری، سوزش میں کچھ کمی آگئی۔ مسلسل بندھے رہنے کی وجہ سے ہاتھ سن ہوگئے تھے۔ دوران خون کو جلد از جلد ٹھیک کرنے کے لئے میں نے تیزی سے ہاتھ ہلانا شروع کیے۔ کچھ ہی دیر کی ورزش نے دورانِ خون کو درست کردیا اور میں اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کرنے لگا۔ خطرہ سر پر تھا کسی بھی وقت دشمن آسکتا تھا اس لئے میں نے دروازے پر زور لگایا وہ باہر سے بند تھا۔

ڈھاکہ کے عام گھروں کی طرح وہ گھر بھی بیڑے کا تھا۔ بانس کی چٹائیوں کا' میں نے پچھیتوں کو ایک ایک کرکے توڑنا شروع کردیا۔ رات کے سناٹے میں پٹ پٹ کی آواز گونج رہی تھی۔ آواز پر دشمن متوجہ ہوسکتے تھے پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری۔ کچھ ہی دیر میں باہر نکلنے کا راستہ بن گیا۔

باہر نکلتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ میں کیپٹن بازار کی پشت پر کھڑا



تھا۔ ریلوے لائن پھلانگ کر دو تین قدم چلا ہوں گا کہ ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

میرے پیچھے قدموں کی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، دو آدمی تیز قدموں سے اسی گھر کی طرف بڑھ رہے تھے جس میں مجھے قید کیا گیا تھا۔ میں بھی تیز قدموں سے ریلوے لائن پار کرنے لگا، دوسری لائن پار کررہا تھا کہ وہ دونوں میرے پیچھے دوڑے۔ انھیں میرے فرار کا علم ہوگیا ہوگا۔ میں نے رفتار تیز کردی کہ دو آدمی سامنے سے بڑھے۔

''پکڑلو جانے نہ پائے۔'' پیچھے والے نے چیخ کر کہا۔

سامنے والے ہوشیار ہوگئے۔ ایک نے چاقو کھول لیا۔ وہ دونوں نشیب میں تھے اور میں ریلوے لائن پر۔ پیچھے والے بھی بڑھے آرہے تھے، وقت کم تھا۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا اور سامنے والوں پر چھلانگ لگادی اور چاقو والے سے ٹکرایا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگرا۔ اس کے ساتھی مدد کے لئے بڑھے تھے کہ میں نے چیتے کی طرح دوبارہ زقند بھری۔ ایک کے سینے پر اور دوسرے کے سر پر میری لات پڑی۔ وہ دونوں دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ انھیں موقع دیے بغیر میں دکانوں کی جانب دوڑ پڑا۔ وہ سب گالیاں بکتے میرے پیچھے لپکے۔ انھیں پیچھے آتے دیکھ کر میں نے ٹھٹیری بازار کی مچھلی پٹی کی طرف دوڑ لگادی۔ میری کوشش بارآور ہوئی اور میں پتلی پتلی گلیوں میں گھس گیا۔ مچھلی پٹی میں پہنچ کر میں نے ایک خالی حوض میں چھلانگ لگادی۔ حوض بالکل سوکھا تھا پھر بھی بو ناقابل برداشت تھی۔ دل پر جبر کیے میں اس میں لیٹا رہا۔ میں اگر چاہتا تو ان چاروں سے بھڑ سکتا تھا لیکن ڈنڈوں کی چوٹ سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ حوض میں لیٹنے سے مجھے کچھ آرام مل گیا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے تک میں وہیں دبکا رہا۔ پھر خطرہ ٹلنے کے بعد میں وہاں سے نکلا۔

حالات کی اس نئی کروٹ نے زندگی کی یکسانیت کو ختم کردیا تھا۔ لہو میں گرماہٹ آگئی تھی۔ پاڑے کی فضا نے جو ہنر سکھائے تھے وہ کام آرہے تھے۔

اس رات مجھے بھی خوشگوار نیند آئی تھی۔ صبح میں بالکل تازہ دم تھا ہاتھ منہ دھو کر ناشتا کرنے کے لئے سوسائٹی ہوٹل جارہا تھا کہ بی سی روڈ کے نکڑ پر ایک شخص نے مجھے روک لیا، اس کے تیور اچھے نظر نہیں آرہے تھے۔ اس نے غراتے ہوئے کہا۔ ''خان تم نے اچھا نہیں کیا۔ رات محمود مر گیا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔''

''کون محمود؟'' میں نے پوچھا۔

''جسے تم نے ریلوے لائن پر پچھاڑا تھا۔ آج استاد کسی وقت تم سے ملنے آئے گا۔''

"اسے بھی دیکھ لوں گا۔" میں نے ہوٹل کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں ٹہلتا ہوا کیپٹن بازار کی جانب بڑھا۔ بازار ابھی پوری طرح کھلا نہیں تھا۔ صرف گوشت کی دکانیں کھلی تھیں۔ میں نے اپنی دکان کے سامنے پہنچ کر گردوپیش کا جائزہ لیا اور تالا کھول کر صفائی میں جت گیا، مرتبانوں پر جھاڑن پھیر رہا تھا کہ ابوالکلام آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جس کے پھٹے پرانے کپڑے عسرت و تباہ حالی کا ثبوت تھے۔ میں نے کلام صاحب کو سلام کیا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے نوجوان کا تعارف کرایا "یہ میرا داماد ہے۔ کھوندوکار ابوالبشر"۔

"اچھا اچھا بیٹھیے۔" میں نے انھیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

نوجوان سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ انتہائی سادا اور بھولا ہے۔

"اسے نوکری کی ضرورت ہے۔" کلام صاحب نے کہا۔

"بہتر ہے اسے یہاں چھوڑ جائیے۔" پھر میں نے نوجوان کی جانب مڑ کر کہا۔ "تمہاری تنخواہ پچھتر روپے مہینا ہوگی، بولو منظور ہے؟"۔

"پچھتر روپے؟" بشر نے حیرت سے کہا۔ "مجھے منظور ہے صاحب، منظور ہے۔"

وہ بنگلہ میں بول رہا تھا اس لئے میں نے کلام صاحب سے پوچھا "کیا اسے اردو نہیں آتی"۔

"نہیں صاحب، اس نے اسلام نہیں پڑھا ہے۔"

اس دور میں اردو کو اسلامی زبان کہا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ جب قومی زبان بنگلہ کا ایجی ٹیشن ہوا تھا تو سرکردہ علما نے احتجاجیوں کو کافر قرار دے دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دکانداری سیکھنے کے ساتھ ساتھ تم اردو بھی سیکھو گے؟ کیوں کہ یہ بازار اردو دانوں کا ہے۔"

"اچھا جناب، اب مجھے اجازت دیں۔" کلام صاحب کھڑے ہو گئے۔

انھیں رخصت کر کے میں گھر چلا آیا۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ نیند ٹوٹی تو دیکھا گھڑی چھ بجا رہی تھی، اچھل کر بستر سے اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر دکان جانے کے لئے نکل گیا۔ کیپٹن بازار پہنچ کر دل خوش ہو گیا۔ ابوالبشر نے اچھی خاصی دکانداری کر لی تھی۔ اس دن سے



میں نے ڈیوٹی بانٹ لی۔ میں نے صبح کو دکانداری اس کے ذمے لگائی اور شام کی میں نے اپنے ذمے لے لی۔ اسے میں نے رہنے کے لئے ایک کمرا بھی دے دیا تھا۔ کچھ دنوں بعد وہ فریدہ کو بھی لے آیا۔

اس نے آتے ہی گھر سنبھال لیا۔ اجڑے ہوئے گھر میں بہار آ گئی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ ایک سال پلک جھپکتے گزر گیا۔ اس دوران میں دو بار چچا ڈھاکہ آئے، فریدہ سے بھی ملے۔ وہ اس کی خدمت گزاری سے مرعوب ہو گئے تھے۔ ان کے خطوں میں بھی فریدہ کے لئے دعائیں ہوتی تھیں۔ باجی کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں دیارِ غیر میں اکیلا نہیں ہوں۔ کوئی میرا بھی پرسان حال ہے۔ وہ فریدہ کو بھی خط لکھتیں۔ ان کے ہر خط میں میرے لئے لڑکی تلاش کرنے کی تاکید ہوتی۔ فریدہ اردو سے نابلد تھی اس لئے خط میں ہی پڑھ کر سناتا اور تاکید کو حذف کر لیتا۔

ایک بار اس نے خط اپنے ابا سے پڑھوا لیا اور جب میں رات کو گھر آیا تو اس نے دسترخوان بچھاتے ہوئے کہا۔ "میری ایک بات مانیے گا؟"

"کہو!" میں نے ٹرے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"آپ فردوس کو اپنا لیں۔" فریدہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے تمھیں بہن بنایا ہے اس رشتے سے وہ بھی میری بہن ہوئی نا!"

"بیٹا کہنا تو نہیں چاہیے، شرم و حیا مانع ہے، پھر بھی کہہ رہا ہوں۔" ابوالکلام صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "ہر بیٹی کے باپ کی تمنا ہوتی ہے کہ اسے اچھا داماد ملے اور ایک اچھے داماد میں جتنے اوصاف ہونے چاہئیں وہ سب تم میں ہیں تو کیوں نہ تمھیں اپنا داماد بنا لوں؟ میری بیٹی کی زندگی سنور جائے گی اور تمھاری زندگی کا خلا بھی پُر ہو جائے گا۔"

"لیکن میرے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے پھر بھی ......"

"یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ تمھیں علی شیر خان نے پالا ہے اور تمھاری زبان جدا ہے۔"

"جی!"

"کیا تمھارا خدا، رسول اور کتاب جدا ہے؟ جب سب ایک ہے تو زبان کو آڑ کیوں بنایا جائے..... ہمیں ایک دوسرے کے نزدیک آنے کے لئے ایسا قدم اٹھانا ضروری ہے۔ جب تک ایسا نہیں کیا جائے گا زبان کا مسئلہ کھڑا کرنے والے غدارِ وطن فائدہ اٹھانے کی کوشش

کرتے رہیں گے۔"

"میں سوچ کر جواب دوں گا۔" میں نے ٹالنا چاہا۔

"سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے آج ہی تمھاری کنیز باجی اور چچا کو خط لکھ دیا ہے۔ اب فیصلہ وہی دونوں کریں گے۔"

میں اسے مذاق سمجھا تھا لیکن ایک ہفتے کے اندر علی شیر چچا، بیوی، بچوں، بھائی، بھاوج کے ساتھ پہنچ گئے۔ میں انھیں سمجھانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ باجی اور نوشے بھائی بھی آ گئے۔ ان کا بیٹا شرجیل آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔ "ماموں جان، ممانی کہاں ہیں؟"

"شکر کرو بیٹے کفر ٹوٹا ورنہ میں تو ناامید ہو چکا تھا۔" نوشے بھائی نے چٹکی لی۔

"اللہ، اب تو میرے بھیا کی جان بخش دیں کہیں بدک گئے تو پھر ہمیں بڑھاپے تک انتظار کرنا پڑے گا۔" علی چچا کی چھوٹی بیٹی گل نے چوٹ کی۔

"اگر تم سب اسی طرح کرو گی تو میں......"

میرا جملہ کاٹتے ہوئے گل بھابی نے کہا۔ "تو میں، کسی کو ساتھ لئے بغیر بکرم پور چلا جاؤں گا۔"

ان کی بات پر سب کھلکھلا پڑے۔

"میں ٹھہرا محکمہ خفیہ کا آدمی میں تو پھر بھی پہنچ جاؤں گا۔ سراغ لگانا تو میرا کام ہے۔" نوشے بھائی نے کہا۔

"ابوتراب۔" چچا نے نوشے بھائی کو پکارا۔

"جی۔" کہتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"ہاں تو جناب یہ بتائیں، میری ہونے والی بھابی کیسی ہیں۔" گل نے پھر چھیڑا۔

"دو ہاتھ، دو کان اور دو آنکھیں ہیں۔" میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"وہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ یہ بتائیں موٹی ہیں۔ دبلی ہیں، کالی ہیں یا گوری ہیں۔ چیچک زدہ ہیں یا روسیاہ ہیں۔" گل نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

"جنی فریدہ کو تو دیکھ ہی لیا ہے اسی سے اندازہ لگا لو۔" چھوٹی چچی نے کہا۔

"اللہ، ان کے بال کتنے لمبے ہیں، بھابی کے بھی ایسے ہوئے تو مزا آ جائے گا۔"

[illegible] نے کہا۔



"بال ہوگا بھابی کے سر میں اور مزا تم لو گی؟" علی شیر چچا کے بیٹے افروز نے کہا۔

"کیا پیک کر کے پاراچنار لے جاؤ گی؟"

"خبردار، تم نظر نہ لگا دینا" ۔گل نے محبت آمیز لہجے میں جھڑکا۔ "میں اپنی سہیلیوں کو فخر سے دکھاؤں گی۔ ان کے بال دیکھ کر سب جل بھن جائیں گی۔"

"دیکھا بھیا، یہ بھابی پسند کرنے آئی ہے یا سہیلیوں سے لڑنے کا بہانہ تلاش کرنے آئی ہے۔" افروز نے گل کو چھیڑا۔

"خبردار مجھ سے مت الجھنا، میری بھابی ہیں، میں جو چاہوں کروں تم کون ہوتے ہو بولنے والے۔"

"اچھی بات ہے میں نہیں بولتا، تم بھابی کے بال رکھ لینا اور میں بھابی کو، وہ میرے گھر میں اتریں گی"۔

"افروز کے بچے میں تیرا سر توڑ دوں گی"۔ گل نے تکیہ پھینک مارا۔

"کیا ہوا بھائی، تم لوگ لڑ کیوں رہے ہو۔" فریدہ نے گل کو تکیہ پھینکتے دیکھ کر پوچھا......سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، بنگلہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ان کے چہرے پر پھیلے تجسس کو دیکھ کر میں نے فریدہ کے سوال کا پشتو میں ترجمہ کر دیا۔

"دیکھیے ناں، یہ کہتا ہے بھابی کو میرے گھر رہنے نہیں دے گا۔" گل نے کہا اس کی مخاطب فریدہ تھی لیکن نظریں مجھ پر تھیں۔ وہ ترجمے کے لئے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میں نے سمجھ کر بھی انجان بن کر پوچھا۔

"کیوں مجھ سے کہا؟"

"جی ہاں!" اس نے چڑ کر کہا۔ "آپ انھیں گٹ پٹ میں سمجھا دیں"۔

میں نے جھگڑے کی وجہ فریدہ کو بتا دی۔ وہ بھی مسکرا پڑی۔

"بھیا کیا بھابی بھی یہی زبان بولیں گی؟" گل نے پوچھا۔

"ہاں"۔

"تب جاؤ تم ہی رکھ لینا، میں روز آ کر دیکھ لیا کروں گا۔" افروز نے گل سے کہا۔

"کیوں کیوں؟" گل نے پوچھا۔

"اس لئے کہ جاتے وقت بھیا سے ڈھیر سارا بنگلہ کا سبق لکھوانا ہے۔ اسے یاد بھی تو کرنا ہوگا۔ جب یاد ہو جائے گا تب لے آؤں گا تا کہ خوب ڈھیر ساری باتیں کر سکوں"۔

گل جواب میں کچھ کہتی کہ نوشہ بھائی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اعلان کیا۔ ''کل ہم لوگ بکرم پور جائیں گے''۔

''مرحبا'' باجی نے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

نوشے بھائی ان کی بات سن نہیں پائے تھے وہ اپنی ہی دھن میں کہتے رہے۔ ''لڑکی کے والد کا خیال تھا کہ لڑکی کو یہیں بلا لیا جائے لیکن میں نے منع کر دیا۔ کیوں کہ اس بہانے دریا کے سفر کا تجربہ بھی ہو جائے گا، اور ہاں فریدہ جاتے وقت یہ خط دے گئی ہے''۔

میں نے چھوٹی سی پرچی کو کھول لیا۔ فریدہ نے بنگلہ رسم الخط میں لکھا تھا کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے گاؤں میں شادی کی رسم ادا ہو کیوں کہ وہاں خطرہ ہے۔ تم ہوشیار رہنا۔''

اس پرزے نے مجھے الجھا دیا تھا۔ میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ باجی نے پوچھا ''مولانا سے بات کی یا نہیں؟''......

''وہاں کی مسجد کے امام کو بلا لیں گے وہی نکاح پڑھا دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں نکاح شیعہ عالم پڑھائے گا۔'' باجی اڑ گئیں۔

''کیا شیعہ عالم توریت سے خطبہ پڑھے گا یا انجیل سے؟ بیگم تم لوگوں کی ضد کبھی کبھی کھل جاتی ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ کسی شیعہ عالم کو تلاش کریں۔'' باجی نے ضد پکڑ لی۔

''ہاں بیٹا، میں بھی یہی کہنے آیا تھا تاکہ تمھارے گھر والے کوئی بات نہ پیدا کردیں۔'' علی شیر چچا نے نوشے بھائی سے کہا۔

''چلیے!'' کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔ گھر سے باہر نکل کر انھوں نے پوچھا۔ ''کتنی دور جانا ہو گا۔''

''پرانا پلٹن کے علاقے میں حبیب بینک والوں نے امام بارگاہ بنائی ہے، پہلے وہاں دیکھ لیتے ہیں۔ اگر وہاں کے مولانا راضی نہ ہوئے تو چائے کی پتی والے ایم ایم اصفہانی کی امام بارگاہ چلیں گے۔ انھوں نے ایران سے مولانا کو بلا رکھا ہے''۔

''چلو'' کہتے ہوئے انھوں نے ایک سائیکل رکشا والے کو اشارہ دیا۔ رکشے پر بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''پرانا پلٹن جماعت خانہ''۔

شومیٔ قسمت وہاں کے مولانا سید پور گئے ہوئے تھے۔ مجبوراً مگ بازار جانا پڑا۔ ایرانی مولانا اردو سے نابلد تھے۔ بڑی مشکلوں سے مافی الضمیر سمجھایا۔ ان سے وعدہ بھی لے لیا



کہ وہ خود صبح سات بجے تک گھاٹ پہنچ جائیں، انھوں نے ہامی بھر لی۔ وہاں سے لوٹ کر دیکھا چچا نے اچھی خاصی خریداری کر لی ہے۔ میرا کمرہ کپڑوں کا گودام بنا ہوا تھا۔ چچا نے ساڑھیوں کے بنڈل دکھاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے، میں نے کبھی ساڑھی خریدی نہیں ہے پہلا تجربہ ہے دیکھ کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

''یہ سب بعد میں دیکھنا،، پہلے کھانا کھا لو'' چچی نے پکار کر کہا۔

کھانا کھا کر میں نے سونے کی کوشش شروع کر دی لیکن نیند تو جیسے روٹھ گئی تھی۔ برابر والے کمرے میں عورتوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ اسی کمرے میں سب کی زبانیں سو میل کی رفتار سے چل رہی تھیں۔ میرے کمرے میں چچا اور نوشے بھائی کے علاوہ بچوں کی فوج بھی تھی وہ بھی نیند میں خلل ڈال رہے تھے۔ اذان کے وقت جھپکی آئی تھی کہ چچا نے اٹھا دیا۔ نماز سے فارغ ہو کر سب نے جیسے تیسے ناشتہ کیا اور رکشے کا انتظار کرنے لگے۔ رکشے والا وعدے کے مطابق چھ بجے پہنچ گیا اور ہم سب صدر گھاٹ چل پڑے۔

بے پردگی سے بچنے کے لئے پوری لانچ ریزور کرالی تھی۔ چھوٹی سی اس لانچ میں عورتوں کو نیچے اور مردوں کو ٹھیک پر جگہ ملی۔ مولانا کو کیپٹن کے ساتھ اوپر کیبن میں بٹھا دیا تھا۔

لانچ کا سفر سب کے لئے نیا ایڈونچر تھا۔ سنگلاخ پہاڑوں کے دیس والے دریائے بوڑھی گنگا کے حسن کو دیکھ کر اش اش کر اٹھے تھے۔ چھل چھل کرتا اچھلتا دریا اور دونوں کناروں پر دور دور تک پھیلی ہریالی کو دیکھ دیکھ کر سب پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں عورتوں والے کیبن میں اتر گیا۔ گل کھڑکی پر کھڑی باہر کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اسی کے برابر باجی بھی کھڑی تھیں کہ وہ چیخ اٹھیں۔ ان کی چیخ سن کر میں نے گھبرا کر پوچھا ''کیا ہوا؟''

''ایک ..... ایک جانور اچھلا اور پانی دو رنگ میں بدل گیا'' خوف سے ہکلاتے ہوئے انھوں نے کہا۔

انھیں ہٹا کر میں نے باہر جھانکا اور میرے منہ سے قہقہہ ابل پڑا۔ مجھے ہنستے دیکھ کر چچی نے ڈانٹا۔ ''کبریٰ کی حالت غیر ہو رہی ہے اور تم ہنس رہے ہو''۔

''ہنس اس لئے رہا ہوں کہ سرحد جیسے غیور و بہادر علاقے کی بہو اور چوہے جیسا دل۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ خود دیکھیں چچی۔ وہ جانور پھر دکھائی دے گا'' باجی نے کہا۔

''وہ جانور نہیں مچھلی ہے۔ انسانوں کی دوست مچھلی، ڈولفن کی ایک قسم ہے۔ اسے بنگلہ میں شیشو کہتے ہیں یعنی ازمانی بچہ۔ وہ ڈوبتے انسانوں کو بچا لیتی ہے اور پانی دو رنگ کا ہوا نہیں بلکہ ہے' دو دریا مل رہے ہیں۔ سیت لکھا اور بوڑھی گنگا کا ملاپ ہے یہ۔ بوڑھی گنگا کا پانی سرمئی ہوتا ہے اور سیت لکھا کا مٹیالا۔ اسی جگہ پر آ کر شہنشاہ جہانگیر نے اپنا ارادہ بدلا تھا ورنہ ڈھاکا مغلوں کا دارالسلطنت بن جاتا۔'' میں نے کہا۔

''کیا ڈھاکا بہت پرانا شہر ہے؟'' گل نے پوچھا۔

''یہاں ہندوؤں کی دیوی ڈھاکیشوری کا مندر ہے اسی وجہ سے اس کا نام ڈھاکہ رکھا گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''جہانگیر نے اسے نظر انداز کیوں کر دیا؟'' باجی نے پوچھا۔

''وہ اسے دارالسلطنت بنانا چاہتا تھا تاکہ بار بار کی بغاوت ختم ہو جائے۔ اس نے نئے انداز سے شہر کی تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ موتی مسجد، حسینی دالان، لال باغ قلعہ وغیرہ اسی دور کی یادگار ہے۔ شہر کی تعمیر جاری تھی کہ معاینے کیلئے جہانگیر خود پہنچ گیا۔ ایک شام، مصاحبین کے ساتھ دریا کی سیر کو نکلا۔ جب اس کا بجرہ ان دونوں دریاؤں کے مہانے پر پہنچا تو اس نے ارادہ بدل دیا۔ اس کا کہنا تھا' کہ جس جگہ کا پانی ایک ساتھ مل کر بھی نہیں ملتا وہاں کے لوگوں کا دل بھی کبھی نہیں ملے گا۔ تعمیر روک دی جائے اور اس شہر کی قسمت کا ستارہ ڈوب گیا۔''

میں بنگال کے سنہرے دور کی کہانی سنا رہا تھا کہ نوشے بھائی نے پکارا۔

''ضیغم باہر آ کر بتاؤ لانچ کہاں کھڑی کی جائے؟'' کیبن سے نکل کر میں عرشے پر پہنچ گیا۔

''وہ کٹھل کا پیڑ نظر آ رہا ہے۔ وہیں پر۔'' میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لانچ رکتے ہی ایک کے بعد ایک سب اترے اور ہمارا چھوٹا سا قافلہ دھایدا گاؤں کی طرف چل پڑا۔

گاؤں کی پگڈنڈی جانی پہچانی تھی، پچاسوں بار آ چکا تھا لیکن اس بار میرے پیروں میں لغزش سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سا سرور طاری تھا۔ گاؤں کی سرحد پر استقبال کے لئے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ وہ سب اپنے جلو میں لے کر کلام صاحب کے گھر تک پہنچے۔ گھر کے باہر دریاں بچھی تھیں۔ ہم سب گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ عورتوں کو گھر کے اندر بھیج دیا گیا تھا۔

میں فرید کے خط میں بتائے ہوئے خطرے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس خط کے بارے میں کسی کو میں نے بتایا نہیں تھا لیکن کمر میں اڑس کر پستول لے آیا تھا۔ کچھ فاضل



گولیاں بھی رکھ لی تھیں۔ چچا تو پستول کو اپنی شان کہا کرتے تھے اور نوشے بھائی کو سرکار نے پستول دے رکھا تھا۔ تین پستول سے تو ہم بڑی سے بڑی فوج کا بھی منہ پھیر سکتے تھے۔ اس لئے کچھ اطمینان تھا اور میں خاموشی سے آنے والے خطرے کا انتظار کر رہا تھا کہ دیکھوں کس شکل میں سامنے آتا ہے۔

چچا وغیرہ بھی خاموش بیٹھے تھے لیکن ان کی خاموشی کی وجہ کچھ اور تھی۔ بنگلہ ان کے پلے نہیں پڑ رہی تھی اور گاؤں والے اردو سے نابلد تھے۔ پھر بھی براتی خوش تھے کیوں کہ خلوص کی کوئی زبان نہیں ہوتی وہ تو احساس کے کاندھوں پر سوار ہو کر دل تک پہنچتی ہے۔ گاؤں والوں کے فرشِ راہ بن جانے کے انداز نے انھیں متاثر کیا تھا اور یہی احساس زبان کی اجنبیت کو بار ہونے نہیں دے رہا تھا۔

نوشے بھائی اسی نکتے پر لیکچر دے رہے تھے کہ ابوالکلام صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک باریش شخص بھی تھا۔

''یہ رجب علی منڈل ہیں۔ ہمارے گاؤں کی مسجد کے امام''۔ انھوں نے تعارف کرایا۔ چچا نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

''میں آج بہت خوش ہوں۔'' رجب علی نے سرشار لہجے میں کہا۔ ''فرنگیوں کے دانت کھٹے کر دینے والے مجاہدین کی دھرتی کے سپوت ہمارے گاؤں میں آئے ہیں۔''

''آپ لوگ بھی جہاد میں پیچھے کب تھے۔'' چچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہادروں سے آپ کی بھی سرزمین بھری پڑی ہے۔ عیسیٰ خاں تو آپ کے اسی بکرم پور کے تھے جس نے دریا کو ہتھیار بنایا تھا۔''

''کیسے؟'' افروز نے سوال کیا۔

''بیٹے وہ ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ ان کے پاس توپ وغیرہ نہیں تھی، پھر بھی انھوں نے اعلانِ آزادی کر دیا۔ دشمن نے ان کی سرکوبی کے لئے بہت بڑا بحری بیڑا بھیجا۔ وہ جانتے تھے کہ ڈھاکا سے بکرم پور کا بس ایک ہی راستہ ہے یعنی دریائی راستہ۔ انھوں نے دریا میں جگہ جگہ ہزاروں بانس گٹھری کی صورت میں باندھ کر دریا پر بند باندھ دیا۔ جونہی دشمن کا بیڑا نزدیک پہنچا عیسیٰ خاں کے سپاہیوں نے بانس کی رسی کاٹ دی۔ رکا ہوا پانی اچھلتا ہوا آگے بڑھا۔ تیز بہاؤ کے ساتھ بانس جا جا کر دشمن کی کشتیوں سے ٹکرائے اور بیڑا تباہ ہو گیا۔'' رجب علی نے قصہ پارینہ دہرا دیا۔

''شہید تیتو میر بھی تو اسی بنگال کے تھے۔'' چچا نے یاد دلایا۔

''جی ہاں، وہ جیسور ضلع کے نارکل باڑی کے زمیندار تھے۔ بہت چھوٹے سے زمیندار پھر بھی جوش ایمانی میں انگریزوں سے ٹکرا گئے۔''

''ان کا کہنا تھا کہ ہم غیر مسلم کو لگان نہیں دیں گے۔ مسلمانوں کا پیسہ پاک ہوتا ہے اور اس پاک پیسے سے فرنگی شراب پیتے ہیں۔ انگریزوں نے ان کی سرکوبی کے لئے ایک بڑی فوج بھیجی۔ اس سے مقابلے کے لئے قلعے کی ضرورت تھی اور میر تیتو میر نے بانس کا قلعہ بنالیا۔ بھوک پیاس کے باوجود ان کے سپاہیوں نے آخری دم تک مقابلہ کیا۔ تیتو میر شہید ہو کر بھی روشنی کے مینار ہیں۔ ایمان فروشی سے بہتر انھوں نے موت سمجھی تھی۔'' رجب علی نے کہا۔

''پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ بہادر صرف سرحد میں ہیں۔'' چچا نے کہا۔ ''نواب سراج الدولہ، میر قاسم اور میر مدن جیسے جانبازوں کی دھرتی کسی حالت میں سرحد سے کم تر نہیں ہے۔ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان کسی بھی خطے کا ہو بہادری اس کی رگوں میں ہوتی ہے۔''

''بہت خوب، آپ نے تو لاجواب کر دیا۔'' رجب علی منڈل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن جناب، ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' نوشے بھائی نے کہا۔ ''آپ اتنی اچھی اردو بول رہے ہیں۔ کلام صاحب بھی اردو جانتے ہیں پھر دوسرے لوگ اردو سے ناواقف کیوں ہیں؟''

''اس لئے کہ ان لوگوں نے مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کی۔''

''مدرسے میں اردو پڑھائی جاتی ہے؟'' چچا نے پوچھا۔

''اسلامی کتب صرف اردو میں چھپتی ہیں۔ کیوں کہ بنگلہ رسم الخط کے حروف ناپاک ہیں۔ تمام حروف ہندوؤں کے بھگوان سے منسوب ہیں، اس لئے اس رسم الخط میں کتابیں چھاپی نہیں جاتیں لیکن ادھر کچھ دنوں سے کوشش ہو رہی ہے کہ اسلامی کتب بھی بنگلہ میں چھپیں۔ ایسی کوشش ہندوستانی ایجنٹ کر رہے ہیں۔''

''آپ لوگ انھیں روکتے کیوں نہیں ہیں۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر بار کوشش ہوتی ہے اور ایمان والے ان کا منہ توڑ جواب دے دیتے ہیں۔''

''اچھا!'' چچا نے کہا۔



''ہندوؤں نے تعلیم سے دور رکھنے کے لئے پاٹھ شالاؤں کا دروازہ مسلمانوں پر بند کیا تو حاجی محسن نے مدرسہ عالیہ کے نام سے جگہ جگہ مدرسے کھول دیے۔ ہندو زمینداروں نے جل کر کچھ کٹھ ملاؤں کو اکسا دیا۔ ان لوگوں نے بیان بازی شروع کر دی کہ شیعہ نے مدرسہ بنایا ہی اپنے فرقے کی تبلیغ کے لئے لیکن انھیں منہ کی کھانی پڑی۔ کلکتہ اور ڈھاکا میں مدرسہ آج بھی قائم ہے اس کے خلاف بولنے والے مٹ گئے کیوں کہ وہ جھوٹ تھا اس مدرسے میں صرف اور صرف حنفی فقہ پڑھایا جاتا تھا کیوں کہ اس علاقے میں اسی مسلک کے لوگ زیادہ تھے۔ ہاں صرف مرشد آباد اور ہگلی کے مدرسے میں فقہ جعفریہ پڑھایا جاتا ہے کیوں کہ اس علاقے میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔''

باتیں بڑے دلچسپ موڑ پر پہنچ رہی تھیں۔ ہم سب کی معلومات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا کہ یکایک شور مچاتے کچھ نوجوان ہماری جانب بڑھتے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں وہ سب مرنے مارنے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔ نعرے لگاتے نوجوانوں کے تیور دیکھ کر میزبانی کرنے والے سارے لوگ گھبرا اٹھے۔ چچا وغیرہ ان کی باتیں سمجھ نہیں پائے تھے پھر بھی ان کے تیور دیکھ کر چچا اور نوشے بھائی نے پستول کے دستے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بھی پستول نکالنے کے لئے تیار تھا کیوں کہ وہ سب ایک آواز میں کہہ رہے تھے۔ ''یہ شادی نہیں ہو گی''۔

انھیں آگے بڑھتے دیکھ کر میزبانی کرنے والے کئی نوجوان بھی لاٹھیاں نکال کر ہمارے گرد دیوار کی مانند کھڑے ہو گئے، اور جوابی نعرے لگانے لگے' شادی ہو گی اور ضرور ہو گی۔ کلام صاحب کی طرفداری میں کھڑے ہونے والوں کی تعداد کم تھی لیکن حوصلہ زیادہ تھا، پھر بڑے بوڑھے بھی کلام صاحب کی جانب سے بول رہے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کو حامی بنانے میں مصروف تھے اور میں عورتوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ خواہ مخواہ اس بیابان میں لے آیا جہاں سے نکلنے کا صرف ایک راستہ ہے یعنی دریائی راستہ۔ ان کے چنگل میں ہم سب بری طرح پھنس گئے تھے۔

اس افتاد نے کلام صاحب کو بھی دہلا دیا تھا۔ وہ تو خوف سے کانپنے لگے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر چچا نے کہا۔ ''آپ اندر جائیں۔'' اور پھر مجمع کی طرف مڑ کر دھاڑے۔ ''رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا''۔

''خان، گولی صرف تمھارے پاس نہیں، ہمارے پاس بھی ہے''۔ ایک شخص نے

بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ اس دھمکی نے چچا اور نوشے بھائی کے چہرے کی رنگت بدل دی۔ دونوں نے پستول نکال لیا۔ میں نے بھی پستول نکال لیا تھا۔

فائرنگ کا تبادلہ ہونے ہی والا تھا کہ رجب علی نے چچا کے پستول کو جھکا دیا اور اونچی آواز میں مجمع سے مخاطب ہوئے۔ ''جو لوگ مجھے امام مسجد مانتے ہیں، میں صرف ان سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا میں نے کبھی غلط بیانی سے کام لیا ہے، کسی کے ساتھ دھوکا کیا ہے؟ اگر نہیں، تو پھر بتائیں کہ آپ میری بات کیوں نہیں سن رہے ہیں؟''

''آپ کی بات سر آنکھوں پر، لیکن یہ بھی دینی مسئلہ ہے اس لئے آپ بھی ہمارا ساتھ دیں۔ فردوس ہماری عزت ہے۔ اسے غیر قوم میں جانے سے روکیں۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

''کیا ان کا مذہب دوسرا ہے؟ اگر زبان بدل جانے سے قوم بدل جاتی ہے تو تم اور ہم بھی مسلمان نہیں ہیں کیوں کہ پیارے نبی ﷺ عربی میں گفتگو کرتے تھے۔ قرآن عربی میں ہے۔ چھوڑ دو اس زبان کو! وہ بھی دوسروں کی زبان ہے۔ سنو! کان کھول کر سنو! تمھیں اپنے مفاد کے لئے بھڑکایا گیا ہے۔ فردوس عمر میں اس کی بیٹی کے برابر ہے۔ اس بدذات نے فردوس کے لئے پیغام دیا تھا یا نہیں اور جب کلام نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو بندوق اٹھا کر چلا آیا۔ خود تو کفر کا مرتکب ہو ہی رہا ہے، ایک مسلمان کے خلاف تمھیں صف بستہ کر کے تم سب کو بھی کفر کے اندھیرے میں دھکیل رہا ہے۔ اگر تمھارے دل میں ذرا سا بھی اللہ کا خوف ہے تو اس سے معافی مانگو۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو کیا حضور اکرم ﷺ نے اپنی پھوپی زاد کی شادی اپنے ایک آزاد حبشی غلام سے نہیں کرائی تھی۔ جب ہمارے آقا ﷺ اپنی بہن کی شادی غلام سے کر کے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ اسلام میں ہر کلمہ گو برابر ہے تو پھر ہم ایسا کفر کیوں کریں؟ اپنے دینی بھائی کے خلاف زبان کی وجہ سے دشمن کیوں بنیں؟ بولو، جواب دو! کیا فردوس کا مرتبہ حضور ﷺ کی بہن سے زیادہ ہے؟'' رجب علی نے تقریر کے انداز میں سوال کیا۔

ان کے انداز بیان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ منجھے ہوئے خطیب ہیں۔

انھوں نے کچھ توقف کے بعد سلسلہ کلام کو جوڑا۔ ''یاد رکھو، اسی گروہ بندی نے ہسپانیہ کو مسلمانوں سے محروم کر دیا۔ جس ملک پر آٹھ سو سال تک مسلمانوں نے حکومت کی، وہاں آج ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عاقبت نااندیشی سے یہ خطہ بھی ہسپانیہ بن جائے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسلام دشمن طاقتیں اسے اپنی ہار سمجھ رہی ہیں۔



اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے وہ نت نئی سازشیں کر رہی ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جب وید روہی کوی قاضی نظرالاسلام کی شاعری مسلمانوں کو بیدار کرنے لگی تو رابندر ناتھ ٹیگور نے کیسی چال چلی تھی؟ کیا اس نے اپنی نواسی کی شادی اس سے نہیں کرائی تھی؟ کیا شادی کے پیچھے یہ راز نہیں تھا کہ نظرالاسلام کی آواز ختم کر دی جائے؟ کیا ٹیگور کی نواسی نے نظرالاسلام کو زہر نہیں دیا تھا؟ کیا اس عورت نے اپنے بچوں کو ہندو نہیں بنا لیا؟ بولو، اسلام کی عظمت کا گیت گانے والے شاعر کے بچے ہندو کیوں بن گئے۔ اسلام دشمنوں کی سازش نے انھیں کفر کی دلدل میں دھکیل دیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تم آپس ہی میں لڑ کر اسلام دشمن طاقتوں کے آلہ کار بن جائیں۔ مفاد پرستی کو چھوڑ دو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔'' رجب علی کی تقریر نے مجمع پر سکوت طاری کر دیا تھا۔ ''بولو! جواب دو''۔ رجب علی نے سوال کیا۔

ہمارے خلاف نعرہ لگانے والوں میں سے ایک نے اچانک اپنے لیڈر کی بندوق چھین کر اسی پر تان دی اور بولا۔ ''جواب دو، ورنہ گولی چلا دوں گا۔''

''گولی چلے گی تو چلاؤ گے نا! گولی تو ابھی میرے ہاتھوں میں ہے۔'' اس نے بے حیائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن میرا ڈنڈا تو چل سکتا ہے''۔ اس کے پیچھے سے ایک نوجوان نے اس کی پیٹھ پر ڈنڈا جماتے ہوئے کہا۔ ''جلدی بتاؤ۔ کیا تم نے فردوس کے لئے پیغام دیا تھا؟ ورنہ اس بار ڈنڈا سر پر پڑے گا۔''

''ہاں دیا تھا۔'' اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''تمھیں شرم نہیں آئی۔ فردوس، تمھاری بیٹی، رخسانہ سے بھی چھوٹی ہے اور اس کے لئے پیغام! مارو اس بدبخت کو!'' ایک اور نوجوان نے اسے گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

پھر تو اس پر بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ بہ مشکل رجب علی نے اسے بچایا اور بھاگ جانے کو کہا۔ اس کے بھاگتے ہی میرے خلاف نعرہ لگانے والے بھی میز بانوں کا ہاتھ بٹانے لگے۔

''اللہ اللہ کر کے نکاح کی رسم ختم ہوئی اور ہم سب دلھن کو لے کر رخصت ہوئے۔ لانچ والا انتظار ہی میں تھا۔ فوراً لانچ اسٹارٹ ہوگئی۔

ڈھاکہ پہنچ کر دوسرے ہی دن میں نے دعوت ولیمہ کا اہتمام کر دیا اور تیسرے دن چچا وغیرہ لوٹ گئے۔

فردوس پہلے بھی اس گھر میں آ کر ٹھہر چکی تھی لیکن نکاح کے دو بولوں نے اس کی حیثیت بدل دی تھی۔ وہ گھر کی مالکن بن چکی تھی لیکن میرے، رجب اور فریدہ کے دبدبے سے وہ کچھ خاموش خاموش سی رہتی تھی۔ اس کی یہ ادا مجھے کچھ زیادہ ہی پسند آ رہی تھی۔ مجھے ایسی ہی خاموش طبع لڑکی پسند تھی۔ اس لئے اس کی رفاقت میں وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ فریدہ ایک بچے کی ماں بن گئی لیکن فردوس کی گود خالی کی خالی ہی رہی۔ مجھے پروا بھی نہیں تھی۔ میں خود بھی دعا کر رہا تھا کہ دو چار سال اس کی گود خالی رہے، تاکہ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں انجوائے کرے اور میری اور اپنے ابا کی خدمت بھی کر لے۔

اس کے والد کو بھی میں نے ڈھاکا بلا لیا تھا۔ بونو گرام ہی میں ایک اور گھر خرید لیا تھا۔ اسی میں وہ فریدہ اور ابوالبشر کے ساتھ رہتے تھے لیکن دن کا زیادہ وقت وہ فردوس کے پاس گزارتے تھے۔

ایک دن جب میں گھر لوٹا تو دیکھا وہ کچھ زیادہ ہی خوش ہیں۔ سلام کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔''

''کچھ نہیں..... یوں ہی...... فردوس سے پوچھ لینا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے باہر نکل گئے۔

''میں بتاؤں!'' فریدہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ہی وہ بات ابا کو بتائی ہے۔''

''ایسی کون سی بات ہے بھئی ذرا ہم بھی سنیں؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں، فردوس خود بتا دے گی۔ میں چلتی ہوں۔'' اس نے بچے کو گود میں اٹھایا اور باہر نکل گئی۔

ان دونوں کے پُراسرار انداز نے میرے تجسس کو بڑھا دیا تھا۔ میں سیدھا کمرے میں گھستا چلا گیا۔ فردوس سنگھار میز کے سامنے بیٹھی کنگھی کر رہی تھی۔ آئینے میں میرا عکس دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''آپ آ گئے!''

میں نے اس کے چہرے کو پڑھا، وہاں بھی سطر سطر خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔

''کیا بات ہے، آج سب کے سب بہت مسرور نظر آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چچا کا خط آیا ہے۔ انھوں نے مجھے بلایا ہے۔''



''کیا کرو گی وہاں جا کر! وہاں کی زندگی بہت مختلف ہے۔ تم نے کبھی شلوار قمیض پہنی نہیں ہے بچپن سے ساڑھی پہنتی آئی ہو اور وہاں ساڑھی تماشا بن جائے گی۔''

''میں شلوار قمیض پہنوں گی۔ آج ہی دو چار جوڑے لا دیجئے۔''

میں نے دوسرے ہی دن دس بارہ جوڑے سلوا دیے اور پی آئی اے میں سیٹ بھی ریزرو کرا لی۔ کوچ کرنے والے دن تو خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ صبح سے ہی جلدی جلدی کا شور کر رہی تھی۔ مجبور ہو کر ایک گھنٹہ پہلے ہی نکل جانا پڑا لیکن پرواز کے دوران اس کا چہرہ قابل رحم ہو گیا تھا۔ دو گھنٹے کی پرواز اس کے لئے وبال جان بن گئی تھی۔ کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد بھی اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے باہر جانے کی بجائے کیفے ٹیریا کی طرف قدم موڑ دیا۔ کافی سے شغل کرتے اس نے پوچھا۔ ''پاڑے اور کتنی دور ہے؟''

''محترمہ! اصل سفر تو اب شروع ہوا ہے۔ ڈھاکا سے کراچی پہنچنا تو آسان ہے۔ اصل مرحلہ راولپنڈی سے شروع ہوگا۔ برف پوش پہاڑوں کو بھی پھلانگنا ہوگا، پیدل بھی چلنا ہو گا۔''

''وہ تو بعد کا مسئلہ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال ذرا دائیں جانب کی تیسری نشست پر دیکھیں۔''

میں نے گردن موڑ دی۔ اس ٹیبل پر ایک نوخیز لڑکی بیٹھی تھی۔ ستواں ناک، بادامی آنکھیں جن پر کڑی کمان جیسی بھویں سایہ فگن، تپتے ہوئے فولاد کی مانند سرخ عارض، بھرے بھرے جسم پر کشیدہ کاری سے مزین قمیض، میں نے ایک پل میں اس کا بھرپور نظروں سے جائزہ لے لیا۔

''کون ہے؟'' فردوس نے پوچھا۔

''شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے لیکن یاد نہیں آ رہا ہے کہ کہاں دیکھا ہے۔''

''کیا میں بیٹھ سکتی ہوں۔'' کھنکتی ہوئی آواز سن کر میں نے فردوس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر آواز کی سمت دیکھا۔ وہی لڑکی کھڑی تھی۔

''بیٹھیے۔'' مجھ سے پہلے ہی فردوس نے اجازت دے دی۔

سر پر اجرک کو درست کرتے ہوئے وہ بیٹھ گئی اور کچھ دیر میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد بولی۔ ''اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ ضیغم عابدی ہیں۔'' گلاب کی پنکھڑیوں جیسے

نازک ہونٹ ہلے۔
"جی ہاں لیکن آپ میرا نام کیسے جانتی ہیں۔"
"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔ میرا نام زبیدہ ہے۔ علی گوٹھ والی زبیدہ۔"
"تُو زبیدہ ہے، اتنی بڑی ہوگئی؟"
"آپ بھی تو کافی بدل گئے۔ میں نے آپ کی آنکھوں اور پیشانی پر یہ جو چوٹ کا نشان ہے اس سے پہچانا۔ اگر یہ نشان نہ رہتا تو شاید میں پہچان ہی نہیں سکتی۔ خدا نظرِ بد سے بچائے کافی ہینڈسم ہو گئے ہیں۔"

"وقت کا فنکار ہاتھ بہت ہی آہستہ روی سے بہت کچھ بدل دیتا ہے۔" میں نے اس کی نیلگوں آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تمہاری قد وقامت ہی نہیں رنگ روپ بھی بدل گیا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں حیا کے ڈورے تیر گئے۔ شرگیں پلکیں کچھ اور جھک گئیں اور اس نے حیا آلود لہجے میں کہا۔ "میں کب سے آپ کا رستہ دیکھ رہی ہوں، مجھے یقین تھا آپ ضرور ملیں گے، آخر کار آپ مل ہی گئے۔" اس کے الفاظ وانداز طوفان برپا کر دینے والے تھے۔ جواب میں کچھ کہتا کہ میری نظر فردوس کے چہرے پر پڑ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ میں فوراً سنبھل گیا اور زبیدہ سے تعارف کرانے کے لئے بولا۔ "یہ تمھاری بھابی ہیں، فردوس یاسمین۔"
"بھابی!" اس نے دہرایا۔ اور چہرے پر پل بھر کے لئے تاریکی چھا گئی۔ آنکھوں میں مایوسی کے ڈورے تیرنے لگے اور گلا بھی بھر آیا تھا۔ اس نے حسرت بھری آواز میں فردوس سے کہا۔ "بھابی آپ بڑی خوش قسمت ہیں۔ خدا آپ کا سہاگ سلامت رکھے۔" اس کی آواز میں سارے جہاں کا درد سمٹ آیا تھا۔

"بابا کیسے ہیں؟" میں نے گفتگو کو نیا موڑ دینے کے لئے پوچھا۔
"بس گھڑیاں گن رہے ہیں۔ سال میں ایک بار خون بدلوا کر کچھ دن کی مہلت مانگ لیتے ہیں خدا سے۔ انھی کو چھوڑنے آئی تھی وہ امریکہ میں علاج کرا رہے ہیں۔ اگر کبھی تمھیں موقع ملے تو علی گوٹھ آ جانا، حویلی کا دروازہ انتظار میں کھلا رہے گا۔" یہ کہتے کہتے اس کے آنسو چھلک پڑے۔ شاید جذبات نے ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ آنسو پونچھتی ہوئے کھڑی ہوگئی۔
"میں چلتی ہوں۔" کہتے ہوئے کیفے ٹیریا سے باہر نکل گئی اس کے جاتے ہی فردوس پھٹ پڑی۔



"شکر ہے خدا کا، شرم حیا تو چھو کر بھی نہیں گئی ہے۔ کس بے حیائی سے کہہ رہی تھی۔"
"میں انتظار کروں گی۔" فردوس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔ اتنی خاموش طبع سیدھی سادی لڑکی ایسی بدمزاج بن جائے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز مطلق پسند نہیں آیا تھا۔ اس لئے میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔
"چلو چلتے ہیں۔"
"کہاں؟" اس نے بے خیالی سے کہا۔
"آگے بھی چلنا ہے یا نہیں۔"
"چلیے" کہتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔
لاہور کی پرواز تیار تھی۔ فوکر میں بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد ہوا کے دوش پر بلند ہو گئے۔ لاہور سے راولپنڈی اور وہاں سے پاراچنار پہنچے۔ اس وقت وہ فقط ایک قصبہ تھا۔ کسی ہوٹل کا نام ونشان تک نہیں تھا اور فردوس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اس لئے میں اسے نوشے بھائی کی بہن اُم البنین کے گھر لے کر پہنچ گیا۔ ام البنین پیواڑ میں بیاہی تھی لیکن اس کا شوہر تجارت کی وجہ سے پاراچنار میں ہی گھر لے کر رہتا تھا۔ اس کے گھر پر ایک روز ٹھہرا اور دوسرے روز چل پڑا۔
جس دن ہم لوگ پاڑے پہنچے، بچوں کی عید ہوگئی۔ سب نے فردوس کو گھیر لیا تھا۔ نہ وہ بچوں کی باتیں سمجھ رہی تھی اور نہ بچے اس کی باتیں، پھر بھی وہ اس سے چمٹے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ فردوس کی گود میں بیٹھے۔ اس آپا دھاپی میں بڑے چچا کی چار سالہ بیٹی زینب نیچے لڑھک گئی۔ اسے گرتے دیکھ کر فردوس نے گود میں اٹھا لیا۔ اس کا رونا تو بند ہو گیا لیکن علی شیر چچا کے پانچ سالہ بیٹے جیت نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ پشتو میں چیخ چیخ کر زینب کو نیچے اتارنے کا کہہ رہا تھا اور میں بیٹھا اس دلچسپ منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ گل کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے فردوس سے کہا۔ "بھابی کچھ دیر کے لئے جیت کو گود میں بٹھا لیں۔" اس کی بات فردوس کے پلے نہیں پری۔ اس نے پھر جملہ دہرایا۔ فردوس ٹک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ یکا یک گل کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ چڑھ دوڑی۔ "بے چاری بھابی جیت کی بات سمجھ نہیں رہی ہیں لیکن آپ تو سمجھ رہے ہیں ترجمہ کیوں نہیں کرتے؟"
"اس نے کہا تھا مجھے پاڑے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اب خود بھگتے، میں کوئی مدد نہیں کرتا۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔

''آپ بھابی کو ستا رہے ہیں۔ اللہ کرے بھابی آپ سے روٹھ جائیں۔''

''آمین۔'' میں نے اسی کے انداز میں کہا۔'' کچھ دن کے لئے میری جان چھوٹ جائے گی۔''

''آپ اتنی پیاری بھابی کا دل دکھا رہے ہیں؟'' گل نے کہا۔

''بہت اچھا کر رہے ہیں۔'' افروز نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہارے منہ میں خاک۔'' گل نے جل کر کہا۔

''بھابی آپ نے سنا یہ گل کی بچی آپ کو بددعا دے رہی ہے۔'' افروز نے پینترا بدلا۔

''نہیں بھابی یہ جھوٹ ہے۔ میں نے آپ کو نہیں، افروز کو کہا ہے۔'' گل نے ایسے گھبرا کر کہا جیسے واقعی فردوس نے افروز کی بات سمجھ لی ہو۔

''نہیں بھابی، اس نے آپ کو کہا ہے۔'' افروز نے پھر چڑھایا۔

''یا اللہ میں کیا کروں۔'' گل نے بے بسی سے کہا۔

''تو پاگل ہو جا۔''

''تُو خود پاگل ہو جا۔''

ان دونوں کی چھیڑ چھاڑ نے میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ لا دی تھی اور فردوس کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ان کے انداز پر مسکرانے لگی۔

''بچو، تم سب دل بھر کر اپنی بھابی سے لڑو میں چلا'' یہ کہتے ہوئے میں نے کمرے سے باہر قدم نکال دیے۔

''کس کی ہمت ہے کہ بھابی سے لڑے۔'' گل نے اونچی آواز میں کہا، لیکن میں رکا نہیں کیوں کہ مجھے معلوم تھا افروز نے جواب دے دیا ہوگا۔ وہاں سے نکل کر چچا کے کمرے میں آیا۔ وہ حقے کی نَے منہ سے لگائے کچھ لکھ رہے تھے آہٹ پا کر انھوں نے سر اٹھا دیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولے۔''بچوں سے چھٹی مل گئی۔''

''اس بار انھوں نے مجھے منہ نہیں لگایا سب اپنی بھابی کو گھیرے ہیں۔''

''یہ بھی اچھا ہے۔ زبان کی اجنبیت اس پر گراں نہیں گزرے گی۔'' انھوں نے کہا۔

''جی ہاں، بچوں نے زبان کی قید سے آزاد کر رکھا ہے۔''

''زبان تو فقط اظہار کا ذریعہ ہے، رشتہ نہیں۔ رشتہ دل سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے



ل کی بولی، سب پر فوقیت رکھتی ہے۔'' چچا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں، میری زندگی اس کا ثبوت ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''چھوڑو ان باتوں کو۔ ڈھاکے کی سناؤ۔ فریدہ کیسی ہے؟'' کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے کہا۔

''چچا جان میں کل واپس جا رہا ہوں۔''

''اتنی جلدی؟''

''بشیر بھائی اکیلے دکان سنبھال نہیں پائیں گے اس لئے لوٹنا چاہتا ہوں۔''

''جیسی تمھاری مرضی۔''

میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ چچی نے آ کر کہا۔'' جاؤ کھانا کھا لو دسترخوان پر تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔''

کھانا کھا کر کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد فردوس بھی آ گئی۔

''میں صبح جا رہا ہوں۔ فریدہ کو خط دینا ہے تو لکھ لو۔''

''اب میں اسی وقت خط لکھوں گی جب اردو آ جائے گی۔''

''یعنی جلدی لوٹنے کا ارادہ نہیں ہے۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''اس کا جواب فریدہ باجی دے دیں گی۔''

''تم کیوں نہیں دو گی۔''

''بس یوں ہی۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ ڈھک لیا۔

''او، یہ بات ہے۔'' اس کے ہاتھوں کے نقاب کو سرکا کر چہرے کو روبرو کرتے ہوئے کہا۔''لیکن کب تک؟''

اس نے میرے وجود میں جلترنگ بجا دیا۔ خوشی کی میٹھی میٹھی چبھن رگوں میں دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

''بن موسم بہار نہیں، بن ساون برسات نہیں۔ مرادوں کی کلی کھلنے کا بھی ایک موسم ہوتا ہے اور وہ موسم آئے گا پورے چھ ماہ بعد۔''

"اتنا انتظار کراؤ گی۔"

جواب میں چوڑیاں کھنک اٹھیں اور میں صبر و بے صبری کے رموز بھول گیا۔ دل کی زبان جب بولنے پر آتی ہے تو صرف حواس بڑھ بڑھ کر بولتے ہیں اور جذبوں کی سماعت سے سنتے ہیں۔

جذبوں کی سماعت، احساسات کے ذہن سے مجھے آنے والے کل کی لوری سناتی رہی اور میں سپنوں کے ہنڈولے میں جھولتا رہا۔ اس وقت تک جب تک نیند کی دیوی نے مجھے اپنی بانہوں میں نہ لے لیا۔

صبح اٹھتے ہی میں نے تیاری شروع کر دی اور سورج اگنے کے ساتھ میرا سفر شروع ہو گیا۔

پاڑے سے پاراچنار تک گھوڑے پر آیا اور پھر وہاں سے بس کے ذریعہ راولپنڈی، راولپنڈی سے ریل میں بیٹھ کر کراچی پہنچا۔ اتفاق سے اسی دن کی فلائٹ میں سیٹ مل گئی اور میں ڈھاکا پہنچ گیا۔

☆======☆=====☆



دوسرے دن جب دکان جانے کے لئے گھر سے نکلا تو ٹھٹھیری بازار میں مجمع لگا دیکھ کر رک گیا۔ اور پھر بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ کئی نوجوان ایک نئی دکان کا سامان نکال نکال کر باہر پھینک رہے تھے اور دکاندار گڑگڑا کر انھیں روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے بھائی دکان کیوں اجاڑ رہے ہو؟"

"یہ سالا بنگالی ہماری روزی پر لات مارنے آیا ہے۔ ہمارے ایریا میں دکان کھول کر بیٹھنا چاہتا ہے"۔ ایک نوجوان نے مڑ کر جواب دیا۔

"کیوں، یہ زمین تمھاری ہے جو اسے روک رہے ہو؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"اگر اسے بھگایا نہیں جائے گا تو پھر ایک کے بعد ایک بنگالی بھر جائیں گے اور ہم بہاریوں کی روزی روٹی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"قرآن کہتا ہے واللہ خیر الرازقین یعنی خدا ہی بہتر رزق دینے والا ہے پھر بنگالی، بہاری کی بات کہاں سے آ گئی۔"

"آپ سمجھے نہیں ہیں۔ یہ بنگالی اس قابل نہیں ہیں کہ ہم انھیں اپنے درمیان ھیں۔ یہ سب میر جعفر کی اولاد ہیں۔ غداری ان کے خون میں شامل ہے۔"

"اگر میر جعفر نے اپنے بہنوئی سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تھا تو ی کی اولادوں میں میر قاسم بھی تھا جس نے انگریزوں سے لوہا منوایا تھا۔ سب سے بڑی بات ہے کہ بنگالی ہمارے دینی بھائی ہیں۔ یاد رکھو مشرق سے مغرب تک اس ملک میں نہ کوئی نجابی ہے نہ پٹھان نہ بلوچی ہے نہ سندھی، نہ بنگالی اور نہ بہاری ہم سب صرف کستانی ہیں۔ مملکت خداداد کے محافظ، اگر آپ سچے پاکستانی ہیں تو نفاق پر روک لگائیں ورنہ چھوٹی چھوٹی باتیں کل سم قاتل بن کر ابھریں گی۔"

"خان بھائی صحیح کہتے ہیں۔" بھیڑ میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"وہ دلال ہے بنگالی کا۔" اسی نوجوان نے کہا۔

"خان بھائی کو گالی دیتا ہے۔" بھیڑ میں سے ایک نوجوان نکل کر بولنے والے پر پل پڑا۔

"مارو سالے کو مارو، ہم پاکستانیوں کے درمیان زہر کی کھیتی کر رہا ہے۔" کئی جوشیلے نوجوان دکان اجاڑنے والوں سے الجھ گئے۔ وہ سب ان چاروں سے اس طرح چمٹ گئے تھے جیسے گڑ سے چیونٹے۔ اتنے سارے لوگوں سے نپٹنا آسان نہیں تھا اس لئے انھیں بھاگنا پڑا۔ میرے مشورے پر بنگالی دکاندار کے لئے چندہ کیا گیا تا کہ اس کے نقصان کی تلافی ہو جائے۔ اسے سیٹ کرنے کے بعد میں اپنی دکان پر پہنچا اور ابوالبشر سے کہا۔ "یار آج میرا موڈ نہیں ہے تم ہی دکان سنبھالو۔" اور بنگشال کی طرف چل پڑا۔

بنگشال میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ اسے میں نے خادم غنڈے سے بچایا تھا۔ اس وجہ سے وہ میری بہت عزت کرتا تھا۔ اشرف کے اطوار صحیح نہیں تھے پھر بھی میں نے اسے دوست کا درجہ دے رکھا تھا کیوں کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا، ماں باپ بچپن میں مر گئے تھے۔ فٹ پاتھ نے اسے ماں کی گود بن کر پالا تھا۔ اس کے خون میں شرافت تو تھی لیکن فٹ پاتھ کا اثر بھی آ گیا تھا۔ میری دوستی اس سے تھی، اس کے فعل سے نہیں، اس لئے میں کبھی کبھی اس سے ملنے پہنچ جاتا تھا۔ اس دن بھی موڈ فریش کرنے جا رہا تھا کہ نشاط سینما کے سامنے دکان اجاڑنے والوں نے گھیر لیا۔ وہ چار تھے اور میں اکیلا۔ ان میں سے ایک نے پستول نچاتے ہوئے کہا۔

"سور! اب تمھیں کون بچائے گا؟"

"گیدڑ، شیر سے ایسا سوال نہیں کرتے۔" کہتے ہوئے میں الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ فوجی پستول اس کے پاس کیسے آ گیا لیکن زیادہ غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ اس کے تیور خطرناک تھے اور میں خالی ہاتھ تھا۔ پھر بھی اپنے آپ کو پُر سکون رکھتے ہوئے سر پر بندھے صافے کو میں نے جھٹکا دیا۔ وہ کھل کر ہاتھ میں آ گیا۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے میں نے دونوں سرے ملا کر داہنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

وہ چاروں مجھے پیچھے ہٹتے دیکھ کر شیر ہو رہے تھے اور آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ میں نے اپنے حواس کو بیدار رکھتے ہوئے اپنی دو انچ کی ایڑی والی پشاوری چپل کو اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔

"کیوں بے گیدڑ کی اولاد، چپل اتار کر بھاگے گا۔" ایک نے طنز کیا لیکن میں نے توجہ نہیں دی اور چپل کو صافے کے سرے پر باندھنے لگا۔ "چپل سے بڑی محبت ہے۔" اس نے



پھر طنز کیا۔

میں انھیں کیسے بتاتا کہ ان کے مقابلے کی تیاری کر رہا ہوں۔ چپل اور صافے کی مدد سے میں مدارالمہام بنا رہا تھا جو ان کے مزاج ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ وہ ہتھیار طمنچے جیسا خطرناک تو نہیں تھا لیکن نہ سے ہاں تھا۔ ان کے طمنچے والے ہاتھوں کو توڑ بھی سکتا تھا۔

وہ چاروں آہستہ آہستہ نزدیک آتے جا رہے تھے کہ میں نے دل ہی دل میں نادِ علی کا ورد کیا اور المدد یا اللہ کا نعرہ لگا کر صافہ کے سرے کو پکڑ کر گردش دینے لگا۔ دوسرے سرے پر بھاری چپل بندھی تھی اس لئے وہ بجلی کے پنکھے کی طرح گردش کرنے لگا۔ اپنے انوکھے ہتھیار کو میں بنوٹ کے طرز پر گردش دے رہا تھا۔

عسکری ماہرین کا کہنا ہے کہ دشمن پر حملے میں پہل کرو گے تو اس کے پیر اکھڑ جائیں گے۔ اسی قول پر عمل کرتے ہوئے میں نے مدارالمہام کا وار اس پر کر دیا۔ گردش کرتا ہوا صافہ اس کے ہاتھ پر لپٹ گیا۔ فوراً میں نے تیز جھٹکا دیا۔ اس کے ہاتھ سے طمنچہ نکل گیا۔ میں نے مدارالمہام کو دوبارہ گردش دی اور دوسرا حملہ کر دیا۔ بھاری چپل ایک کے سر سے ٹکرائی اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے خون سے سنے ہوئے چپل کو دوبارہ گردش دی اور دوسرے پر حملہ کر دیا۔

اپنی جان ہر انسان کو پیاری ہوتی ہے۔ ہمیں ٹکراتے دیکھ کر علاقہ سنسان ہو گیا تھا۔ دکانوں میں تالے لگ گئے تھے، لوگ اپنی اپنی جان لے کر بھاگ رہے تھے لیکن وہ چاروں ڈٹے ہوئے تھے۔ شاید انھیں اپنی افرادی قوت پر ناز تھا۔

دوسرے آدمی کے سر سے میرا انوکھا ہتھیار ٹکراتے ہی وہ بھی زمین بوس ہو گیا۔ اب میرے سامنے صرف دو باقی رہ گئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔ وہ پینترا بدل بدل کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میرا چپل ان کی راہ میں حائل تھا۔ دو کے سر کی مزاج پُرسی کرنے والا چپل تیسرے کے سر سے ٹکرایا تھا کہ میرے سر کی گدی سے نیلے پیلے سورج طلوع ہونے لگے۔ کسی نے کوئی بھاری چیز پیچھے سے دے ماری تھی اور میں گرتا چلا گیا تھا۔ پتا نہیں کب تک میں بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں بند پایا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اگر ہاتھ آزاد ہوتے تو کھڑکی کھول کر ضرور دیکھتا کہ سلاخیں لگی ہیں یا نہیں لیکن مجھے زیادہ دیر دماغ سوزی نہیں کرنی پڑی۔ کسی نے باہر سے کھڑکی کھولی تھی۔ میں نے اسے دیکھنے کے لئے سر گھما دیا۔

''او، تو تمھیں ہوش آ گیا۔'' کہتے ہوئے اس نے کھڑکی پھر بند کر دی۔ کھڑکی کا پلڑا بھرا ہوا تھا لیکن کس کام کا؟ موٹی موٹی سلاخیں میں نے دیکھ لی تھیں جو راہ میں حائل تھیں۔ فرار ہونے کا بس ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا دروازہ، میں نے دروازے کی سمت کھسکنا شروع کر دیا۔ پیروں میں پڑا پھندا سخت اذیت پہنچا رہا تھا۔ کیونکہ پیروں کو باندھ کر پشت پر بندھے ہاتھوں کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا اس لئے میں زمین پر اپاہجوں کی طرح گھسٹ رہا تھا۔ انچ انچ سرکتا ہوا میں دروازے کے نزدیک پہنچا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ اپنے پلان کی تکمیل کے لئے میں نے دروازے پر نظر آنے والے پیروں پر پوری قوت سے سر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر میرے اوپر گرا اور میں نے اپنے جسم کو لڑھکاتے ہوئے دروازے سے باہر لے جانے کی کوشش کی لیکن اس کے پیچھے آنے والے نے میرے سر پر زوردار ٹھوکر ماری۔ جوتے کی نوک میری پیشانی پر پڑی تھی اور میرا سر جھنجھنا اٹھا تھا، تب تک گرنے والے شخص نے سرعت سے اٹھ کر مجھے پھر کمرے میں کھینچ لیا۔ میں نے بے بسی سے سر گھما کر دیکھا، وہی چاروں میرے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ ایک نے میری پسلی میں ٹھوکر مار کر کہا۔ ''بہت جان ہے خان لیکن کس کام کی۔ کچھ ہی دیر میں تیرا یہ جسم بیکار ہو جائے گا۔'' کچھ توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ ''تُو نے میرا سر پھوڑا ہے نا لیکن میں تیرا سر انہیں پھوڑوں گا۔ پہلے پیروں کی دسوں انگلیاں تراشوں گا پھر ہر گھنٹے بعد ایک ایک عضو کاٹوں گا۔ یہ گھر تیرے ہی جیسوں کے لئے خریدا گیا ہے تاکہ ان کی چیخ کوئی سن نہ سکے پھر ایسے وقت میں ہم پوری آواز سے ریڈیو بھی بجاتے ہیں تاکہ مرنے والا گانا سن کر مرے۔ تو بتا دے کون سا اسٹیشن لگاؤں۔ وودید بھارتی یا ڈھاکا؟''

''کیا حال ہے خان؟'' ایک نئی آواز سنائی دی میں نے سر موڑ کر دیکھا۔

''آپ؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں میں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تو یہ آپ کے پالتو غنڈے ہیں مسٹر کنائی سنیال۔''

''یہ غنڈے نہیں مجاہدین ہیں۔ اپنے وطن کو تم جیسے کتوں سے آزاد کرانے کے لئے جہاد کر رہے ہیں یہ۔''

''سنو کنائی سنیال! تم ایک بڑے کالج کے پروفیسر ہو۔ تمھیں غنڈہ گردی زیب نہیں دیتی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں نہیں خان ہمیں غنڈہ مت کہو ہم سب مجاہدین ہیں۔ یہ نور الاسلام ہے،



بی۔ اے کا طالب علم اس کے ماں باپ کو قتل کر دیا گیا کیوں کہ وہ ہندو تھے اور اسے زبردستی مسلمان بنا دیا گیا۔ یہ ایمان علی ہے اس کی کہانی بھی وہی ہے اور یہ سنتوش چکرورتی ہے اور یہ اجیت پال۔ سب کے سب کالج کے طالب علم ہیں۔''

''واہ بہت خوب اپنے شاگردوں کو اچھی تعلیم دے رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''مجھے فخر ہے کہ مجھے ایسے شاگرد ملے جو اپنا حق چھین لینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ دھوکا دینے والوں سے ٹکرانے کی ہمت رکھتے ہیں۔''

''دھوکا کس نے دیا۔ کیا میں نے؟ جو مجھے قید کرایا گیا ہے۔''

''ہاں، تم نے اور تمھارے ساتھیوں نے، تمھارے اجداد نے۔ تمھارے قائداعظم نے۔ 1947ء میں ہم دھوکا کھا گئے تھے۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ وہ منحنی سا کینسر کا مریض ہم سے بازی لے جائے گا۔ اپنا قول پورا کر دے گا۔ ہمارا ملک ہم سے چھین لے گا۔ پاکستان بنا لے گا اسی لئے ہم نے بیس سال کی جدوجہد کے بعد اپنی چھوٹی سی تنظیم بنالی جو چھوٹی ہے لیکن طاقت میں سپر پاور ہے۔ ہم نے مراٹھوں کے انداز میں جنگ شروع کر دی ہے۔''

''بزدل لٹیرے وہ بھی تھے اور تم بھی ہو۔ ہمارے اجداد نے جس طرح ان کے سروں کو کچل دیا تھا ویسے ہی ہم سب اتحاد کے ہتھوڑے سے تمھارے ارادوں کو کچل دیں گے۔''

''اتحاد! ہاہاہا سی اتحاد کا تو ہم سر کچل رہے ہیں۔ ذرا گاؤں دیہات میں جا کر دیکھو ہمارے آدمی پندرہ ایم ایم کے پروجیکٹر پر ہندو دیو مالائی فلمیں چلا کر دکھا رہے ہیں تاکہ ان کا ذہن مسحور ہو جائے، ان کے دل ہندوؤں کی محبت سے معمور ہو جائیں۔ بازاروں میں نکل کر دیکھو کلکتہ کی کتابوں سے دکانیں بھری پڑی ہیں۔ ان کتابوں میں کہانیاں بھی ہوتی ہیں اور پاکستان کے خلاف نعرے بھی جو آہستہ آہستہ ذہنوں میں بیٹھ جائیں گے۔''

''جب تک ہمارے دلوں میں ایمان ہے تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ خیبر سے چٹا گانگ تک ہر پاکستانی کا دل ایک تال پر دھڑکتا ہے۔''

''اور اب میرا تال دیکھو۔ نورو! ذرا اپنا کمال تو دکھاؤ۔'' اس بدذات کا حکم پاتے ہی نور الاسلام نے جو درحقیقت لعنت اسلام تھا، ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

''سنتوش، تم تو فٹ بال کے اچھے کھلاڑی ہو۔ پریکٹس کرو نا۔'' اس نے دوسرے کو حکم دیا۔

میں ان دونوں کے درمیان فٹ بال بن گیا تھا۔ دونوں تواتر سے ٹھوکریں مار رہے
تھے۔ میرا جسم کچھ ہی دیر میں پکا ہوا پھوڑا بن گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اذیت دے دے کر مجھے
ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔ موت دبے قدموں بڑھتی آرہی تھی۔ میں زندگی سے مایوس ہو گیا تھا کہ
قدرت کو مجھ پر رحم آگیا۔ درد سے نجات کے لئے خدا نے میرے ذہن میں تاریکی پھیلا دی
تھی۔

انجانے میں ہر شخص سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے، مجھ سے بھی ہوا ہوگا۔ اس کا خمیازہ
بھی بھگت لیا تھا۔ ذہن پر چھائی دھند نے مجھے بتا دیا تھا کہ ایمان کے امتحان کا ایک پرچہ دے
چکا ہوں۔ دوسرے پرچے کے لئے مجھے پانی کے چھینٹے مار کر ہوش میں لایا گیا۔

ہوش میں آتے ہی دیکھا کہ میرے ہاتھ پاؤں کی بندش کھل گئی ہے لیکن جب
داہنے ہاتھ کو ہلانے کی کوشش کی تو حلق سے کراہ نکل گئی۔ شاید ہڈی پر ضرب لگی تھی۔ بازو سوج
کر کپا ہو گیا تھا۔

میری کراہ سن کر پوچھا گیا۔ ''ہوش ٹھکانے آئے یا نہیں؟'' آواز میں طنز کا عنصر
نمایاں تھا اور وہ آواز بھی میری جانی پہچانی تھی۔ اس لئے میں نے جھٹکے سے کروٹ بدل لی۔
کروٹ لیتے ہی درد کی تیز لہر پسلیوں سے اٹھی اور میرے چہرے پر کرب کی جھلکیاں ابھر
آئیں۔

''کیوں، کچھ اور خاطر داری کی جائے؟'' وہی آواز دوبارہ سنائی دی میں نے بند
ہوتی آنکھوں کو پھر کھولا اور اس عیار و مکار شخص کی طرف نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''یہ مت بھولو کہ ہر فرعون را موسیٰ است۔''

''فارسی کے تابوت میں انگریزوں نے 1844ء میں ہی کیل ٹھونک دی تھی تا کہ تم
مسلمانوں کو سرکاری نوکری سے دور رکھا جا سکے، اس لئے میں نے بھی نہیں سیکھی اور تم بھی مت
بولو'' اس نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ تیل بیچنا پڑے گا۔ بھوک پیاس اور
مار سہو گے یا۔۔۔''

''ہر دکھ سے نجات کا آخری راستہ ہے موت اور وطن کی راہ میں ملنے والی موت،
شہادت کہلاتی ہے۔'' میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''اچھا، میں تو چلا۔ آج دن بھر کے لئے مٹکے میں پانی ہے، گزارا کر لینا، تین چار
دن بعد آؤں گا پھر باتیں ہوں گی۔'' کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا اس کے ساتھی بھی چلے گئے اور



دروازہ بند ہو گیا۔

ان کے جاتے ہی کمرے میں چھایا سکوت ہیبت ناک محسوس ہونے لگا۔ سوائے
آوازِ تنفس کے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ سکوت اتنا گھمبیر ہو گیا تھا کہ مجھے خلجان ہونے
لگا۔ اضطراب کے عالم میں، میں چارپائی سے نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ نقاہت پیروں میں لغزش
بھرے دے رہی تھی پھر بھی میں نے ٹہلنے کے انداز میں دروازے کی جانب قدم بڑھا دیا۔
دروازہ شیشم کی لکڑی کا تھا جسے توڑنا میرے بس سے باہر تھا۔ لاچار ہو کر میں نے دروازے کی
سمیت پیٹھ کر لی اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اتنی دیر سے دماغ پر دھند چھائی ہوئی تھی اس لئے
روشنی پر غور نہیں کر پایا تھا۔ کمرے کی چھت سے بلب لٹک رہا تھا، اسی نے اندھیرے کو دور بھگایا
تھا۔

''پتا نہیں باہر دن ہے یا رات۔'' میرے دماغ نے سرگوشی کی اور میری نگاہیں خود
بخود کھڑکی کی جانب اٹھ گئیں۔ مخالف سمت کی دیوار میں کھڑکی تو تھی لیکن بند تھی۔ لنگڑاتا ہوا
میں اس کے نزدیک پہنچا اور اسے کھول دیا۔ دوسری جانب اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے غصے
میں کھڑکی کے پلے کو جھٹکا دیا تو وہ ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ تو پہلے سے ہی ٹوٹا
ہوا تھا جسے لوہے کے پتلے تاروں سے باندھا گیا تھا۔ میں نے بے خیالی میں تار کا سرا پکڑ کر جھٹکا
دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ تقریباً ڈھائی تین گز کا وہ تار میرے ہاتھ میں تھا اور میری آنکھیں کمرے کا
جائزہ لے رہی تھیں۔ کمرے میں ایک جانب مٹی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ جس پر ہندو گھروں میں
استعمال ہونے والا پیتل کا گلاس تھا۔ ایک کونے میں چارپائی تھی جس پر کچھ دیر پہلے میں لیٹا ہوا
تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ دیوار میں ایک طاق بنا ہوا تھا لیکن وہ بھی خالی تھا۔ طاق
سے چھ سات فٹ اوپر ایک بڑا سا روشندان تھا لیکن اس میں بھی لکڑی کے فریم میں جڑا رنگین
شیشہ لگا ہوا تھا۔ اتنی اونچائی تک پہنچنا بھی ناممکن تھا۔ میں پھر جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کھلی ہوئی
کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا اندر آرہی تھی لیکن باہر کا منظر تاریک تھا۔ کھڑکی کھلنے کے بعد مجھے پتا چلا
کہ رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ سارا عالم نیند کی بانہوں میں کھویا ہوا تھا۔ یہ وقت موافق تھا۔
تاریکی کا فائدہ اٹھا کر فرار ہونا آسان تھا لیکن یہ تب ممکن تھا جب دروازہ کھلتا۔ یکایک میرے
ذہن کے دریچے کھلنے لگے اور میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔

جھٹکے سے اٹھنے کی وجہ سے میرے سوجے ہوئے بازو میں درد کی تیز لہر اٹھی اور
ہونٹوں سے کراہ پھسل پڑی۔ میں نے درد کے احساس کو دبانے کے لئے ہونٹوں کو دانتوں تلے

دبالیا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کھڑکی تک پہنچا۔ اندھیرے کی چادر میں لپٹی عمارتوں پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے سلاخوں پر لپٹے ہوئے تار کو کھولنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ کھڑکی کا پلا الگ ہوگیا اور تار کھل گیا۔ تار کے ایک سرے پر میں نے پیتل کا گلاس باندھا اور دوسرا سرا قلم کی نب کے سوراخ میں ڈال کر اینٹھ دیا۔ قلم کو مسکراتی نگاہوں سے گھورتے ہوئے میں نے چوم لیا۔ وہی میرا نجات دہندہ بننے والا تھا۔ گلاس کو دروازے کے داہنی جانب رکھنے کے بعد تار کو سیدھا کرتا ہوا میں سوئچ بورڈ تک آیا اور قلم کو پلگ میں لگا کر سوئچ آن کردیا۔ ڈی سی کرنٹ کی تھرتھراہٹ زمین سے ہوتی ہوئی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ فوراً ہی میں چارپائی پر چڑھ گیا اور تکیہ اٹھا کر پوری قوت سے مٹکے پر دے مارا۔ مٹکا الٹ گیا اور پانی فرش پر پھیل گیا۔ پھیلتے ہوئے پانی پر نظریں جماتے ہوئے میں نے چیخنا شروع کردیا۔

مجھے یقین تھا کہ پہرے پر کوئی ضرور ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں میرا اندازہ درست ثابت ہوگیا اور باہر سے گالیوں کا طوفان امڈ پڑا۔ گالیاں بکنے والے نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ غصے نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا اس لئے اسے باریک تار نظر نہیں آیا اور وہ الجھ کر گر پڑا۔ زمین پر پھیلے ہوئے پانی میں دوڑتے ڈی سی کرنٹ نے اس سے مزاج پوچھنا شروع کردیا۔ اس کا جسم وقفے وقفے سے فٹ بال کی طرح اچھل رہا تھا اور حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے منہ سے کف جاری ہوگیا اور وہ ساکت ہوگیا۔ اس کی چیخوں کی گونج باہر تک ضرور گئی ہوگی پھر بھی کوئی نہیں آیا تو میں مطمئن ہوگیا کہ عمارت میں وہ اکیلا تھا۔ آزادی کی راہ کھلی ہوئی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں چارپائی پر کھڑا ہوگیا۔ کھڑے ہونے کے بعد چارپائی سے دروازے کی دوری کا اندازہ لگایا اور جسم کو کڑا کرکے میں نے چھلانگ لگادی۔ لیکن یہ زقند مجھے کافی مہنگی پڑی میرا سر دروازے کے باہر والی دیوار سے ٹکرایا تھا اور زمین کی چوٹ نے شانے میں درد کی ہزاروں سوئیاں سی چبھودی تھیں۔ دونوں جگہ سے اٹھنے والے درد نے ذہن کو اندھیرے کے سمندر میں ڈبودیا تھا۔ ہوش آیا تو اپنے آپ کو گلیارے میں پڑا دیکھا۔ پو پھٹ رہی تھی، مشرقی افق پر سپیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ کسی وقت بھی کوئی پہنچ سکتا تھا یہ سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ درد کی تیز لہر اٹھی اور گھٹی گھٹی کراہ نکل گئی۔ ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے ہوئے میں نے کمرے میں نظر ڈالی۔ پہرے دار گیلی زمین پر ساکت پڑا تھا۔ اس کی جانب سے نظریں پھیر کر میں نے باہر کی سمت قدم بڑھا دیئے۔ کمپاؤنڈ پار کرکے سڑک پر نکلتے ہی میں نے علاقے کو پہچان لیا۔ دہلی کا لینکن اسٹریٹ تھا وہ۔



سڑک سنسان پڑی تھی۔ کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لئے تیز قدموں سے چل پڑا۔ بمشکل ایک فرلانگ آگے بڑھا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک کار نظر آئی اسے راستہ دینے کے لئے میں فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔ وہ کار برابر سے گزرتی ہوئی آگے بڑھ گئی اور میں پھر آگے چل پڑا لیکن تیز بریک کی آواز نے مجھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کردیا۔ وہ کار رک رہی تھی۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا سگنل دیا اور میں دوڑ پڑا۔ کار بھی تعاقب میں دوڑی۔ انسان کی اور کار کی رفتار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ دم بدم نزدیک آتی جارہی تھی مجھے بھاگتے دیکھ کر انجن کا شور تیز ہوگیا تھا۔ وہ میرے سر پر پہنچنے ہی والی تھی کہ مجھے ایک بنگلے کا کھلا ہوا گیٹ نظر آگیا اور میں نے گیٹ میں چھلانگ لگادی۔ عین اسی وقت پیچھے سے فائر ہوا، اگر خوش قسمتی سے میرا پیر پھسل نہ جاتا تو بائیں شانے کی جلد ادھیڑنے والی سائیلینسر لگے پستول کی گولی دل ہی میں اتری ہوتی۔ میں ہلکی سی چیخ مار کر نیچے گرا اور پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا گیٹ پار کر گیا۔ اس وقت تک کار بالکل قریب آچکی تھی۔ گیٹ سے چند گز دور حملہ آوروں نے پوری قوت سے بریک لگائی تھی۔ سڑک پر کار کے ٹائر بری طرح چیخ اٹھے تھے اور کار لہراتی ہوئی فٹ پاتھ کے کنارے آلگی تھی۔

کار رکتے ہی ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سے پروفیسر کنائی سنیال کود کر نیچے اترا تھا، اس کے داہنے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی نال گیٹ کی جانب اٹھی ہوئی تھی اور وہ خود بھی اسی طرف آرہا تھا۔

میرے بدن کے سارے مساموں کے دہانے کھل چکے تھے۔ احاطے کی دیوار کے سہارے زیادہ دیر اس بدبخت سے بچ نہیں سکتا تھا۔ بچنے کا بس ایک ہی راستہ تھا اندر کی جانب دوڑ لگادینا، اور میں نے وہ اندھا قدم اٹھالیا۔ میں پوری قوت سے دوڑتا ہوا بنگلے کے عقب میں پہنچا تھا کہ پیچھے سے چور چور کا شور ابھرا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ حالات نے یکایک نیا موڑ لے لیا تھا۔ آس پاس کی کھڑکیاں کھلنے لگی تھیں۔ کسی بھی وقت مجھ پر کسی کی بھی نگاہ پڑ سکتی تھی۔

عقبی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن سپیدہ سحر کی وجہ سے دیکھ لیا جانا یقینی تھا پھر بھی میں نے رسک لے لیا اور اس پر چڑھ گیا۔ دوسری جانب گندی گلی تھی۔ میں نے گلی میں اترنا مناسب نہیں سمجھا اور نیچے اتر آیا کیوں کہ گلی کے دونوں جانب لوہے کے گیٹ لگے نظر آگئے تھے۔ وہ گلی چوہے دان بن سکتی تھی اسی لئے اس کا خیال ذہن سے جھٹک کر [illegible]

بنگلے کی دیوار کی سمت دوڑ لگا دی۔ وہ دیوار کچھ اونچی تھی لیکن جا بجا اینٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ان کے سہارے میں چڑھتا چلا گیا اور اوپر پہنچتے ہی دوسری جانب لٹک گیا۔ زمین پر پیر رکھ بھی نہ پایا تھا کہ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اندر سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی تھی۔ آواز بتا رہی تھی کہ کتا کسی خوفناک نسل کا ہے۔ وہ بڑے جوش وخروش سے بھونکے جا رہا تھا۔ میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ داہنا بازو درد سے ٹوٹ رہا تھا، دوبارہ اوپر اٹھنا ناممکن تھا اور نیچے اترنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اذیت ناک موت کی بھیانک پرچھائیاں آنکھوں کے سامنے رقصاں تھیں کہ کسی نے پشت پر تھپکی دی۔ تھپکی کا احساس مجھے کوڑے کے ضرب جیسا لگا اور میں دہم سے نیچے گر پڑا۔

"کون ہو تم؟" سریلی آواز میں کسی نے پوچھا۔

میں نے چونک کر سر اٹھا دیا۔ دور ایک پیڑ سے کتا بندھا اچھل رہا تھا۔

"بتایا نہیں، کون ہو تم؟" آواز پھر ابھری۔

میں نے آواز کی سمت گردن موڑ دی۔ میرے سامنے خمار آلود چہرے والی ایک دوشیزہ کھڑی تھی۔ دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دم توڑ چکی تھی اور جب دماغ کام نہ کرے تو ایسی ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ میں نے بھی بلا سوچے سمجھے گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی تھی اور ایک ہی جست میں گیٹ کو پھلانگنے کی غلطی کر بیٹھا تھا۔ تھکن سے چُور زخمی جسم کہاں تک ساتھ دیتا، گیٹ سے ٹکرا کر میں فرش پر گر پڑا۔ مجھے گرتے دیکھ کر لڑکی ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی نے مجھے مزید خوفزدہ کر دیا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ گھر سے مرد نکلیں گے اور مجھے زدوکوب کر کے کنائی سنیال کے آدمیوں کو سونپ دیں گے۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ لڑکی نزدیک آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔

کچھ دیر میری بے بسی سے لطف لینے کے بعد بولی۔ "اگر ابھی سڑک پر نکلو گے تو لوگ تکہ بوٹی کر دیں گے۔ ٹھہرو میں کار لے کر آتی ہوں۔" وہ سچ مچ کار لے آئی۔ بائیں جانب کا دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "چلو، جہاں کہو گے اتار دوں گی۔" رکنا خطرناک تھا جب کہ راستے میں لڑکی کو قابو میں کر کے فرار ہونا آسان تھا۔ اس لئے میں بے خوف بن کر اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد لڑکی نے کہا۔ "ہاں اب بتاؤ تم کون ہو؟"



"پہلے تم بتاؤ کہ تم کیا بلا ہو۔ مجھے کس لالچ میں بچا کر نکال لائی ہو؟"

"لالچ کیا؟ تم چور ہو اور میں مور۔ تمھیں اس لئے بچا کر نکال لائی کہ تم سے معاوضہ وصول لوں۔ اب فٹافٹ مال آدھا آدھا کرو۔"

"کیسا مال؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"چوری کا، جو لے کر بھاگے ہو۔"

"لیکن میں چور نہیں ہوں۔"

"دھت تیری کی۔ پھر تو خواہ مخواہ تمھیں نکالا۔ پیٹرول بھی برباد ہوا اور کچھ حاصل وصول بھی نہیں ہوا۔ خیر کوئی بات نہیں ایڈونچر میں یہ سب ہوتا رہتا ہے۔"

"ابھی تک میں تمھیں سمجھ نہیں پایا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں ایڈونچر کی شوقین ہوں۔ اور......"

"اچھا اسی لئے نکال لائی ہو۔" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" کہتے ہوئے اس نے بریک لگا دیا اور بولی۔ "چلو اترو۔"

کار سے اتر کر میں گلی گلی ہوتا ہوا بونوگرام پہنچا۔ گھر کے سامنے پہنچتے ہی دماغ میں شاک لگا۔ گھر کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔

ایسی بے احتیاطی کی فریدہ سے امید نہیں تھی اس لئے میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور تیز تیز قدموں سے گھر میں داخل ہوا لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ گھر کی حالت بتا رہی تھی کہ فریدہ کا کمرہ، اکھاڑہ بنا تھا۔ سارا سامان بکھرا پڑا تھا۔ زور آزمائی کے نشانات جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ چوڑیوں کے ٹکڑے جا بجا بکھرے ہوئے تھے۔ کئی جگہ خون کے قطرے بھی نظر آئے۔ میں نے چھو کر دیکھا نشان تازہ تھے جو بزبان خاموشی بتا رہے تھے کہ واردات کو زیادہ وقت نہیں گزرا ہے لیکن ایسی جسارت کس نے کی؟ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ میری نظر ٹیلی ویژن کے اینٹینا پر پڑی، اینٹینا میں ایک کاغذ پھنسا ہوا تھا۔ میں نے اسے اتار کر کھولا، وہ کنائی سنیال کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "خان، تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ میں اکٹوپس ہوں۔ آٹھ ہاتھ پیر والا اور بھگوان شیو کی طرح میری بھی کئی آنکھیں ہیں۔ ادھر تم میری قید سے فرار ہوئے ادھر میں نے تمھارے گھر میں دبش دے دی۔ اس کارروائی کا مقصد بتانے سے پہلے اپنا لائحہ عمل بتاتا چلوں۔ میں نے سہ رخی جنگ چھیڑی ہے جس کو نام دیا ہے تھری ٹرم فریڈم وار۔ پہلا ٹرم ہے زبان، اپنی شونار بانگلہ کو غاصبوں سے نجات دلانے کے لئے

زبان کے مسئلے پر ساڑے سات کروڑ عوام کو دو حصوں میں بانٹوں گا۔ اکیس فروری 1950ء کو یونیورسٹی میں برکت وغیرہ پر جو گولیاں تمھاری پولیس نے چلائی تھیں، ان ہی گولیوں کو تم سب پر لوٹانے کے لئے اس دن کو قومی دن بنواؤں گا۔ لوگ اس دن بنگلہ زبان سے عہد کیا کریں گے کہ اسے قومی زبان بنوانے کے لئے گردن بھی پیش کریں گے۔ جب زبان سے محبت بڑھے گی تو ہزاروں میل دور کی زبان عربی اور غاصبانہ طور پر در آنے والے غیر بنگالیوں سے نفرت بڑھ جائے گی اور بہاری، بنگالی الجھ پڑیں گے۔ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ خانوں میں بٹ جائیں گے، تب میں مسلکی مسئلہ اٹھاؤں گا تا کہ بنگالی اور غیر بنگالی مزید ٹکڑوں میں بٹ جائیں۔ بنگالی شعیہ، بنگالی سنی کا اور بہاری سنی، بہاری شیعہ کا گلا کاٹیں۔ جب ٹکراؤ شباب پر آ جائے گا۔ تب میں تیسرا پٹارا کھولوں گا تا کہ وہابی، اہل سنت سے، یعنی معرفتیوں سے دست وگریبان ہو جائیں اور جب کچھ مسلمان ٹکڑوں میں بٹ جائیں گے تو تب میں شان سے اس سرزمین کو دوسرا ہسپانیہ بنا کر اپنا کھویا ہوا علاقہ چھین لوں گا اور رام راجیہ بنا کر حکومت کروں گا، اگر تب تک میں مر بھی گیا تو میرا نائب راج کرے گا۔

جانتے ہو میں نے اپنا منصوبہ تمھیں کیوں بتایا ہے؟ تا کہ تم اپنا سر پیٹ سکو۔ اپنے آپ پر لعنت بھیج سکو کیوں کہ تم میرا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے۔ اگر تم نے اپنی زبان کھولی تو تمھاری بیوی کی برہنہ لاش گلستان میں نمائش کے لئے رکھ دی جائے گی تا کہ گزرنے والے بسوں پر سوار ہونے سے پہلے عبرت حاصل کرتے جائیں۔ رہا سوال تمھارے بچے کا تو اسے میں سپاہی بناؤں گا، جدوجہد آزادی کا سپاہی۔ میرا مشن لانگ ٹرم ہے تب تک وہ جوان ہو جائے گا۔

تم کہو گے میں بے وقوف ہوں جو اتنا لمبا پروگرام بنا رہا ہوں۔ نہیں میرے یار، ایسا نہیں ہے۔ جلد بازی کا انقلاب دیرپا نہیں ہوتا۔ عسکری ماہرین کا کہنا ہے کہ سب سے کامیاب جنگ ذریعہ ابلاغ کی ہے یعنی ذہنوں کو بدل دینے والی جنگ۔ جب تک تم کچھ مسلمانوں کے ذہن میں وحدت اسلام کا خناس رہے گا تم سب ایک رہو گے، اسی لئے میں نے ذہنی طور پر تم سب کو غارت کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ میرا منصوبہ تمھیں بھی پسند آیا ہوگا۔ فقط تمھارا دشمن جس کی قید سے تم نکل بھاگے ہو۔''

اس خط نے میرے ہوش گم کر دیے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا تھا کہ ابوالبشر کو گاؤں جانے کی اجازت کیوں [illegible] تھی، اگر وہ رہتا تو شاید فریدہ اغوا نہ ہوتی۔ وہ میری وجہ سے مصیبت میں پھنس گئی اسے ان کے چنگل سے چھڑانا میری ذمہ داری تھی لیکن اسے



تلاش کروں تو کہاں؟ سنیال کا تو میں گھر بھی نہیں پہچانتا۔ اس سے میری ملاقات جگناتھ کالج میں ہوئی تھی۔ جس نے ملاقات کرائی تھی وہ بھی ڈھاکا میں نہیں تھا راج شاہی کا رہنے والا تھا، پڑھائی پوری کر کے لوٹ گیا تھا۔ یکا یک میرے ذہن میں آرتی گھوش ابھری۔ دبلی پتلی، سروقد لڑکی، ٹوٹی پھوٹی اردو بولنے والی لیکن رقص کی ماہر۔ دکانداروں کی انجمن یوم آزادی کے فنکشن میں اسے ہی بلایا کرتی تھی۔ انجمن کا میں خازن تھا اس لئے اسے معاوضہ بھی میں دیا کرتا تھا۔ مجھ سے کافی بے تکلف بھی تھی۔ اس کا گھر بھی میں نے دیکھا تھا۔ وہی میری رہنمائی کر سکتی ہے اسی امید پر میں ہندوؤں کے محلے سکھاری بازار، کی جانب چل پڑا۔

اتفاق سے وہ گھر پر ہی تھی۔ اسے میں نے پوری بات نہیں بتائی صرف اتنا پوچھا۔

''پروفیسر کنائی سنیال کو جانتی ہو؟''

کیوں؟'' اس نے گھنیری پلکوں کی اوٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم ہندو ہو نا اسی لیے۔''

''اوہ ان سے کیا کام پڑ گیا؟''

''نجی کام ہے۔''

''انہیں پہچانتی تو ہوں لیکن ان کا گھر نہیں جانتی۔''

اس کے جواب نے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ میں اٹھنا چاہتا تھا کہ وہ بولی۔

''ٹھہریے، میرا بھائی جانتا ہوگا' میں اسے بلاتی ہوں۔''

وہ اپنے بھائی کو بلانے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جب لوٹی تو اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔

''سوشیل ہے میرا تایازاد۔ یہ ان کا گھر جانتا ہے لیکن بتا رہا ہے کہ کنائی سرچٹا گانگ گئے ہوئے ہیں۔'' آرتی نے کہا۔

''وہ کب گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آج ہی کچھ ہی دیر پہلے میں نے خود اسے پلین میں سوار کرایا ہے۔'' سوشیل نے کہا۔

''اس کے ساتھ اور کون کون تھا۔''

''نورالاسلام، [illegible] اور ایک بیمار عورت جس پر غشی طاری تھی۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا۔''

"تم جانتے ہو وہ سب کہاں ٹھہریں گے۔؟"

"ہاں، رانگا ماٹی میں ان کے دوست کا مکان ہے وہیں ٹھہریں گے۔"

"کیا تم مجھے وہاں پہنچا سکتے ہو۔"

"میں معاوضہ پر ہر کام کرتا ہوں۔ اگر آپ میرا محنتانہ دے سکتے ہیں تو میں تیار ہوں۔"

"ایک ہزار روپیا دوں گا۔ بولو جاؤ گے۔"

ضرور ضرور میں ابھی اپنے کپڑے لے کر آتا ہوں۔"

اس کے لوٹتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ اتنی جلدی ہوائی جہاز میں سیٹ ملنی مشکل تھی اس لیے ٹرین سے جانے کی ٹھانی۔ اسے بتایا دیا کہ وہ بیمار عورت میری بیوی کی بہن ہے اور اسے اغوا کر کے لے جایا گیا ہے۔

ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے پھول پڑیا اسٹیشن پہنچ گئے گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ فوراً سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن صبح چٹا گانگ پہنچے وہاں سے اس نے کرائے کی جیپ حاصل کی اور ہم لوگ رانگا ماٹی چل پڑے۔ شام کے سائے گہرے ہونے سے پہلے ہم دونوں رانگا ماٹی پہنچ گئے۔ لکڑی اور ٹین کی چادروں سے بنے گھر کے سامنے اس نے جیپ روکی اور اندر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "یہیں اسے قید کیا گیا ہوگا لیکن آپ فکر نہ کریں میں اسے آزاد کرالوں گا۔"

"اندر اور لوگ بھی ہوں گے؟" میں نے تشویش ظاہر کی۔

"فکر نہ کریں آپ نے ایک ہزار روپیا دیا ہے اسے حلال کروں گا۔ جو بھی سامنے آئے گا اسے بھون کے رکھ دوں گا۔ یہ پستول دیکھ رہے ہیں نا، یہ آخر کس دن کام آئے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پستول کی جھلک دکھائی اس کے انداز تخاطب نے میری ڈھارس بڑھادی اور میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی میرے ہوش اڑ گئے۔ دروازے کی دونوں جانب دو دو آدمی کھڑے تھے۔ چاروں کے ہاتھ میں پستول تھا۔ "تمہارا کھیل ختم اب ہمارا کھیل شروع ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے سوشیل نے بھی اپنا پستول مجھ پر تان دیا۔

"غدار تُو نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کیا، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" کہتے ہوئے میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میں جانتا تھا کہ اس سے لپٹ جاؤں گا تو گولی چلاتے ہوئے سب کے ہاتھ کانپ جائیں گے کیوں کہ اس طرح سوشیل بھی زد پر آجاتا۔ میں اسے



رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس آپادھاپی میں اس کا پستول ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ جسے اس کے ایک ساتھی نے اٹھا لیا تھا۔

سوشیل کے متعلق میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ اس نے کسی اچھے استاد کی شاگردی قبول کر کے لڑنے بھڑنے کے سارے گُر سیکھے ہوئے تھے۔ سارے داؤ پیچ اسے ازبر تھے۔ اس نے الٹی قلا بازی کھائی کہ وہ میری گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ سب کچھ بس ایک پل میں ہو گیا تھا۔ دوسرے پل وہ پھر میرے سامنے دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ میں اس کی پھرتی اور مہارت حیران رہ گیا مگر اس نے مجھے حیرت کے اظہار کا موقع نہیں دیا۔ چند سیکنڈ اس نے مجھے نگاہوں میں تولا اور پھر اچانک اچھل کر میرے سینے پر فلائنگ کک لگائی میں نے اس کک سے بچنے کے لیے بہت تیزی دکھائی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے دونوں جکڑے ہوئے پیر میرے شانے پر پڑے اور میں اچھل کر پہلو کے بل نیچے جا گرا۔ مجھے اس سے اس مہارت اور چابکدستی کی بالکل توقع نہیں تھی اسی لیے وہ مجھے زمین بوس کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے مجھ پر پھندہ پھینکا۔ مضبوط رسی کا پھندہ میرے گلے سے ہوتا ہوا شانے سے نیچے اترا تھا کہ جھٹکا پڑا، پھندا کس گیا۔ میں اس افتاد سے نکلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ دوسرا اور تیسرا پھندہ بھی آ پڑا۔ جس فنکاری سے ارنے بھینسے کو قابو میں کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح مجھے بھی قابو میں کیا گیا تھا۔

"باندھ دو سالے کو۔" دروازے کے باہر سے آواز آئی۔ میں نے آواز کی سمت نظریں گھمادیں۔ دروازے کے بیچوں بیچ کمر پر ہاتھ رکھے کنائی سنیال کھڑا تھا۔ "مجھ سے ٹکرا کر تم نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ خان! میں تمہیں کتے کی موت ماروں گا۔"

"زنخے کی اولاد مرد ہے تو مجھ سے مقابلہ کر عورت کو گھر سے اٹھا لانا بہادری نہیں ہے۔"

جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔"

"اگر فریدہ کو کچھ ہو گیا تو میں تیری اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔"

"ہو گیا؟ چچ چچ چچ، میرے یار بہت کچھ ہو چکا ہے"۔ پھر اس نے مڑ کر اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ "نورا! اسے لے آ"۔

نورا اندر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب لوٹا تو اس کے ہاتھوں پر نیم

جان فریدہ تھی۔ اس کا سر ڈھلکا ہوا تھا۔ بالوں میں مٹی پھری تھی۔ کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے تھے۔ جس پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے کوڑوں سے پیٹا گیا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر میں اپنا آپ کھو بیٹھا اور جھٹکا مار کر اس کے پاس پہنچنے کی کوشش کر ڈالی۔

''بہت جان باقی ہے۔ اسے اتنا پیٹو کہ موت بھی ڈر جائے۔'' کنائی سنیال نے دھاڑ کر حکم دیا اور وہ سب مجھ پر پل پڑے لاتوں کی بارش ہونے لگی۔

''ہاتھوں سے نہیں ڈنڈے سے پیٹ۔'' سنیال کا حکم سنتے ہی کسی نے ڈنڈا اٹھا کر مجھے روئی کی طرح دھنا شروع کر دیا۔ یاد نہیں ہے کہ میں کب تک پٹتا رہا۔ بے ہوشی نے احساس کی قوت کو مدہوش کر دیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہ چادر تن گئی تھی۔ پتا نہیں کب تک میں بے ہوش رہا۔ ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو پتوں کے ڈھیر پر پایا۔ بڑے بڑے پتے بڑے قرینے سے ایک کے اوپر ایک رکھ کر بستر کی شکل میں بچھائے گئے تھے۔ میں نے نظریں گھما کر جائزہ لیا۔ بانس کی پھچیوں اور سیال کے پتوں سے بنی ہوئی وہ ایک چھوٹی سی کٹیا تھی۔ میں حیرت بھری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولا تھا ایک نوعمر دوشیزہ نے۔ اس کا رنگ زردی مائل تھا اور چہرا چوڑا لیکن ناک چپٹی تھی۔ عجیب سا لگ رہا تھا لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی اس سے زیادہ حیرت اس کے لباس کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔ ڈھاک کے چوڑے چوڑے پتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے ایک دوسرے میں گانٹھ کر فراک کی شکل دے دی گئی تھی۔ شانے سے ٹخنوں تک کی ستر پوشی بڑے عمدہ ڈھنگ سے کر رکھی تھی۔ وہ خوفزدہ انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی میرے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی اور پھر وہ کچھ بولی مگر میں سمجھ نہیں پایا۔ الفاظ بنگلہ سے ملتے ہوئے ضرور تھے لیکن اتنے مسخ تھے کہ میری سمجھ میں رتی بھر نہ آیا۔ اس نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ مجبور ہو کر میں نے کہا تیری بات میرے پلے نہیں پڑ رہی ہے۔ بنگلہ یا اردو جانتی ہے؟

''بنگلہ؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ جواب میں میں نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں'' پھر اس نے لایعنی زبان میں کچھ کہا اور لوٹ گئی۔ کچھ دیر بعد جب لوٹی تو اس کے ساتھ تین چار شخص تھے۔ ان میں سے ایک کافی قد آور نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے رعب و جلال عیاں تھا۔ اس کے ہاتھ میں شیر کی پوری ٹانگ تھی۔ سوکھی ہوئی ٹانگ جسے وہ گرز کی طرح کندھے پر رکھے ہوئے تھا۔ اس کا اوپری دھڑ ننگا تھا لیکن کمر سے ٹخنوں تک اس نے چیتے کی کھال لپیٹ رکھی تھی۔ اس نے نزدیک آ کر ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں کہا۔ ''تم ہمارے علاقے میں



کیوں آئے ہو؟''

''میں خود نہیں آیا ہوں۔ میں تو بے ہوش تھا جب آنکھ کھلی تو اس کٹیا میں تھا۔''

''تمہیں میرے شکاری اٹھا کر لائے ہیں۔ تم جنگل میں بے ہوش پڑے تھے اور تمہارے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔''

''تب آپ خود اندازہ لگالیں، یقین کریں میں اپنے پیروں سے نہیں آیا ہوں؟''

''اسی وجہ سے تم زندہ ہو ورنہ ہم اب تک تمہیں مار دیتے۔ ہم اپنے علاقے میں کسی برے آدمی کو پسند نہیں کرتے۔''

''لیکن میں برا نہیں ہوں۔''

''ادھر جنگل کے پارے سے آنے والے سب برے ہوتے ہیں۔ ہاتھی چرانے آتے ہیں۔''

''ہاتھی چرانے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، ہاتھی چرانے۔ وہ لوگ دھماکے سے ہاتھی مار دیتے ہیں اور اس کے دانت اور ہڈیاں لے جاتے ہیں۔''

''لیکن میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ ادھر ہاتھی پایا جاتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔''

''یہ ارکاٹ کا جنگل ہے۔''

''ارکاٹ، او میرے خدا تو کیا یہ چٹا گانگ ہل ٹریک کا آخری حصہ ہے؟''

''ہاں ادھر دو پہاڑ کے بعد ارکان راج ہے۔''

''یعنی صوبہ ارکان۔ برما کا پہلا صوبہ!''

''ہاں اور ادھر آٹھ پہاڑ کے بعد چٹا گاؤں ہے''۔ اس نے مخالف سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اف مجھے اتنا اندر جنگل میں لا پھینکا''۔

''کس نے لا پھینکا؟''

''کچھ برے آدمی ہیں جو میری جان لینا چاہتے ہیں۔''

''برے آدمی تمہارے دشمن ہیں، تب تو تم ہمارے دوست ہو۔ ہم تمہارے زخموں کا علاج کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھ آئے آدمی سے اسی لایعنی زبان میں

کچھ کہا۔ اس نے سر جھکا کر کورنش کیا اور مڑ کر باہر چلا گیا کچھ دیر بعد جب لوٹا تو اس کے ساتھ ایک بوڑھا بھی تھا۔ اس بوڑھے کی بھویں تک سفید تھیں، کمر خمیدہ ہو رہی تھی۔ اس نے نزدیک آ کر سردار کو کورنش کیا۔ سردار نے بھی اسی کے انداز میں کورنش کیا، میں سمجھ گیا تھا کہ بوڑھا بھی لائق تعظیم ہے۔ اس لیے میں نے اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر بیٹھے بیٹھے کورنش کے انداز میں سر کو جھکا دیا۔ میری اس اداکاری نے سردار اور بوڑھے پر خاطر خواہ اثر ڈالا۔ ان کے چہرے کھل اٹھے تھے۔ بوڑھے نے ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں کہا" سکھا تمہیں کس نے مارا ہے؟"

"کچھ برے لوگ ہیں۔ وہی جو ہاتھی چراتے ہیں۔"

"برے لوگ تمھارے دشمن ہیں لیکن ان کے پاس تو دھماکہ کرنے والی لاٹھی ہوتی ہے۔ وہ تو دور سے مارتے ہیں۔"

"انہوں نے دھماکہ کرنے والی لاٹھی سے نہیں مارا مجھے عام سی لاٹھی سے مارا ہے۔"

"فکر نہ کرو ابھی ٹھیک ہو جائے گا" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے کپڑے ہٹا کر نیل دیکھے انہیں دبا کر سہلا کر معائنہ کیا اور پھر باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں بانس کا ہاتھ بھر لمبا کھوکھلا تنا تھا۔ اس ٹکڑے کو میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اس نے کہا "پی جاؤ"۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے ٹکڑے کے دہانے کو اپنے منہ سے لگا لیا۔ گلاس جیسے بانس کے ٹکڑے کے اندر ایک عجیب سا مشروب بھرا تھا، جس کا مزا اتنا تلخ تھا کہ مجھے ابکائی آنے لگی۔ متلی کو روکنے کے لیے میں نے اپنے ذہن میں الٹی گنتی گننا شروع کر دی۔ ذہن کا رخ مڑتے ہی متلی بند ہو گئی۔ اتنی دیر میں اس بوڑھے طبیب نے ایک عجیب سے پودے کو پیس کر لگدی سی بنالی۔ جسے اس نے میرے جسم پر ملنا شروع کر دیا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ اس لیپ میں کیسا جادو اثر تھا۔ میری رگ رگ میں خمار بھرنے لگا تھا۔ اتنی سرعت سے اس بوٹی نے کام کیا تھا کہ کچھ ہی دیر میں میرے جسم کا درد کافور ہو گیا۔

"اب آرام کرو۔ ہم سورج دیوتا کے جھکنے پر آئیں گے"۔ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

اس دوا میں ایسا جادو تھا کہ میں اپنے جسم میں ایک عجیب سی توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔ دوسرے دن پھر اس نے اسی قسم کا لیپ کیا اور تیسرے دن جب میں نے جھرنے پر جا کر غسل کیا تو حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ سارے زخم مندمل ہو گئے تھے۔ نہا کر لوٹا تو اس طبیب کو اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی بانس کا ٹکڑا تھا جسے بڑھاتے



ہوئے اس نے کہا۔ "میتا لو سوم رس پی لو جو صرف سرداروں کے لیے مخصوص ہے۔ کسی دوسرے شخص کو پلانا پاپ ہے۔ پھر بھی تمہیں پلا رہا ہوں۔ یہ دیوتاؤں کا پسندیدہ مشروب ہے۔ بڑی بڑی پوتھیوں میں، مقدس کتابوں میں جس سوم رس کا ذکر ہے۔ وہ یہی ہے۔ اسے پیتے ہی جسم میں شیر جیسی طاقت آ جاتی ہے۔ کسی قسم کی چوٹ کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ جسم فولاد کا بن جاتا ہے۔ گھونسوں کی چوٹ سے پتھر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور یہ ساری خوبیاں تمہارے اندر آ جائیں گی۔"

"اچھا؟" میں نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں تم ایک پہر بعد آزما لینا میری بات کی تائید ہو جائے گی۔ لیکن یاد رکھوں، پھلسا بلم کلہاڑی سے بچ کر رہنا۔ نوکیلا پھل گوشت میں دھنس سکتا ہے۔"

اس دوا میں ہلکا نشہ تھا۔ مجھے سرور سا محسوس ہو رہا تھا۔ بوڑھے کے جاتے ہی میں لیٹ گیا۔ میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں کہ میرے ذہن میں خدشے نے سر ابھارا۔ کہیں اس بدمعاش نے مجھے زہر تو نہیں دے دیا۔ یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ ارکاٹ والے یوں بھی غیر کی آمد پسند نہیں کرتے۔

میرے ذہن میں تار عنکبوت پھیلتا جا رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے میرے بالوں میں انگلیاں سرسرا رہی ہیں۔ نازک نازک سی انگلیاں میرے رگ و پے میں سرسراہٹ بھر رہی تھیں۔ میں نے ذہن پر چھائی دھند کو جھٹکتے ہوئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن پپوٹے اتنے بھاری ہو چکے تھے کہ لاکھ کوشش کے بعد بھی کھل نہیں رہے تھے۔ ایک عجیب سا بوجھ آ پڑا تھا۔ میرے اندر کشاکش کا بازار گرم تھا۔ میں حواس کو مجتمع کر رہا تھا اور ناکامی سینہ سپر تھی۔ ہاتھ پیر پتھر جیسے ہو گئے تھے۔ لاکھ کوشش کے بعد بھی انہیں ہلا نہیں پا رہا تھا۔ کانوں کے قریب مچھروں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز گونج رہی تھی لیکن آواز کا مخرج دیکھنے میں ناکام تھا۔ میں اپنے آپ سے لڑ رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے بہت بلندی سے اچھال دیا ہو۔ زمین سے ٹکراتے ہی میرے حواس مجتمع ہو گئے۔ قوت بصارت اور قوت سامع کام کرنے لگی۔ میری پانچویں اندری کام کرنے لگی تھی۔ تب میں نے دیکھا میں زمین پر پڑا ہوں اور میرے گرد دائرے کی شکل میں کئی لوگ کھڑے ہیں۔ ان سب کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے نیزے تھے۔ وہ سب چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے لیکن ان کی زبان میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ ہاں ان کے چہرے پر پھیلا غیض وغضب اپنی خاموش زبان سے بتا رہا تھا کہ ان کی نیت ٹھیک نہیں ہے وہ سب دشمنی پر آمادہ

ہیں۔ ان کا رویہ دیکھ کر پھرتی سے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چاروں جانب نظریں گھماتے ہی میں نے دیکھا کہ سردار کی بیٹی لاشا جسے پہلے دن دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا وہ ایک کونے میں سر جھکائے کھڑی ہے۔ اس کے برابر میں ایک نوجوان کھڑا تھا' اس کی آنکھوں سے کینہ جھلک رہا تھا۔ میرے گرد دائرہ بنائے کھڑے نوجوانوں کی آنکھوں میں بھی کینہ تھا۔ مجھے اٹھ کر کھڑا ہوتے دیکھ کر ان میں سے ایک نے نیزے کے ڈنڈے سے میری پسلیوں پر ٹھوکا دیا اور کچھ بولا۔ اس کے اس انداز نے میرے اندر سوئے ہوئے درندے کو جگا دیا اور میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر توڑ دیا۔ قارئین یقین نہیں کریں گے کہ کچے بانس کا ڈنڈا درمیان سے یوں ٹوٹ گیا جیسے معمولی سا تنکا ہو۔ مجھے خود اپنی قوت پر حیرت ہو رہی تھی کہ دوسرے نوجوان نے پیچھے سے لات چلا دی۔ میں پھرتی سے پیچھے گھوما اور الٹے ہاتھ کا طمانچہ رسید کر دیا۔ آپ یقین کریں گے۔ طمانچہ پڑتے ہی اس کا جبڑا ٹیڑھا ہو گیا۔ اسے جیسے کسی نے بھاری ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر سارے نوجوان مجھ سے لپٹ پڑے۔ ان قوی ہیکل نوجوانوں کو میں اٹھا اٹھا کر یوں پھینکنے لگا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے شریر بچے ہوں۔ میں ان سے نپٹ رہا تھا کہ دروازے سے رعب دار آواز ابھری۔ ''رک جاؤ۔''

وہ سب اس طرح ساکت ہو گئے جیسے سب پتھر کے بن گئے ہوں۔ میں نے نظریں گھما کر دیکھا دروازے پر سردار کھڑا تھا۔ اس نے اندر آ کر اپنی لایعنی زبان میں کچھ پوچھا۔ لاشا نے ٹر ٹر کر کے کچھ بتانا شروع کر دیا۔ اس کی بات ختم ہوتے ہی سردار نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹا کیا تم لاشا کو پسند کرتے ہو؟''

اس کے سوال پر میں چونک گیا۔ ''میں سمجھا نہیں؟'' میری زبان سے تین لفظ خود بخود پھسل گئے۔

''یہ لاتوشا ہے۔'' اس نے اس نوجوان کی جانب اشارہ کیا جو لاشا کے برابر میں کھڑا مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''لاتوشا میرے بعد سردار بنے گا کیوں کہ ہمارے قبیلے کی رسم ہے کہ سردار کی بڑی بیٹی کا شوہر سردار ہوتا ہے۔'' سردار نے کہا۔

''یعنی یہ لاشا کا شوہر ہے''۔ میں نے پوچھا۔

''شوہر نہیں ہے۔ اس بار موسم بہار میں دونوں کی شادی ہوگی۔ میرے دونوں بیٹے اس کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''لیکن بیٹے کے ہوتے سرداری داماد کو ملے؟'' میں نے پوچھا۔



''باپ کے بعد بیٹا سردار نہیں بن سکتا کیوں کہ سرداری میراث نہیں ہے۔ سرداری تو بہادری کا تاج ہے۔ سردار کی بیٹی سے قبیلے کا سب سے بہادر نوجوان شادی کرتا ہے اور یہ نوجوان بہادر ہے۔ شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر جبڑا توڑ دیتا ہے یہ۔''

''تب تو یہ واقعی سردار بننے کے لائق ہے۔''

''لیکن لاشا نے ابھی کچھ دیر پہلے اسے دھتکار دیا ہے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی ہے لیکن تمہیں لاشا کو حاصل کرنے کے لیے لاتوشا سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔''

''آخر کیوں؟''

''یہ ضروری ہے۔ اگر اسے شکست دے دو گے تو لاشا اور سرداری تمہیں مل جائے گی۔''

''لیکن مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔''

''اب تمہاری پسند اور ناپسند کا سوال نہیں ہے۔ لاشا نے اعلان کر دیا ہے اپنی پسند کا اور اگر تم نے مقابلے سے انکار کیا تو ہماری رسم کے مطابق تمہیں جنگل میں کسی پیڑ سے باندھ کر الٹا لٹکا دیا جائے گا تا کہ درندے اپنا پیٹ بھر سکیں۔''

''اور اگر مجھے شکست ہوئی تب؟''

''تب تمہارے ساتھ وہی کیا جائے جو لاتوشا کہے گا اور لاشا کو سانپ سے تین بار ڈسوایا جائے گا تا کہ کوئی لڑکی کسی کمزور نوجوان کو پسند کرنے کی بھول نہ کرے۔''

''تمہاری رسمیں ظالمانہ ہیں۔''

''ہماری رسمیں ہمیں جان سے پیاری ہیں اگر تم نے اس کے خلاف ایک بھی لفظ کہا تو بہت برا ہوگا۔ آج سورج دیوتا کا چہرہ لال ہوتے ہی مقابلہ شروع کر دیا جائے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مڑ گیا۔ اس کے ساتھ سارے لوگ نکل گئے۔ جھگی میں باقی رہ گئی لاشا۔ وہ بھولی بھالی معصوم سی جنگلی لڑکی جس نے کبھی تہذیب یافتہ شہر کی شکل نہیں دیکھی، کپڑوں کی ضرورت کو نہیں سمجھا۔ پتوں سے ستر پوشی کرنے والی اس حسینہ نے میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ایسے نوجوان سے مقابلہ کروا دیا تھا جس کی شہ زوری میں سردار بھی رطب اللسان تھا۔ جو شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کا جبڑا پھاڑ دیتا تھا۔ ایسے فیل صفت منہ زور سے مجھے مقابلہ کرنا تھا۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آنے لگی تھی۔ میں فکر میں ڈوب گیا تھا کہ اس حسینہ نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر کچھ کہا۔ زبان آڑے تھی لیکن چہرے سے میں نے مافی الضمیر سمجھ لیا۔ وہ مجھے

ڈھارس دے رہی تھی۔ اس کے باتیں کرنے کا انداز اتنا پیارا تھا کہ مجھے اس کی معصومیت پر پیار آنے لگا۔ میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس معصوم سی لڑکی کو سانپ کے زہر سے بچاؤں گا۔ اس نے مجھ پر اعتماد کیا ہے تو میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھاؤں گا۔

وہ تاپی اپنی زبان میں بے تکان بولے جا رہی تھی جس کا ہر لفظ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا گویا وہ ٹین کے ڈبے میں کنکریاں بھر کر ہلا رہی ہے اور میں ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ تک رہا تھا بلکہ اس کے ناک نقشے پر غور کرنے لگا تھا۔ اس کی چپٹی ناک اور چوڑے چہرے کے سانچے میں ڈھلے ہوئے بدن سے موازنہ کر ہی رہا تھا کہ وہ خاموش ہو گئی۔ ہونٹوں کی حرکت بند ہوتے ہی گہری خاموشی چھا گئی۔ شور آشنا سماعت پر یک لخت پھیلا سکوت گراں بار ثابت ہوا اور میں چونک گیا۔ اس نے باہر کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ مافی الضمیر سمجھنے کے لیے میں نے اپنی گردن موڑ کر باہر دیکھا۔ دھوپ کی رنگت بتا رہی تھی کہ سورج اپنے سفر کے آخری دور میں ہے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور کھڑی ہو گئی اس کا ساتھ دینے کے لیے میں بھی اٹھ گیا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلی اور بستی کی سمت چل پڑی۔ میرا خیال تھا وہ بستی میں جائے گی لیکن بستی کے نزدیک پہنچتے ہی اس نے راستہ بدل دیا اور ایک پتلی سی پگڈنڈی پر چلتی ہوئی عقبی علاقے میں چلی آئی۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک سرسبز وادی دکھائی دی جہاں ایک جم غفیر نظر آیا۔ ہم دونوں کے نزدیک پہنچتے ہی مجمع میں جوش و خروش پھیل گیا۔ کچھ لوگ گلے میں ڈھول جیسا ساز لٹکائے تھے، اسے پیٹتے ہوئے حلق سے عجیب سی آواز نکالنے لگے۔ میں نے ڈھاکا میں ہندو عورتوں کو پوجا کے وقت ہونٹوں کا دائرہ بنا کر ایسی ہی آوازیں نکالتے سنا تھا جسے 'الودینا' کہا جاتا ہے۔ شاید یہ وہ عجیب سی آوازیں جنگلیوں کے نزدیک متبرک تھیں تبھی تو باقی لوگوں نے ہاتھوں کو جوڑ کر سر جھکا لیا تھا۔

ہم دونوں جا کر سردار کے نزدیک کھڑے ہو گئے۔ سردار مجھے دیکھتے ہی مسکرا دیا اور پکار اٹھا۔ "مجھے یقین ہے میری بیٹی کا انتخاب غلط نہیں ہے۔ تم یقیناً بہادر ہو۔ جاؤ میدان تمہارا منتظر ہے۔" پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر مجمع کو اشارہ دیا۔ میدان کی دوسری سمت سے نقارے کی آواز ابھری۔ ڈھول کی تال پر جھومتے ہوئے سردار نے میرا شانہ تھپتھپایا اور آگے دھکیل دیا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میدان کے وسط میں جا کر کھڑا ہو گیا اور تیز نظروں سے آس پاس کا معائنہ کرنے لگا۔ مجمع کے درمیان سے نکل کر کچھ نیزہ بردار آگے بڑھے اور میرے گرد گھیرا بنا کر کھڑے ہو گئے۔ میری عقابی نگاہیں ان کا جائزہ لے رہی تھیں کہ ان کا گھیرا توڑ کر



لاتوشا میدان میں آ پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں دو خنجر تھے۔ ایک اس نے میری جانب بڑھایا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ نیزہ برداروں نے گھیرا مکمل کیا اور کورنش کے انداز میں جھک گئے پھر پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ یکایک شور وغل کی آواز تھم گئی صرف نقارے کی آواز گونج رہی تھی۔ لاتوشا نے کچھ کہا اور پھر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے میں بھی کچھ پیچھے ہٹ گیا۔

نظریں اس کے خنجر والے ہاتھ پر تھیں۔ وہ اسے گردش دے رہا تھا لیکن میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا اور اس کے حملے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے اچانک میری جانب جست لگائی۔ میں ہوشیار تھا، اسے حرکت کرتے دیکھ کر میں فوراً اپنی جگہ سے تھوڑا سا ہٹ گیا اور اسے جھکائی دے کر اس کے خنجر والے ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ سے دبوچنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی داؤ پیچ نہیں جانتا ہوگا، لیکن وہ تو اپنے فن میں یکتا نکلا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آتے ہی اس نے فضا میں اچھل کر الٹی قلابازی کھائی اور اس انداز سے اپنا ہاتھ جھٹکا کہ وہ میری گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ سب کچھ بس ایک پل میں ہو گیا تھا۔

دوسرے پل وہ پھر میرے سامنے سینہ تانے کھڑا تھا۔ میں اس کی پھرتی اور مہارت پر حیران رہ گیا تھا مگر اس نے مجھے نگاہوں میں تولا اور پھر اچانک اچھل کر میرے سینے پر دولتی ماری۔ میں نے اس وار سے بچنے کے لیے بہت تیزی دکھائی تھی، اگر ایک پل کی بھی دیر ہو جاتی تو میرے سینے کا پنجر ٹوٹ جاتا۔ وہ اڑتا ہوا میدان کے وسط میں دھپ سے گرا تھا۔ اسے گرتا دیکھ کر میں نے جست لگا دی لیکن وہ بھی بلا کا پھرتیلا تھا۔ اس نے فوراً لوٹ لگا دی۔ جس جگہ کچھ پل پہلے وہ گرا تھا میں بھی وہیں پر جا گرا۔ گرتے ہی میں نے بھی لوٹ لگا دی تھی۔ یہ میرے حق میں اچھا ثابت ہوا ورنہ اس نے بجلی کی سرعت سے خنجر چلا دیا تھا جو دستے تک زمین میں دھنس گیا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ پر وزن دے کر میں چکری کی طرح گھوم گیا۔ گردش کرتی ہوئی لات پوری قوت سے اس کے ہاتھ سے ٹکرائی تھی اور وہ کئی ہاتھ دور گر گیا تھا۔ میں نے پھرتی سے لوٹ لگائی اور اس کے خنجر پر قبضہ کر لیا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں خنجر آ چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں خنجر دیکھتے ہی اس نے ہوا میں قلابازی لگائی اور میرے پیچھے پہنچ گیا۔ پیچھے پہنچتے ہی اس نے میرے گلے کو پکڑ لیا۔ میں نے پھرتی سے اس کی دونوں کلائیوں پر خنجر پھیر دیے۔ لمبا تڑکا لگا کر میں نے دونوں خنجر تماشیوں کی جانب اچھال دیے اور اس کی کلائی کو پکڑ کر جھٹکا

دیا تو ہاتھوں کا پھندہ کھل گیا اور میں نے فوراً لوٹ لگا دی۔ دور ہٹتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے جست لگائی اور مجھ پر آ پڑا اور دو تین گھونسے میرے منہ پر جڑ دیے۔ کمبخت میں بڑی جان تھی۔ اس کی پوری کلائی ادھڑی ہوئی تھی بڑی مقدار میں خون بہہ رہا تھا، اس کے باوجود اس کے گھونسے مجھے اپنے چہرے پر ہتھوڑے کی طرح پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی اس حرکت پر میں غصے سے بے قابو ہو گیا اور مشتعل ہو کر میں نے اپنا گھٹنا پوری قوت سے اس کے پیٹ میں مار دیا۔ گھٹنے کی ضرب بہت شدید تھی۔ وہ ذبح ہونے والے بکرے کی طرح ٹکرانے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ رکھا تھا۔ میں نے موقع گنوانا مناسب نہیں سمجھا اور اس کی کنپٹی پر تڑا تڑ کئی گھونسے مار دیے۔ کنپٹی پر پڑنے والی ضرب کام کر گئی اور وہ لہرا کر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی مجمع بے قابو ہو گیا۔ نعرے لگاتے ہوئے لوگوں نے میری جانب دوڑ لگا دی۔ مجھے کئی جوانوں نے کندھے پر اٹھا لیا تھا۔ میں حیران و پریشان تھا کہ میری نظر لاتو شا پر پڑی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر وہ سر کو بار بار جھٹکے دے رہا تھا۔ واقعی اس میں بڑی جان تھی ورنہ کنپٹی پر پڑنے والی ضرب کے بعد تو معمولی انسان کئی گھنٹے کے لیے بے ہوش ہو جاتا ہے۔ میں نے نوجوانوں کو اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا۔ میرا اشارہ سمجھتے ہی وہ بیٹھ گئے اور میں نیچے اتر گیا۔ نیچے اترتے ہی میں نے لاتو شا کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ بھی چوکنا ہو گیا۔ اس کے قریب جاتے ہی میں نے مسکراتے ہوئے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ میرے اس اقدام پر صرف لاتو شا ہی نہیں پورا مجمع متحیر رہ گیا۔ اسے سینے سے بھینچتے ہوئے میں نے کہا۔

''میرے دوست تجھے شکست دینا مجھے مقصود نہیں تھا، میں تو لاشا کو سانپوں سے بچانا چاہتا تھا۔''

پھر میں اسے ساتھ لے کر سردار کے پاس پہنچا۔ سردار کے برابر میں جنگلی پھولوں کا ہار تھامے لاشا کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے دیے جگمگا رہے تھے وہ ہار پہنانے جب آگے بڑھی تو میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر رخ موڑ دیا اور اس کے ہاتھوں کے ذریعے وہ ہار لاتو شا کے گلے میں پہنا دیا۔ میری اس حرکت پر سب حیران ہو گئے۔ لاشا کی آنکھوں میں کرب سمٹ آیا۔ اس کے چہرے پر بدمزگی کے آثار دیکھتے ہی میں نے کہا'' لاشا تیرے لائق میں نہیں ہوں۔ تو بہادر باپ کی بیٹی ہے۔ تیرے لائق یہی جوانمرد ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لاتو شا کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر بولا'' ۔'' تو میری بیوی



نہیں، بہن بنے گی۔ آج سے تُو میری بہن ہے اور میں تیرا بھائی ہوں۔''

میری باتوں کا سردار پر خاصا اثر پڑا۔ اس نے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور پھر اس نے میرے الفاظ کا ترجمہ کر دیا۔

میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ میری جیت سے کئی چہروں پر مردنی چھا گئی تھی لیکن میرا جواب سنتے ہی وہ چہرے بھی کھل اٹھے تھے۔ تہذیب و تمدن کی روشنی سے نا آشنا۔ پتوں اور کھالوں سے ستر پوشی کرنے والے شہر سے میلوں میل دور دشوار گزار پہاڑوں اور جنگلوں کے پار اس چھوٹی سی بستی کے لوگ میرے فیصلے پر خوشی کے اظہار میں بے تحاشا اچھل کود رہے تھے۔ سردار نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بہادر انسان تُو نے اتنا بڑا منصب کیوں ٹھکرا دیا؟''

''بہتا ہوا پانی، اڑتا ہوا پنچھی اور چلتا ہوا مسافر کبھی اپنا نہیں ہوتا۔ میں بھی مسافر ہوں مجھ پر اتنا بھروسا نہ کریں۔ میرے بارے میں تو آپ لوگ کچھ بھی نہیں جانتے ہیں، میں برا آدمی بھی تو ہو سکتا ہوں۔''

''نہیں بیٹا تم برے آدمی نہیں ہو۔ اگر برے ہوتے تو اتنا بڑا فیصلہ نہیں کرتے۔ سرداری کو نہیں ٹھکراتے۔ برے آدمی تو ادھر آنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہاں سے ہاتھی چراتے ہیں۔ خوشبودار لکڑی جسے وہ صندل کہتے ہیں اسے چراتے ہیں۔ کستوری ہرنی چراتے ہیں اور پتھر کا پسینہ جسے وہ سلاجیت کہتے ہیں وہ بھی چراتے ہیں۔ برے آدمی کو لالچ دینے والی بہت ساری چیزیں ہیں یہاں۔'' سردار نے کہا۔

''آپ نے مجھے اچھا آدمی کہا، یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ امید ہے میری اس جسارت کو معاف کریں گے''۔ پھر میں نے لاتو شا کی جانب مڑ کر کہا۔ ''میرے بیٹا تم بھی مجھے معاف کر دینا۔'' اور پھر میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس اپنی جھگی کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح لاتو شا پہنچ گیا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی بنگلہ میں کہا۔ ''بیٹا تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو میں ادا نہیں کر سکتا۔ اپنی دوستی کے نام پر میں تمہیں ایک فن سکھانا چاہتا ہوں۔''

''کون سا فن؟'' میں نے پوچھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔ مجھے اپنے ساتھ لے کر وہ کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک جگہ رک کر اس نے کہا۔'' اب تم میرے ہاتھوں کی حرکت کو غور سے

دیکھنا۔'' اور پھر اس نے مٹی کے ایک چھوٹے سے ٹیلے کو نیزے سے کھودنا شروع کر دیا۔ ٹیلے کی رنگت بتا رہی تھی کہ وہ سانپوں کی بانبی ہے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ تھوڑی دیر میں پھنکارتا ہوا ایک سانپ نکل آیا۔

''ہوشیار، میرے ہاتھ کی حرکت کو بغور دیکھو۔'' کہتے ہوئے لاتوشا نے سانپ کی دم پکڑ کر مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ سوکھے پتے کی چرمراہٹ جیسی آواز ابھری اور سانپ بے حس و حرکت ہو گیا۔ لاتوشا نے فتح مندانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور دم چھوڑ دی لیکن سانپ اسی انداز میں پڑا رہا اگر اس کی لپلپاتی زبان بار بار باہر نہ نکل رہی ہوتی تو میں اسے مردہ سمجھ لیتا۔

''اب یہ کینچوے سے بھی بدتر ہے۔ اس کی ساری ہڈیاں جوڑ سے الگ ہو گئی ہیں۔''

''اچھا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''پھر ایک بار دیکھو۔'' کہتے ہوئے اس نے بانبی کے سوراخ میں پھر ایک پتلی سی شاخ داخل کی۔ ایک اور سانپ نکل آیا۔ اس نے پھر اسی مخصوص انداز میں دم پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ بھی کینچوے میں بدل گیا۔

''اب تم کوشش کرو۔'' کہتے ہوئے اس نے بانبی کو چھیڑا۔ اس بار کئی سانپ پھنکارتے ہوئے نکل آئے۔

تجسس میرے بھی دل میں تھا، آزمانے کے لیے میں نے ایک سانپ کی دم پکڑی۔ دم پکڑتے ہی سانپ نے قلابازی کھائی تھی اور اس کا منہ میرے ہاتھ سے چھ انچ کے فاصلے پر آ گیا تھا۔ گھبرا کر میں نے جھٹکا دیا۔ چرمر کی آواز ابھری اور وہ جھول گیا۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو یارو! میری کہانی اسی جنگل میں ختم ہو جاتی۔ موت کو اتنے نزدیک سے دیکھ کر میرے مساموں نے پسینا اگلنا شروع کر دیا تھا۔

''بہت خوب لیکن پھرتی کی ضرورت ہے۔'' لاتوشا نے کہا۔ ''میں پھر سانپ نکال رہا ہوں۔ اس بار اتنی دیر مت کرنا۔ دُم پکڑتے ہی جھٹکا دے دینا۔''

مجھے سانپ پکڑنے کا شوق تو تھا نہیں پھر بھی میں نے اس کا دل رکھنے کیلئے ہامی بھر لی۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی سانپ نکالے اور میں نے انہیں ناکارہ بنا دیا۔ میری پھرتی دیکھ کر اس نے کہا میتا تم تو مجھ سے بھی آگے نکل گئے ہو۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ مغربی سمت کی جھاڑیوں میں زلزلہ سا آ گیا۔ ہم دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا تھا اور دائیں بائیں اچھل کر ہٹ گئے تھے اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا۔



وہ ایک مست ارنا بھینسا تھا جو ہم دونوں کو سینگوں پر اچھالنے کے لیے آ رہا تھا۔ ہم دونوں کو نشانے سے ہٹتے دیکھ کر وہ پھر پلٹا تھا کہ لاتوشا نے اچھل کر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ بھینسا مجھے چھوڑ کر اس کی جانب لپکا میں نے بھی لاتوشا کی تقلید کی اور پوری قوت سے اس کی پچھلی جانگھ پر گھونسا مارا۔ گھونسا کھاتے ہی وہ پھر پلٹ پڑا۔ لاتوشا نے موقع سے فائدہ اٹھا کر پھر ایک گھونسا جڑ دیا۔ بھینسا پاگل ہوا تھا۔ کبھی میری جانب لپکتا اور کبھی اس کی جانب کیوں کہ ہم دونوں اس کی مزاج پرسی کر رہے تھے کبھی وہ اچھل کر گھونسا مارتا اور کبھی میں۔ اسی درمیان مجھے موقع مل گیا اور میں نے ایک زبردست قسم کا گھونسا اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان دے مارا۔ وہ ڈکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ لاتوشا نے موقع کو غنیمت جان کر اس کے پیٹ پر تابڑ توڑ کئی گھونسے جڑ دیے۔ بھینسا زمین پر گر گیا۔ وہ جاں کنی میں مبتلا تھا کہ میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ کڑکڑاہٹ کی آواز ابھری اور اس کے سارے جوڑ کھل گئے۔

''ارے!'' لاتوشا نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم نے سانپ والا داؤ اس پر آزما لیا میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''

''اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ اگر اسے یوں ہی چھوڑ دیتے تو یہ پیچھا کر سکتا تھا۔''

''چلو اب واپس چلتے ہیں۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

''لیکن یار، کیوں نہ اسے لیتے چلیں۔ اس کا گوشت کافی ذائقے دار ہو گا۔''

''ہم لوگ، ماس نہیں کھاتے۔''

''ارے، گوشت نہیں کھاتے ہو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، ماس کھانے سے دیوتا روٹھ جاتے ہیں، ان کو ناراض کرنے سے تباہی آتی ہے۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

مجھے پتا تھا کہ چٹاگانگ کے جنگلوں میں چکما قبائل آباد ہیں جو بدھ مذہب کے پیرو ہیں لیکن اس دور افتادہ بستی میں بھی بدھ مذہب کا اثر ہے اس پر مجھے تعجب نہیں تھا۔ ماحول کا کچھ نہ کچھ اثر پڑنا ضروری ہے۔ جس طرح برصغیر کے مسلمان ہندو نہ ہوتے ہوئے بھی اہل ہند کے رنگ میں رنگے ہیں۔ شادی بیاہ کی رسمیں ہوں یا تہوار منانے کا طریقہ۔ ماحول نے خاصا اثر ڈالا ہے جب ایک مکمل دین کے ماننے والے ماحول کا اثر قبول کر لیتے ہیں تو یہ بے چارے کس شمار قطار میں ہیں۔ میں اسی نہج پر سوچتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ لاتوشا نے مجھے دھکا دیا۔ میں

لڑکھڑا گیا تھا کہ اس نے مجھے پھرتی سے نیچے لٹا دیا۔ اس حرکت پر میرے اندر کا درندہ جاگ پڑا۔ میں نے لیٹے لیٹے ہاتھ گھما دیا۔ چٹاخ کی آواز ابھری اور اس کے گال پر میری انگلیوں کی چھاپ پڑ گئی لیکن اس نے جوابی حملہ نہیں کیا۔ گال سہلاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''بہت زبردست خطرہ ہے۔ خاموشی سے لیٹے رہو۔''

''کیا کوئی دشمن ہے؟'' میں نے دبے دبے لہجے میں پوچھا۔

''وہ دیکھو، ادھر۔'' اس نے پھر زیرلب سرگوشی کی۔

میں نے اشارے کی سمت نظریں اٹھا دیں۔ اس منظر کو دیکھتے ہی میری حیرت کی انتہا نہیں رہی۔ اتنا عجیب و غریب منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بارہ پندرہ فٹ کا اجگر سانپ سرسراتا ہوا ندی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس اجگر کے جسم کا قطر ایک ڈیڑھ فٹ سے کم نہ ہوگا اور اس کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے سر پر پانچ چھ انچ کا سرخی مائل سینگ تھا جو کبھی دائیں مڑ جاتا اور کبھی بائیں۔ میں اسی سینگ پر نظریں جمائے تھا کہ میرے دماغ کو ایک اور جھٹکا لگا۔ اجگر کچھ اور قریب آ گیا تھا اس لیے سینگ کی ماہیت سمجھ میں آ گئی۔ وہ دراصل سینگ نہیں تھا۔ اجگر کے سر پر ایک اور سانپ کھڑا تھا۔ چھ سات انچ کا وہ سانپ دم کے سہارے سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا رنگ سرخی مائل نہیں گہرا سرخ تھا، خون کی مانند سرخ اور منہ شب تار کی مانند سیاہ تھا۔ میں اس عجیب و غریب مار سوار سانپ کو دیکھ رہا تھا کہ اجگر رک گیا۔ مجھے ایسا لگا گویا اس نے ہم دونوں کے بدن کی بو سونگھ لی ہے۔ سرخ سانپ بھی چرخی کی مانند گھومنے لگا تھا۔

''میتا اس نے ہماری بو پالی ہے۔'' لاتوشا نے کہا۔

''یہ ہے کیا بلا؟'' میں نے لاتوشا کی تقلید میں سرگوشی کی۔

''یہ مونی سرپ ہے۔ سانپوں کا راجہ کہا جاتا ہے اسے۔ یہ اڑ کر پیشانی پر ڈستا ہے۔ اس کا ڈسا پانی تک نہیں مانگتا۔ آپ نے بہولا رانی کا نام سنا ہے۔''

بہولا رانی' یہ کون تھی؟''

''ایک سوداگر تھا۔ نام تھا اس کا چاند و سوداگر۔ وہ شیو بھگوان کا پجاری تھا۔ اس نے سانپوں کی رانی ویشہری کی پوجا سے انکار کر دیا تھا۔ ویشہری نے بطور سزا اس کے چھ بیٹوں کو ڈسوا دیا۔ ساتویں بیٹے لکھن دھر کے بارے میں ویشہری نے کہا تھا کہ وہ اسے سہاگ رات میں ڈسوائے گی۔ لکھن دھر کی شادی بہولا سے ہوئی۔ وہ بہت بڑی ستی ساوتری تھی۔ اس نے



بھی عہد کر لیا کہ ویشہری کو شکست دے گی۔ چاند و سوداگر نے کمرہ عروسی لوہے کا بنوایا تھا۔ اس میں سانپ کے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ راستہ بنانے کے لیے ویشہری نے اسی مونی سرپ کو بھیجا تھا۔ اس نے پھنکا مار کر سوراخ کر دیا تھا جس سے گھس کر چھک ناگ نے لکھن دھر کو ڈسا تھا۔ اس کے منہ میں زہر کا انبار ہوتا ہے۔ جب یہ لوہے کو گلا سکتا ہے تو انسان کی حقیقت کیا ہے''۔

''میرے بھائی قصے کہانیوں پر یقین نہ کرنا۔'' کہنے کو تو کہہ دیا جب کہ میں یہ کہانی کسی ہندو سے سن چکا تھا۔

''یہ کہانی نہیں سچائی ہے۔ اب خاموش رہیں۔ کہیں وہ ہمارے چھپنے کی جگہ کا پتا نہ لگا لے۔''

اس کی بات ختم بھی نہیں ہو پائی تھی کہ مونی سرپ ہوا میں اچھلا اور میری جانب لپکا۔ اسے اپنی جانب اڑتے دیکھ کر میں نے پھرتی سے قلابازی کھائی اور اپنی جگہ سے کئی فٹ دور آ گیا۔ جس جگہ کچھ دیر پہلے میں لیٹا تھا ٹھیک اسی جگہ وہ آ کر گرا تھا اس کے بدن میں بجلی بھری تھی۔ پل بھر میں وہ پھر اچھلا اور میری جانب لپکا۔ میں نے پھر لوٹ لگا دی۔ اس نے گرنے کے ساتھ ہی پھر چھلانگ لگائی۔ میں نے نزدیک پڑے اس تبر کو اٹھا لیا جس سے لاتوشا نے باہنی کھودا تھا۔ سانپ کو اپنی جانب لپکتے دیکھ کر میں نے تبر کو ہوا میں گھما دیا۔ میرا نشانہ سچا تھا۔ سانپ تبر سے ٹکرایا اور پٹ سے زمین پر گرا۔ میں نے اس کی دُم پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میں خود بخود کئی فٹ دور جا گرا۔ مجھے ایسا لگا جیسے چار سو چالیس واٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ میرے تو ہوش اڑ گئے تھے لیکن سوچنے بچارنے کا وقت تھا نہیں، میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سانپ نے پھر جست بھری تھی میرا تبر بھی ساتھ ہی ساتھ گھوم گیا۔ پتا نہیں اس کے جسم میں ایسی کون سی خاصیت تھی۔ وہ تبر کے چمچماتے ہوئے پھل سے ٹکرایا تھا۔ اتنی تیز دھار تھی کہ درخت کا تنا تک ایک ہی وار میں کٹ جاتا لیکن سانپ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ہلکا سا بھی زخم نہیں لگا تھا۔ بلکہ اس کے غیظ و غضب میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ پٹ سے گرنے کے بعد وہ پھر اچھلا تھا کہ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مجھ پر جنون طاری ہو گیا تھا۔ میں نے غصے میں آ کر جہاں گرا تھا وہیں تبر دے مارا۔ میری اسی بھول کا سانپ نے پورا فائدہ اٹھایا اور جست لگا کر میری پیشانی پر وار کر دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے پیشانی کی ہڈی چٹخ گئی ہو اور میرے دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔ پورے جسم میں مرچیں لگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ سنا تھا [illegible] سانپ کے کاٹے [illegible]

[illegible] یہ ہوتا ہے [illegible] ڈوب جاتا ہے لیکن اس کا [illegible] تو مرچیں بھرے [illegible] تھی۔ [illegible] محسوس [illegible] تھیں۔ ساری حسیں سو گئی تھیں۔ اپنے آپ پر [illegible] مجھے [illegible] مجھے کچھ بھی یاد [illegible]

آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو اسی جھگی میں پایا جو میرا مسکن بن چکی تھی۔ میں نے گردن گھمانا چاہی تو میرے سر کو کسی نے پکڑ لیا اور بولا "نہیں، حرکت بالکل نہ کرو۔" میں نے آواز پہچان لی۔ وہ بوڑھے حکیم کی آواز تھی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "سورج دیوتا کا شکر ہے۔ اس نے تمہیں موت کے جبڑے سے کھینچ لیا۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے تمہیں سوم رس پلا دیا تھا ورنہ اس سانپ کا کاٹا کبھی بچتا ہی نہیں۔ تمہارے اندر قوت مدافعت تھی اس نے زہر کو پھیلنے سے روک دیا تھا۔ باقی زہر کو میں نے ناکارہ کر دیا پھر بھی کچھ اثر باقی ہے۔"

"یہ کب تک ختم ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"میں کوشش کر رہا ہوں۔ لو یہ پی لو۔" کہتے ہوئے اس نے بانس کا کھوکھلا ٹکڑا میرے منہ سے لگا دیا۔ اس میں کڑوے کڑوے سیال کا میں نے گھونٹ لیا۔ اسے پیتے ہی مجھے زور کی ابکائی آئی اور میں نے گردن ٹیڑھی کر کے اگل دیا۔ میرے منہ سے نیلا نیلا سیال دھار کی صورت میں نکلنے لگا۔ دو تین ابکائیوں کے بعد میں نے سر ڈھلکا دیا۔ کچھ دیر بعد اس بوڑھے نے مجھے پھر ایک نئے قسم کا سیال پلایا۔ اسے پیتے ہی میرے جسم میں توانائی محسوس ہونے لگی۔

"میں نے تمہیں سوم رس پلا دیا ہے۔ تمہاری قوت میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔"

"اگر کوئی اسے بار بار پیتا رہے تو وہ بہت طاقتور تو ضرور ہو جائے گا۔"

"نہیں اسے ہضم کرنا آسان نہیں ہے۔ پہلے والے کے اثر کو زہر نے کم کر دیا تھا اس لیے دوبارہ پلا دیا ہے۔ اب اگر پھر پلاؤں تو تمہارا دل پھٹ جائے گا، خون کا دباؤ اسے پھاڑ دے گا۔"

بوڑھے کا جواب سن کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے پورے جسم میں گدگدی ہو رہی تھی، عجیب سا ایک احساس [illegible] میں محسوس ہو رہا تھا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہیں



رہی اور میں نے اپنے جسم میں پوری توانائی محسوس کی۔ اس احساس نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "اب کیسا لگ رہا ہے؟"

"بہت اچھا۔ کمزوری تو بالکل نہیں رہی۔"

"ذرا ہاتھ بڑھانا۔"

میں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے میرے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔ تمہارے جسم سے پورا زہر نکل نہیں سکا۔ تم زہر آلود ہو چکے ہو۔ تمہیں احتیاط کرنی ہوگی۔"

"کیسی احتیاط؟" میں نے پوچھا۔

"اپنا جھوٹا کھانا کسی جاندار کو مت کھلانا۔ ناخن ہمیشہ تراشتے رہنا۔ اگر کسی جاندار کے جسم میں تمہارے ناخن پیوست ہو گئے تو وہ مر سکتا ہے۔ یہی خاصیت تمہارے دانتوں میں بھی ہے۔ سب سے زیادہ احتیاط عورت سے کرنا ہے۔ اب کبھی بھول سے اپنی عورت کے پاس نہ جانا۔" بوڑھے نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اف خدا یہ کیا ہوا۔" میں نے اپنا سر تھام لیا۔

"فکر نہ کرو۔ ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اچھائی ہوگی۔" بوڑھے نے ڈھارس بندھائی، مجھے اس کی باتیں زہر لگنے لگی تھیں۔ میں نے اسے غصے سے دھتکارتے ہوئے کہا۔

"تم غلط کہتے ہو۔ میرا خدا کبھی مجھے اتنے بڑے امتحان میں نہیں ڈال سکتا۔"

"میں نے پہلے ہی کہا نا۔ اوپر والے کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ خود سوچو مجھے کیا ضرورت تھی، تمہیں سوم رس پلانے کی؟ اگر تمہیں نہ پلاتا تو تم گمنامی کی موت مر جاتے۔"

"ہاں بڈھا صحیح کہتا ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "ورنہ میں اس دورافتادہ جنگل میں کیوں آتا؟ بڈھے کو مجھ پر رحم کیوں آتا؟ وہ اپنی اس دوا کو جسے بنانے میں ڈھائی سال کا عرصہ لگتا ہے، مجھے کیوں پلاتا۔ ضرور ان سب میں مصلحت پوشیدہ ہے۔" دماغ کی رہنمائی نے وسوسوں کا گلا دبا دیا اور مجھے چین آ گیا۔ میرے چہرے پر رونق بحال ہوتے دیکھ کر بوڑھے نے پوچھا۔

"اب میری ضرورت تو نہیں رہی ہے؟"

"نہیں آپ جا سکتے ہیں، لیکن اتنا تو بتا جائیں کہ میں یہاں تک پہنچا کیسے؟"

''تمہیں لاتو شا اٹھا کر لایا تھا۔''

''اسے سانپ نے کچھ نہیں کہا، حیرت ہے۔''

''اس نے سانپ کو کوئی نقصان تو پہنچایا نہیں تھا۔ پھر وہ سانپ کا منتر بھی پڑھتا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ تمہیں ڈس کر ہٹا لاتو شا تمہیں یہاں تک لے آیا، لیکن بے چارے کے جسم میں بھی زہر اثر کر گیا ہے۔''

''کیسے، اسے تو سانپ نے کچھ کہا نہیں، پھر زہر کیسے اثر کر گیا؟''

''یہ دیکھ رہے ہو۔'' کہتے ہوئے اس نے مجھے تبر اٹھا کر دکھایا وہ تبر کالا ہو رہا تھا ایسا جیسے کسی نے اسے آگ میں ڈال کر نکال لیا ہو۔ ''یہ پوری طرح زہر آلود ہو چکا ہے۔ موئی سرپ نے اس پر منہ مار کر اسے بھی زہر آلود کر دیا۔ اسی تبر سے اس کا ہاتھ اٹھاتے وقت ہلکا سا کٹ گیا تھا۔'' بوڑھے نے کہا۔

'' جب مجھے اس کے ڈسنے سے کچھ نہیں ہوا تو پھر اس کی کھرونچ سے اس پر زہر کیسے اثر کر گیا؟''

''تم نے سوم رس پی رکھا تھا۔''

''تو کیا اس نے کبھی نہیں پیا ہے؟''

''سردار بننے کے بعد سوم رس پلایا جاتا ہے اور اس کا راز سوائے سردار کے کسی کو پتا نہیں ہے ورنہ بغاوت ہو جائے گی۔ ہر کوئی طاقتور بننے کے لیے پینا چاہے گا۔''

''تو کیا سوم رس کا راز کوئی نہیں جانتا؟''

''نہیں میں نے اب تک اپنے بیٹے کو بھی نہیں بتایا ہے۔ اس کے بنانے کا طریقہ ہر وید آخری وقت میں اپنے بیٹے کو بتاتا ہے۔''

''آخر یہ بناتے کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا

''پیڑ پر جب آملہ پکنے لگتا ہے [illegible] پھل میں سونے کے پتلے پتلے تار پیوست کر دیے جاتے ہیں۔ جب پھل پوری طرح زرد ہو جاتا ہے تو اسے توڑ کر ڈھائی سو جڑی بوٹیوں کے ساتھ ملا کر کیلے کی جڑ کے رس میں کھرل کیا جاتا ہے۔ چھ مہینے متواتر کھرل کے بعد اسے [illegible] کے برتن میں رکھ کر چندن کے پیڑ کی جڑ میں دبا دیا جاتا ہے۔''

''یعنی صندل کے؟''

''ہاں۔ ایک سال کے بعد وہ نعوذ [illegible] سوم رس بن جاتا ہے۔''



''میرے خیال سے چیون پراش بھی ایسے ہی بنتا ہے۔''

''چیون پراش کے بارے میں تم جانتے ہو۔''

''آریوویدک طریقہ علاج کی مشہور دوا ہے۔ کہتے ہیں کوئی رشی تھا جس کا نام چیون تھا۔ اس کی ڈھائی سو بیویاں تھیں۔ وہ اپنے قویٰ قائم رکھنے کے لیے جو پراش یعنی اعوق بنا کر کھاتا تھا اور اسے ہی چیون پراش کہتے ہیں۔''

''میں وہ بھی بنانا جانتا ہوں لیکن اس سے بھی ہزار گنا فائدہ مند سوم رس ہے۔ اسے دیوتا پیا کرتے تھے۔''

''میں کسی دیوتا شیوتا پر یقین نہیں رکھتا لیکن تمہاری دوا ہے فائدے مند۔''

''شکریہ، میری محنت کا لوہا باہر کے کسی فرد نے مانا۔'' بوڑھے طبیب نے خوش ہو کر کہا۔

''مجھے اور کتنے دن آرام کرنے کی ضرورت ہے؟''

''کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیا میں لمبا سفر کر سکتا ہوں؟''

گھر جانا چاہتے ہو؟''

''ہاں!''

''جا سکتے ہو لیکن میں ایک دوا ساتھ دے دوں گا۔ جب کمزوری محسوس ہو اسے کھا لینا۔ توانائی بحال کر دے گی۔''

پیشگی شکریہ۔ سردار کو بھی خبر کر دیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب لوٹا تو اس کے ساتھ سردار لاتو شا اور لاشا تھی۔ سردار نے مجھے کورنش کرتے ہوئے پوچھا۔

''واقعی تم جا رہے ہو بیتا؟''

''جی ہاں۔ مجھے برے آدمیوں سے دو دو ہاتھ کرنا ہیں۔''

''سورج بھگوان تمہاری مدد کرے۔'' اس نے دعائیہ انداز میں کہا۔

''بیتا، اگر میری طبیعت صحیح ہوتی تو میں تمہیں چار پہاڑ پار کرا دیتا لیکن کیا کروں۔ زہر کا اثر ابھی باقی ہے۔'' لاتو شا نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ اگر زندگی رہی تو میں پھر آؤں گا۔'' میں نے کہا۔

"ہم چشم براہ ہیں۔ ضرور آنا۔"

"لاشا، میری بہن، تو مجھے بہت یاد آئے گی۔" اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے کہا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں نمی نظر آ گئی تھی۔ میں اس کی نظروں کی چبھن برداشت نہ کر سکا اور باہر نکل آیا۔

"سورج بھگوان کے ساتھ ساتھ چلتے رہنا۔ اِدھر اُدھر مت بھٹکنا۔ سیدھے پ[illegible] رام پہنچ جاؤ گے۔" سردار نے کہا۔

میں نے مغرب کی سمت قدم بڑھا دیے۔ دو دن اور دو رات متواتر چلتے چلتے پاؤں سوج گئے تھے لیکن میں کہیں بھی رکا نہیں تھا۔ چلتے وقت سردار نے جو کھانے کا سامان دیا تھا۔ کھانے کے لیے گھڑی بھر کسی تالاب کے پاس بیٹھ جاتا اور پھر چل پڑتا۔ تیسری صبح مجھے رانگاما[illegible] کے مکانات نظر آئے تھے۔ لکڑی کے موٹے موٹے کھمبوں پر کھڑے ٹین کی چادروں سے بنے ہوئے مکانات دیکھ کر میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا تھا۔ گرتا پڑتا میں ایک مکان کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر اندر سے کئی آدمی نکل آئے تھے۔ میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر ایک نے پوچھا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"اراکان سے۔ شکار کرنے گیا تھا، لیکن ہاتھیوں نے جیپ الٹ دی۔ سارے ساتھی مارے گئے۔ میں کسی طرح بچ کر پیدل چلا آ رہا ہوں۔"

"اراکان سے آ رہے ہو۔ بھئی یقین نہیں آتا۔ آؤ اندر آ جاؤ۔" کہتے ہوئے اس نے مجھے سہارا دیا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے کہا۔

"اگر تھوڑا سا گرم پانی لا دیں تو مہربانی ہوگی۔ راستے میں کانٹے وغیرہ متواتر چبھتے رہے ہیں پیر سوج گیا ہے ورم آ گیا ہے۔"

"ابھی لو۔" کہتے ہوئے وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد جب لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک تسلا تھا۔ ایک دوسرے آدمی نے دیگچی اٹھا رکھی تھی۔ تسلے میں پانی بھر کر میں نے اس میں پیر ڈال دیا۔ آہستہ آہستہ پاؤں کی سوزش کم ہونے لگی۔

میں نے ایک گلاس پانی مانگا۔ پانی آتے ہی [illegible] کی دی ہوئی دوا کھائی۔ تھکن پل بھر میں دور ہو گئی۔ رگوں میں تازگی محسوس ہونے لگی۔

"میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے استدعا کی۔



"ضرور، ضرور، آپ آرام کریں۔" کہتے ہوئے وہ سب باہر نکل گئے۔ [illegible] میں بے خبر سو گیا۔ جب نیند ٹوٹی تو شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ [illegible] میں نے [illegible] کیفیت جاتی جا رہی تھی لیکن ہلکی سی [illegible] ابھی تھی۔ [illegible] چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا [illegible] کمرے کی جانب بڑھا جدھر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کمرے میں قدم رکھتے ہی میں چونک اٹھا۔

مجھے میرے [illegible] کے درمیان ایک جانا پہچانا سا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اس چہرے کو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا [illegible] خنزیر نے مجھے بند کر دیا تھا۔ اس [illegible] کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔

"تم، تم زندہ ہو؟" اس نے کہا۔

"خنزیر کی اولاد، تمہارا خون پیے بغیر میں کیسے مر جاتا۔" [illegible] جواب دیا۔

"[illegible] پکڑو اور رسے سے باندھ دو۔ یہ وہی کتا ہے [illegible]" اس کا [illegible] نے دھاڑتے ہوئے حکم دیا۔

مجھے مہمان ٹھہرانے والے تینوں میری جانب بڑھے۔

"اچھا تو تم لوگ بھی اس خنزیر کے غلام ہو۔"

"چپ [illegible] تو آنتیں باہر نکال دوں گا۔" [illegible] اچانک [illegible] چپ [illegible] لیکن میں نے [illegible] آواز ابھری تھی [illegible]

"[illegible] یہ تو کیا کام ہے اب کوئی تم میں سے [illegible] شاید اسے کامیابی [illegible]"

[illegible] چڑھانے پر تینوں نے ایک ساتھ [illegible] [illegible] آپس میں الجھ کر [illegible] [illegible] میں پوری قوت سے [illegible] میری [illegible] نہیں [illegible] اپنی جگہ کھڑا [illegible]

[illegible] ایک ساتھ [illegible] مجھے [illegible]

ساتھیوں کو حکم دیا وہ تینوں، تین جانب رکوع کے انداز میں جھک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ شاید وہ نیا داؤ آزمانا چاہتے تھے ان کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں جبکہ مجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا یہ کمال ہے سوم رس کا جس نے میرے جسم کو قوت کا سرچشمہ بنا رکھا ہے۔ میں اپنی جگہ کھڑا ان پر عقابی نگاہیں ٹکائے تھا۔ وہ تینوں غضب ناک نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے انہیں شاید اپنی قوت بازو پر بہت بھروسا تھا اور غالباً تعداد کا گھمنڈ بھی تھا۔ تبھی انہوں نے ہتھیار نکالنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ وہ تینوں میرے بہت قریب آ گئے تھے۔ مجھے اسی وقت کا انتظار تھا۔ میں نے لپک کر بجلی جیسی پھرتی سے ایک کے دونوں ہاتھوں کو پکڑا اور اسے اٹھا کر چرخی کی طرح گھوم گیا ان میں سے کسی کو بھی ایسی کسی کارروائی کی توقع نہیں تھی، لہٰذا وہ میرے شکار کے گھومتے ہوئے پیروں سے ٹکرا ٹکرا کر گرنے لگے۔ دونوں کو زمین بوس کرنے کے بعد میں نے مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ کڑ کڑ کی آواز ابھری اور وہ مرتے ہوئے بیل کی طرح ڈکرانے لگا۔ اسے فوراً میں نے چوتھے شخص کی طرف یوں پھینکا جیسے وہ انسان نہیں کوئی وزنی اور بڑا سا پتھر ہے۔ اسے بھی ایسی کسی کارروائی کی توقع نہیں تھی وہ اس سے الجھ کر گر پڑا تب تک وہ دونوں جو پہلے گرے تھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں موقع دینا مناسب نہیں سمجھا اور ہوا میں اڑتا ہوا ایک شخص کے سینے پر فلائنگ کک لگا کر اسے چت گرا دیا اور دوسرے کی ٹخنوں پر میں نے ٹانگ ماری دی وہ اچھل کر نیچے جا پڑا اس کے ساتھ ہی میں نے چوتھے آدمی پر چھلانگ لگا دی اور اسے لیے ہوئے نیچے گر گیا تھا لیکن میرا مقابل خاصا جاندار تھا۔ اس نے نیچے گرتے ہوئے ہی مجھے اپنے اوپر سے الٹ کر پیچھے پھینک دیا تھا۔ میں تیزی سے پلٹ کر کھڑا ہو گیا اتنی دیر میں وہ بھی اٹھ چکا تھا، میرے اٹھتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی میں چونکہ ابھی پوری طرح سنبھل نہیں سکا تھا اس لیے اس کا یہ حملہ کارگر رہا اور وہ مجھے دبوچ کر دونوں ہاتھوں پر اٹھانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مجھے دونوں ہاتھوں پر سر سے اونچا اٹھا کر کئی چکر دیے اور پھر پورے زور سے سامنے والے شجر پر پھینک مارنا چاہتا تھا کہ اتفاقاً اس کے بال میرے ہاتھوں میں آ گئے اور میں نے بالوں کو مٹھی میں پکڑ کر جھٹکا دیا۔ جھٹکا پوری قوت سے نہیں دیا تھا لیکن نتیجہ حوصلہ افزا تھا۔ اس کے سر کے بال جڑ سے چمڑے کے ساتھ اکھڑ کر میرے ہاتھوں میں آ گئے۔ وہ بلبلانے لگا تھا کہ میں نے جکڑ کر زور پکڑا اپنے جسم کو پل بھر میں دہرا کیا اور ہوا میں قلابازی لگا دی اس بدذات کی جکڑ سے نکلتے ہی میں نے دوسرے کی ٹانگ پکڑی اور مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ اس کے تینوں جوڑ کھل گئے اور



وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح لوٹنے لگا اسے چھوڑ کر میں تیسرے کی جانب لپکا اور پلک جھپکتے ہی اس کی ٹانگوں کو بھی ناکارہ بنا دیا۔ تینوں سے فرصت پا کر میں پہلے والے کی جانب لپکا۔ وہ سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کے نزدیک جاتے ہی میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کر الٹ گیا۔

''بول، جلدی بول، فریدہ کہاں ہے۔''

''وہ، کریم گنج کے ایک بنگلے میں قید ہے۔''

''چل اٹھ ورنہ ابھی تجھے زندگی بھر کے لیے معذور بنا دوں گا۔''

''ان کا کیا ہوگا؟'' اس نے پوچھا۔

''وطن کے دشمنوں پر میں رحم نہیں کرتا۔ ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے سماج کو گندا کر رہے ہیں یہ۔ ان کی یہی سزا ہے کہ یہ یہاں پڑے سسکتے رہیں۔ تم چلو، باہر نکلو۔'' کہتے ہوئے میں نے اسے دھکا دیا۔

اس مکان سے باہر نکلتے ہی میری ساری حسیں بیدار ہوگئیں۔ مجھے احساس تھا، چوہے کی طرح پٹ جانے والا، بھری پُری سڑک پر کوئی بھی ہنگامہ کر سکتا تھا۔ سنسان جگہ پر کسی کے ساتھ کوئی بھی برتاؤ کیا جا سکتا ہے لیکن انسانوں کے سمندر میں ساری بہادری دھری رہ جاتی ہے۔ پھر بال اکھڑ جانے کی وجہ سے اس کا چہرا بھی عجیب سا ہو گیا تھا۔ میں نے پاکٹ سے رومال نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے لپیٹ لے سر پر ورنہ بچے چپت ماریں گے۔''

اس نے سدھے ہوئے کتے کی طرح میری بات مان لی۔ ہم دونوں ایک سائیکل رکشا پر سوار ہو کر کریم گنج کی طرف چل پڑے۔ کچھ دور جانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

''وہاں کتنے آدمی ہوں گے؟''

''دو، صرف دو آدمی پہرا دے رہے ہیں۔''

''اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تیری جان لے لوں گا۔''

''نہیں خان، وہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ جو لوگ پہرے پر ہیں وہ بھی بس ایسے ہی ہیں۔ لڑنے بھڑنے والے بندے نہیں ہیں۔''

''دو کیا دس بھی ہوں تو مجھے پروا نہیں ہے۔ میرا اللہ میرا محافظ ہے۔ میں تم جیسا گھناؤنا کام نہیں کرتا۔ میں جہاد کر رہا ہوں۔ وطن کی حفاظت کے لیے جہاد اور خدا اس کام میں میرا مددگار ہے۔ سمجھے خبیث!'' اس نے جواب نہیں دیا اور خاموشی سے انگلیوں کو مروڑنے لگا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ذہنی خلجان میں مبتلا ہو۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔ اور دل ہی دل
میں حالات کی ستم ظریفی کو کوسنے لگا۔ میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے حالات پر غور کررہا تھا
ذہن میں خطرے نے سر ابھارا۔ آتے وقت جن تین آدمیوں کو ناکارہ بنا کر آیا تھا، ان میں سے
دو بے شک ہل جل نہیں سکتے تھے لیکن تیسرا تو وہاں سے نکل سکتا تھا اگر اس نے کسی تیز رفتار
سواری کا انتظام کرلیا تو میرے لیے پریشانیاں کھڑی ہوجائیں گی۔ میں تو شیر کے بھٹ میں
چھلانگ لگانے نکل پڑا تھا صرف اس امید پر کہ وہاں سب بے خبر ہوں گے لیکن اگر انہیں پتہ
لگ گیا تو وہ استقبال کی پوری تیاری کرلیں گے۔ ذہن میں سرسراتے وسوسے نے مجھے سوال
کرنے پر مجبور کردیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اوئے کیا نام ہے تیرا۔''

''شرافت شیخ!''

''غلط، تیرا نام ذلالت شیخ ہونا چاہیے تھا۔''

اس نے جوب نہیں دیا تو میں نے پھر پوچھا۔ ''تو میاں شرافت یہ بتاؤ وہاں موٹر
بائیک کار بھی تو ہے جہاں سے ہم آرہے ہیں۔''

''نہیں جی، صرف دو سائیکل ہیں۔''

''نہیں جی۔'' میں نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔ ''اگر تیز رفتاری سے وہ چاہے تو مجھ
سے پہلے پہنچ سکتا ہے۔ سائیکل تیز رفتار ہوتی ہے۔'' پھر میں نے خدشے کو ذہن سے جھٹک دیا
اس کا پنجہ اکھڑ چکا ہے۔ ایک ہاتھ سے بیلنس قائم رکھتے ہوئے سفر کرنا آسان نہیں ہے جبکہ
دوسرے ہاتھ میں تکلیف ہو، کوئی کتنا بڑا ہی ایکسپرٹ کیوں نہ ہو۔ سائیکل کے اچھلنے سے پیدا
ہونے والی تکلیف کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

''وہ جس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا اس کا کیا نام ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کالو۔''

''کالو سائیکل چلا سکتا ہے؟''

''نہیں۔''

اس کے جواب نے مجھے مطمئن کردیا اور میں آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کرنے لگا۔
میری یکسوئی شرافت کی آواز پر تار تار ہوگئی۔ وہ رکشا والے کو ایک گھر کے سامنے رکوا چکا تھا۔

''چل اوئے! رکشا والے کو پیسے دے دے۔'' میں نے حکم دیا۔

شرافت شیخ نے شرافت سے پیسے نکال کر دے دیے اور آگے بڑھ گیا۔ اس کے



پیچھے پیچھے میں بھی اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایسا
لگتا تھا جیسے میرے دائیں کندھے پر پہاڑ کی چٹان ٹوٹ کر گر پڑی ہو، چوٹ اتنی زبردست تھی
کہ میں کھڑا نہ رہ سکا اور بیٹھتا چلا گیا۔

کوئی پہلے سے دروازے کی آڑ میں کھڑا تھا جس نے کسی وزنی چیز سے وار کیا تھا
چوٹ کھاتے ہی میں دُم ٹوٹے سانپ کی طرح پھرتی سے اس پر جا پڑا تھا۔ میں نے اندازے
سے چھلانگ لگائی تھی پھر بھی کامیابی نے قدم چوم لیے۔ اس شخص کی گردن میرے شکنجے میں
آگئی میں نے اپنے سر سے اس کے سر کو ٹکرا دیا۔ بھٹ کی آواز کے ساتھ میری پیشانی پر
چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ مری ہوئی چھپکلی کی طرح پٹ سے گر گیا۔

''سالے، تُو نے مار دیا۔'' کسی نے پیچھے سے میری کمر پر لات مارتے ہوئے کہا،
میں ڈگمگا گیا تھا۔

''اب تُو بھی اس کے پاس پہنچ جا۔'' کہتے ہوئے میں نے پوری قوت سے ہاتھ گھما
دیا۔ میرا ہاتھ بھاری ہتھوڑے کی طرح اس کی گردن پر پڑا۔ کٹ کی آواز ہوئی اور وہ بھی پٹ
سے گر گیا۔

''سب مل کر گھیرو۔'' کسی کی للکار سنائی دی۔ میں تو پہلے ہی ہوشیار تھا فوراً لمبی
چھلانگ لگا کر کمرے کے وسط میں جا پہنچا۔ ''آؤ آؤ'' کہتے ہوئے میں نے للکارا۔

کمرے میں دس بارہ آدمی تھے۔ ان میں ایک شناسا سا چہرا تھا۔ وہی کالو جس کی کلائی
کا جوڑ کھول ڈالا تھا، وہ ٹوٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ سب کو ہوشیار کرکے
مورچہ بند ہوجانے پر تیار کردیا تھا۔ اس کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''کیوں بیٹے،
ایک ہاتھ گنوا کر بھی چین نہیں ملا۔ اس بار پیر کھلوانے آئے ہو۔''

''اپنی زندگی کی خیر مناؤ۔'' کہتے ہوئے ایک آدمی نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اسے
ہاتھ پر سنبھال کر میں نے ہوا میں اچھال دیا لیکن اسے زمین پر گرنے سے پہلے ہی روک لیا۔
میری طاقت کا یہ مظاہرہ انہیں حیران نہ کرسکا اور کئی آدمی بیک وقت لپکے۔ میں نے پھرتی سے
اسے زمین پر گرا دیا اور اس کے پیر کو پکڑ کر مگدر کی طرح گھمانے لگا۔ میری طرف بڑھنے والے
اس کے گردش کرتے جسم سے الجھ الجھ کر گرتے چلے گئے۔ اس کا جسم گرز کی طرح ان سے ٹکرایا
تھا۔ کسی کا سر پھٹا تو کوئی بازو اتروا کر پڑا کراہ رہا تھا۔ میں نے مخصوص انداز میں جھٹکا دے کر
اس کے پیر کے جوڑ اکھاڑ دیے اور پھر اسے کالو کی طرف اچھال دیا۔ اس سے فرصت پا کر میں

ان سب کی طرف لپکا جو ایک جانب کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور فوراً دوسرے کی طرف لپکا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے دروازے کے قریب پڑا ڈھانسا اٹھا لیا۔ دروازے میں لگانے والی موٹی لکڑی کو دیکھتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ اسی ڈھانسے سے میرے کندھے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ میں نے ڈھانسے کی پروانہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی اس نے ڈھانسا گھما تو دیا تھا لیکن میری چال نے اسے ناکام بنا دیا تھا کیوں کہ میں نے راستے میں ہی اپنے آپ کو روک لیا تھا نتیجتاً وہ اپنے ہی زور میں پھرکی کی طرح گھوم گیا تھا۔ اس قلیل وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں گھونسا مارا میرے ایک ہی گھونسے نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ وہ پیٹ پکڑ کر ڈکارنے لگا تھا لیکن میں نے اس کی جانب توجہ نہیں دی اور دوسرے کی جانب گھوم گیا۔ وہ شاید ازلی بزدل تھا۔ اس طرح تھر تھر کانپنے لگا تھا جیسے اسے سردی لگنے لگی ہو۔ میرے پاس ترس کھانے کا وقت نہیں تھا اس لیے اس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''فٹافٹ بتاؤ فریدہ کو کہاں رکھا ہے؟''

''کون فریدہ؟'' اس نے انجان بن کر پوچھا

''لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، ٹھہرا ابھی بتاتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر طمانچہ گھما دیا۔ چٹاخ کی آواز کے ساتھ ہی میری گرجدار آواز گونجی۔

''اب یاد آیا؟''

میرا طمانچہ کچھ زیادہ ہی زوردار تھا۔ ہونٹ پھٹ کر خون آلود ہو گئے۔ وہ خون تھوک کر مجھے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ اس کے انداز نے مجھے مزید بھڑکا دیا، میں نے دوسرے گال پر طمانچہ دے مارا۔ ''بول، جلدی بول کہاں رکھا ہے اسے؟''

''وہ چٹیا گاؤں میں ہے''۔

''کس علاقے میں؟''

''حالی شہر۔ اسے حالی شہر کالونی میں رکھا گیا ہے۔''

''پھر یہ مجھے یہاں کیوں لے آیا؟''

''یہ ہمارا ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہ تمہیں پھنسانے لایا تھا۔ سیٹھ نے تم پر انعام رکھا ہے۔ پورے دس ہزار روپے۔''

''تیرا سیٹھ ہے کہاں؟''



''حالی شہر میں۔''

''چل مجھے لے چل۔''

''نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ وہ میرے پورے خاندان کو پھانسی پر لٹکا دے گا۔''

''ایسا کر مجھے دور سے وہ مکان دکھا دے۔''

''یہ لوگ بتا دیں گے۔'' اس نے اپنے ساتھیوں کی جانب اشارہ کیا۔

''یہ سب بے ہوش ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سالے اگر باہر قدم نکالا تو قبر سے بھی اکھاڑ لاؤں گا۔'' جس کی میں نے کہنی کا جوڑ اکھاڑا تھا۔ وہ بول پڑا۔

''تو نے خود اپنی تباہی کو آواز دی ہے، اگر خاموش رہ جاتا تو میں تجھے معاف کر دیتا لیکن اب نہیں''۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ بھی غضب کا پھرتیلا اور جی دار تھا۔ ایک ہاتھ سے مجھے روک کر اس نے میرا گلا پکڑ لیا۔ اس کا فولادی پنجہ میرے نرخرے کو دبائے دے رہا تھا کہ میں نے جھٹکا دیا۔ پنجے سے تو چھوٹ گیا لیکن نئی مصیبت گلے پڑ گئی۔ ہاں وہ مصیبت میرے گلے ہی پر پڑی تھی۔ اس حرام خور نے میرے گلے کو دونوں پیروں میں جکڑ لیا تھا۔ میرا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ زچ ہو کر میں نے عورتوں والا حربہ آزما دیا۔ اپنے بتیس دانت اس کی پنڈلی میں گاڑ دیے۔ میرا یہ حربہ کام کر گیا۔ اس کی جکڑ ڈھیلی پڑ گئی اور میں اچھل کر دور ہٹ گیا سانسیں درست کرنے کے بعد اس کی جانب پھر لپکا ہی تھا کہ حیرت نے میرے قدموں کو جکڑ لیا اس پر جاں کنی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور منہ سے نیلا نیلا لعاب نکل رہا تھا گویا زہریلے ناگ نے ڈس لیا ہو۔ ایک دم میرے ذہن میں جنگلی بوڑھے کے الفاظ گونجے۔ ''تو انسانی شکل میں زہریلا سانپ بن گیا ہے۔''

''چلیے باہر چلیے۔'' کالو نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو حالی شہر پہنچا دوں گا۔'' اس کے ساتھ میں باہر نکل آیا۔ کچھ دور جاتے ہی ایک آٹو رکشا نظر آیا اسے روک کر ہم دونوں بیٹھ گئے۔

آٹو رکشا پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تیز میرا ذہن دوڑ رہا تھا۔ فریدہ کی بے بسی پر میرا دل رو رہا تھا۔ بے چاری خواہ مخواہ جال میں جا گری۔ اسے باہر نکالنے کی میں جتنی کوشش کر رہا تھا اب تک سب لاحاصل ہو رہی تھی۔

''صاحب وہ والی بلڈنگ ہے۔'' کلو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''تم جاؤ گے؟'' میں نے آٹو رکشا سے نیچے قدم رکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں!'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

تم یہیں رہنا۔'' کہتے ہوئے میں نے قدم بڑھا دیے۔

عمارت کے بڑے دروازے پر میں نے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ کمپاؤنڈ میں قدم رکھتے ہی میں نے تیز نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ کیاریوں میں خوش رنگ پھول کھلے تھے۔ گیٹ سے کچھ ہٹ کر آم اور کٹھل کے پیڑ تھے چھوٹے چھوٹے کٹھل شاخوں سے لٹکے ہوئے تھے۔ آم کے پیڑ پر بور آ گیا تھا۔ ننھے ننھے سفید پھول بہت بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے ایک نظر میں پوری عمارت کا جائزہ لے لیا تھا۔ اندر داخل ہونے کا فقط ایک ہی راستہ تھا اور وہ شیشم کی لکڑی سے بنا مضبوط دروازہ تھا۔ میں بے خوف ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ پہلی دستک میں ہی دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولا تھا ایک نوجوان نے، چہرے سے وہ بھی طالب علم نظر آ رہا تھا۔ دروازہ کھول کر وہ ایک جانب ہٹ گیا۔

میں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ گو عمارت قدیم وضع کی تھی لیکن اندر سے نہایت آراستہ اور مزین تھی۔ چھت اور دیواروں پر نفیس رنگ و روغن کیا ہوا تھا۔ راہداری پار کر کے میں اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جس سے تیز تیز باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ اندر پانچ نوجوان بیٹھے تھے اور ایک شخص دروازے کی طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ قد کاٹھ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ سنیال ہے۔ فوراً تائید بھی ہو گئی۔ وہ مڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک نقشہ تھا۔ مشرقی پاکستان کا نقشہ، وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسے میرا سایہ نظر آ گیا۔

''کون ہے وہاں؟'' اس نے پوچھا

''میں ہوں' تمہاری موت۔'' میں نے کہا اور اس کے سامنے چلا گیا۔

''بہت جان ہے اب تک زندہ ہو۔''

''موت کو بھی موت آتی ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا

میرے جواب نے اس کے چہرے پر غصے کی جھلک پیدا کر دی تھی لیکن اس نے فوراً اپنے آپ پر قابو پا لیا اور مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا بولا ''جب آ گئے ہو تو ان سے بھی مل لو۔ یہ سراج ہے ہمارے پروپیگنڈا سیکشن کا انچارج قلم کا دھنی۔ لوگ کہتے ہیں اس کے قلم سے ارسطو کا



فلسفہ، کنفیوشس کا تجزیہ، مارکس کا علم اور منصور کا جذبہ روشنائی بن کر نکلتا ہے۔ اس کے مضامین تم نے بھی پڑھے ہوں گے۔ اس کو نکھارنے کے لیے میں نے دو سال تک کلکتہ میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا فن ہمارے مشن کو چار چاند لگا رہا ہے۔ اسلام اسلام کی رٹ لگانے والے بھی اس کے نظریے کی تائید کرنے لگے ہیں اور یہ سبھاش دت عرف عین الحق مولوی عین الحق۔ سال کے بارہ مہینے چلے کرتا ہے۔ تبلیغی جماعت کے ساتھ نگر نگر گھوم کر لوگوں کو راہِ حق کی ہدایت دیتا ہے۔ میرے مشن کے روحِ رواں نوجوانوں میں سے ایک ہے۔ تبلیغی دورے کے دوران مختلف مسجدوں میں فنِ خطابت کا بھی کمال دکھاتا ہے بیس سال سے تم مغربی پاکستانیوں نے جو زنجیریں ڈال رکھی ہیں یہاں والوں کی نظر میں اسے یہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور یہ ہے رتن سرکار، مقامی اخبار کا مدیر اور سراج کا دست راست۔ اپنے اخبار کے ذریعے ہزاروں میل دور اسلام آباد میں بیٹھ کر حکم چلانے والوں کے چہرے ننگے کر رہا ہے اور.......''

''واہ، تم نے تو نادر ہیرے جمع کر رکھے ہیں۔'' اس کی بات کو کاٹتے ہوئے طنزیہ انداز میں مَیں نے کہا۔ ''ضرور باقی دونوں بھی کلکتہ کے پاس کیے ہوئے ہیں۔''

''باقی دونوں ہی نہیں میرے سارے ہیروں کی تراش خراش کلکتے میں ہوئی ہے۔ میرے کئی محسن وہاں ہیں جو میرے مشن کو آگے بڑھانے میں پوری مدد دے رہے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بدلے میں تم انہیں کیا دے رہے ہو؟'' میں نے پوچھا

''ہمارے پاس ہے ہی کیا؟ وشو کوی رابندر ناتھ ٹیگور کے سونار بنگلہ، مہان کوی جیون آنند کے روپشی بنگلہ، ویدرہی کوی نذرالاسلام کے بنگلہ دیش کو تو تم لوگوں نے خالی ڈبا بنا دیا ہے۔ پٹ سن ہم پیدا کرتے ہیں مال تم کماتے ہو، ہمارے پاس بچا ہی کیا ہے؟ ایسے نازک موقع پر عورتوں نے اپنی گود بڑھا دی ہے۔ بدلے میں ہم لڑکیاں بھیج دیتے ہیں۔''

''واہ بہت خوب۔ اچھے بہی خواہ ہو۔ اپنی عزت کا سودا کر رہے ہو اور دعویٰ ہے سرزمین کی خدمت کا۔''

''لڑکیاں ہم اپنے دشمنوں کو بھیجتے ہیں۔ یہاں کے ذلیل لوگ تو ہمارے غلام ہوا کرتے تھے ان کی آنکھیں تم نے کھلوائی ہیں۔ پاکستان بنا کر انہیں سر پر چڑھا لیا ہے۔ ان کی اوقات بتا دینا ہمارا فرض ہے۔''

''سن رہے ہو سراج!'' میں نے اس کے پروپیگنڈہ سیکرٹری کو مخاطب کیا۔ ''تم

سب اس کے جوتے کی خاک ہو۔''

''یہ غلط تو نہیں کہہ رہا ہے۔ یہ بھی تم نے سکھائی ہے۔ تمہارے مغربی پاکستان
ایسا نہیں ہو رہا ہے کیا، پنجاب کے جاگیردار اپنے مزارعوں کو اپنا غلام نہیں سمجھتے ہیں، کیا
میں آج بھی پشتینی غلام نہیں ہیں، کیا بلوچستان زرخرید غلاموں سے خالی ہو گیا ہے؟ کیا سند
کے وڈیرے بھی ہاریوں کی عزت سے نہیں کھیلتے ہیں؟ کیا انہوں نے یہ قانون نہیں بنا رکھا
کہ سوائے وڈیروں کی عورتوں کے کسی کی عورتیں پردے دار سواریوں میں نہیں جا تیں۔
جواب دو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' سراج نے تقریر کے انداز میں کہا۔

''کیا صحیح ہے اور کیا غلط، میں نہیں جانتا کیوں کہ میرا بچپن سرحد کے ایک دور افتا
گاؤں میں گزرا ہے اور جوانی ڈھاکے میں گزر رہی ہے۔ اس لیے میرا علم محدود ہے۔'' میں
اعتراف کیا۔

''چھوڑو ان باتوں کو۔ کہو کیسے آئے۔ فریدہ کو آزاد کرانے آئے ہو لیکن کیا
جائے۔ تمہارے آنے میں دیر ہو گئی میں نے آج صبح ہی ہلی بارڈر سے اسے کلکتہ بھیج دیا ہے کا
تک وہ کلکتہ پہنچ جائے گی۔''

''حرامزادے میں تیرا خون پی جاؤں گا۔'' غم و غصے سے میں ابل پڑا۔

''تم سب ویمپائر ہو، خون پینا تو تمہاری خصلت ہے۔ جتنے بھی مسلمان ہیں، م
سب کو ویمپائر کہتا ہوں، ہمارے بھگوان تک کو کھا جانے والے عفریت ہیں مسلمان۔ کبھی محم
غزنوی بن کے خون پیتے ہیں کبھی اورنگزیب بن کے۔ اس کا بدلہ میں ایک ایک مسلمان
لوں گا۔ پہلے تم سے تو ملک آزاد کرا لوں۔''

''تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔'' کہتے ہوئے میں نے اس کی جانب قد
بڑھایا۔

''بہت جان ہے۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور پھر اپنے ساتھیوں
بولا۔ ''کچھ خاطر داری ڈھاکا میں ہوئی تھی اور باقی تم کر دو۔''

وہ سب مجھے گھیرنے کے لیے آگے بڑھے۔ ان کے انداز نے بتا دیا کہ وہ لوگ
جنگ و جدل کے میدان میں کورے ہیں ان کی نادانی کا میں نے فوراً فائدہ اٹھا لیا۔ سا
والے کے گلے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیتے ہوئے دوسرے کا کالر پکڑ کر کھینچا اور تیسرے کے پیٹ
پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔ میرے چاروں اعضا یعنی دونوں ہاتھ دونوں پیر یکساں رفتار سے چل



رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب زمین بوس ہو گئے۔ ان سے نمٹ کر میں نے دیکھا تو میرا
اصل شکار غائب تھا۔ بازی پلٹتے دیکھ کر وہ فرار ہو گیا تھا۔ اس بھگوڑے کا غصہ اتارنے کے لیے
میں نے زخموں سے چُور چاروں غدار وطن کے ہاتھوں اور پیروں کو مخصوص انداز میں جھٹکا دے
کر جوڑ جوڑ کھول دیے اور پھر باہر نکل آیا۔ اس وقت میرا غصہ ساتویں آسمان پر تھا۔ دل چاہ رہا
تھا کہ پورے شہر کو اجاڑ دوں ایک ایک شخص کے جوڑ کھول دوں۔ سب کو اپاہج بنا دوں، معصوم
فریدہ اور اس کے بچے کا بدلہ ہر ہندو سے لوں لیکن میں نے غصے کی آگ پر عقل کا پانی چھڑک
کر بھڑکتے شعلوں کو سرد کر دیا اور ٹھنڈے دماغ سے اسے پھر سے ڈھونڈنے کے لیے راہیں
تلاش کرنے لگا۔ یکایک مجھے کلو کا خیال آیا۔ وہ تو کنائی کے گینگ کا ہے اسے ضرور معلوم ہوگا
کہ کنائی سنیال کہاں چھپ سکتا ہے۔ اسے ڈھونڈنے باہر نکلا تھا کہ دروازے پر پولیس کے
سپاہی نظر آئے ان کے عقب میں ایک ایس آئی بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پستول نکال کر
کہا۔ ''ہینڈز اپ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔'' قانون کی پاسداری کرنا ہر محب وطن کا فرض ہے میں نے بھی
قانون کے نام پر ہاتھ اٹھا دیے۔ محتاط انداز میں مجھے زد پر لیے گروہ سب آگے بڑھنے لگے ان
کے تیور خطرناک تھے پھر بھی میں اپنی جگہ ساکت تھا۔ وردی کا پاس کرنا میری فطرت میں شامل
تھا اسی لیے خاموش تھا۔ ایس آئی نے نزدیک پہنچتے ہی پستول کی نال سے دھکیلتے ہوئے کہا۔
''چلو اندر چلو۔''

میں چون و چرا کیے بغیر اندر مڑ گیا۔ گلیارے کو پار کرتے ہی اس نے کھلے ہوئے
دروازے میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ میں جانتا تھا اندر داخل ہوتے ہی وہ سب میرے
شکاروں کو دیکھ لیں گے اور نئی الجھن پیدا ہو جائے گی لیکن مفر کی کوئی صورت بھی نظر نہیں آ رہی
تھی اس لیے میں نے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے میرے پیچھے ایس آئی اور سپاہی داخل
ہو گئے اندر کا منظر دیکھتے ہی ایس آئی چونک گیا۔

''یہ، یہ سب کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''غداروں کو ہلکی سی سزا دی ہے میں نے۔''

''اوئے، اندر اقدام قتل اور باہر قتل، گرفتار کر لو اسے۔'' ایس آئی نے سپاہیوں کو حکم
دیا۔

''کیا باہر قتل ہوا ہے، کس کا قتل؟'' میں نے پوچھا
کلو نامی غنڈے کا جسے تم قتل کر کے اندر گھسے ہو۔''

''وہ، میرے ساتھ آیا تھا۔ اسے کس نے قتل کر دیا؟'' میں نے پوچھا
''تم نے، ہمارے پاس گواہ بھی ہے، جس نے تمہیں قتل کرتے دیکھا ہے۔''
''کون ہے وہ جو جھوٹی تہمت لگا رہا ہے۔'' میں نے تڑخ کر کہا
''ہر قاتل یہ ہی کہتا ہے۔'' دروازے کے باہر سے آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے کے درمیان کمر پر ہاتھ رکھے کنائی سنیال کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں جھپٹا لیکن سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا
''اچھل کو نقصان پہنچائے گی۔ اچھے بچے اچھل کود نہیں کرتے ہیں۔'' کنائی نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''تم نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں گدھا ہوں۔ کان کھول کر سن لو۔ میری پہنچ ہر طبقے ہر محکمے میں ہے۔ میں جب چاہوں تمہیں چیونٹی کی طرح مسل دوں۔''
''ضیغم کے معنی جانتے ہو۔ ضیغم مولا علی کی تلوار کا نام ہے جس کا کام کفر کا سر قلم کرنا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''بہت بڑ بڑ کر رہا ہے۔ اسے فوراً لے جاؤ اور لاک اپ میں اتنی دھنائی کرو کہ مزاج درست ہو جائے۔'' کنائی نے ایس آئی سے کہا
''چل بے اوئے۔'' ایس آئی نے دھکا دیا تو مجھے غصہ آ گیا اور میں نے ہاتھ گھما دیا۔ میرا ہاتھ کچھ زیادہ زوردار پڑ گیا تھا اس کا نچلا جبڑا ٹیڑھا ہو گیا۔ اس کی بھیانک شکل دیکھتے ہی دونوں سپاہی مجھ پر چڑھ دوڑے۔ ان میں سے ایک کو میں نے اٹھا کر جاں کنی میں مبتلا ایس آئی پر پھینک دیا۔ وہ اس کے سینے سے ٹکرایا تھا اور ایک گھٹی گھٹی سی چیخ فضا میں تیر گئی تھی۔ تب تک دوسرے سپاہی کا ڈنڈا میری پیٹھ پر پڑ چکا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس سپاہی کی گردن پکڑی اور اسے بھی ان دونوں پر اچھال دیا۔ بازی پلٹتے دیکھ کر کنائی نکل بھاگا تھا۔ ان تینوں کو چھوڑ کر میں اس کی جانب لپکا لیکن وہ چھلاوا تھا۔ پل بھر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے گنوا کر میں پھر اندھیرے میں بھٹکنے پر مجبور ہو گیا۔ فریدہ تک پہنچنے کا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اور ٹھہرنے کی بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اندر تو پولیس والے ہتھکڑیاں لیے بیٹھے تھے۔ کہیں وہ باہر نکل نہ آئیں اس ڈر سے میں سڑک پر نکل آیا۔ کچھ دوری پر ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھا ایک رکشے والا سستا رہا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا کہ مجھے خیال آیا۔ خالی پاکٹ کون پناہ دے گا اور میں پلٹ پڑا لیکن اندر داخل ہوتے ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ایس آئی پستول تانے کھڑا تھا، بھاگنے کا راستہ نہیں تھا لہٰذا میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایس آئی کی آنکھوں میں



نفرت کے شعلے تھے اور چہرے پر جبڑے کے درد کا سایہ تھا۔ دونوں سپاہی بھی اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ مجھے خوف نے گھیر لیا تھا کہ وہ درد کی شدت سے پاگل ہو کر گولی بھی چلا سکتا ہے۔ اسی خیال سے میں نے چال چل دی۔ اس کے شانے کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے کہا ''ارے ارے'' اس نے سمجھا کہ شاید کوئی اس کے پاس کھڑا ہے۔ وہ گھبرا کر پلٹا ہی تھا کہ میں نے زقند بھری اور اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ میں کسی کی جان لینا نہیں چاہتا تھا۔ زندگی لینے اور دینے کا حق صرف قادرِ مطلق کو ہے میں کیوں گناہ گار بنتا؟ اس لیے میں نے پستول کو جیب میں رکھ لیا۔ میری دانائی کو ان لوگوں نے کمزوری سمجھا اور مجھے گرانے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ لات اور گھونسے مار کر چٹان گرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پائے تھے کہ سوم رس پینے کے بعد میں ہمالیہ کی چٹان بن چکا تھا جسے سر کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں تھا۔ ان کے گھونسے مجھے ننھے بچے کے طمانچے محسوس ہو رہے تھے۔ پھر بھی میں نے ہلکا سا سبق دینا ضروری سمجھا اور ایک کے منہ پر الٹا ہاتھ مار دیا۔ طمانچہ اس کے گال سے ٹکرایا اور وہ پٹخنی کھا گیا۔ اسے گرتے دیکھ کر دوسرے سپاہی کو جوش آ گیا اور وہ اپنے ہاتھ کی لاٹھی کو گھماتا ہوا میری طرف بڑھا میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ بنوٹ کا اچھا کھلاڑی ہے۔ اگر میری جگہ کوئی معمولی آدمی ہوتا تو وہ مار کھا جاتا لیکن میں تو ہر قسم کا شاک پروف تھا اس لیے بنوٹ میرے لیے بچوں کا کھیل تھا اس لیے میں نڈر بن کر کھڑا تھا اور یہی بے خوفی میرے حق میں پچھل پیری ثابت ہوئی۔ کیوں کہ عام انسانوں کی طرح میری بھی دو ہی آنکھیں تھیں جو سامنے مرکوز تھیں میرے پیچھے کون کھڑا ہے اس کا احساس تب ہوا جب میرے سر پر بھاری ضرب پڑی۔ کسی وزنی چیز سے میرے سر کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اگر میں سوم رس پیے ہوئے نہ ہوتا تو یقیناً میرا دماغ پھٹ گیا ہوتا پھر بھی مجھے زوردار جھٹکا لگا میں لڑکھڑا گیا تھا۔ مجھے لڑکھڑاتے دیکھ کر سپاہی نے بھی میرے سر پر ڈنڈا بجا دیا۔ دو دو ضربوں نے میرے صبر کو ڈگمگا دیا اور میں کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح سپاہی پر ٹوٹ پڑا۔ میرا گھونسا اس کی پسلی سے ٹکرایا تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے خالی مٹکے پر گھونسا مارا ہو۔ پسلی توڑتا ہوا میرا گھونسا اس کے اندرونی اعضا سے ٹکرایا تھا میں نے فوراً ہی اپنے ہاتھ کو باہر کھینچ لیا اپنے خون آلود ہاتھ کو دیکھ کر میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی تھی لیکن توقف کا وقت تھا نہیں۔ اس وقت میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں نے اسی خون آلود ہاتھ کا طمانچہ اس آدمی کے گال پر رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے تیز چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر تڑپتے ہوئے سپاہی کے جسم پر گر پڑا میرے طمانچے کا ایک فائدہ ہوا تھا ایس آئی کا ترچھا جبڑا اپنی اصلی

حالت پر آ گیا تھا۔

ان تینوں سے فرصت پا کر میں اندر داخل ہوا۔ وہ چاروں غدارِ وطن کینچوے کی
پڑے آنکھیں پٹپٹا رہے تھے۔ اذیت کا احساس ان کے چہروں سے ہویدا تھا۔ میں نے
اچٹتی سی نظر ڈالی اور کمرے کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کمرے میں الماری جیسی کوئی چیز نہیں
اس لیے دوسرے کمرے میں پہنچا۔ اس کمرے میں میری مطلوبہ شے نظر آئی، دیوار میں
جڑی تھی۔ اس کے نزدیک جا کر میں نے ہینڈل کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ شومئی قسمت ہنڈل
ہاتھ میں آ گیا۔ جھنجلا کر میں نے پوری قوت سے گھونسا دے مارا۔ ہاتھ میں چوٹ تو لگی
خوشی نے تکلیف پر قابو پا لیا۔ تجوری کا کواڑ مڑ کر اندر دھنس گیا تھا۔ میں نے ایک گھونسا اور
وہ بالکل ترچھا ہو گیا۔ اندر رکھے نوٹوں کے بنڈل مجھے دعوت دیتے نظر آئے۔ میں نے
بعد دیگرے سارے بنڈل نکال لیے کچھ کاغذات بھی نظر آئے انہیں بھی نکالنا ضروری نہیں
اس لیے میں نے ماچس کی ڈبیا اندر رکھ کر ایک تیلی رگڑی اور اسے ڈبیا کے اندر رکھ دیا۔
نے فوراً آگ پکڑ لی اور کاغذات جلنے لگے۔ اس کمرے میں ٹھہرنا فضول تھا اس لیے میں
نکل آیا۔

مجھے احساس تھا کنائی سنیال چپ نہیں بیٹھے گا۔ وہ پولیس ہیڈ کوارٹر سے مزید
لا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں میرا وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا لیکن اسے پکڑنا بھی ضروری تھا
فریدہ اور اس کے بچے کا پتا لگایا جا سکے۔ یکایک میرے ذہن میں روشنی کی کرن ابھری اب
سامنے کی بات نظر نہیں آئی تھی۔ وہ چاروں اس کے خاص آدمی تھے۔ ان سے کوئی بات چھپی
ہوگی۔ خاص کر سراج سے، وہ تو اس کا پروپیگنڈہ سیکرٹری تھا یعنی دست راست، اسے تو
کنائی کے چھپنے کی جگہ معلوم ہوگی۔ ذہن کی رہنمائی پا کر میں دوسرے کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ چاروں میرے نزدیک سانپ تھے جو میری قوم کو تواتر سے ڈس رہے تھے۔
زندہ چھوڑنا بے وقوفی تھی اس لیے جاتے ہی میں نے رتن سرکار کے گلے پر اپنا داہنا پاؤں
کچھ ہی دیر میں اس کی ناک سے خون کی بوندیں ٹپک پڑیں۔ اسے مرتے دیکھ کر جاں کنی
مبتلا سراج، سبھاش دت عرف عین الحق اور اس کا ساتھی چیخنے لگے۔ خوف سے ان کے
زرد ہو گئے تھے۔ ہاتھ پاؤں کے جوڑ کھلے ہوئے نہ ہوتے تو یقیناً بھاگنے کی کوشش کرتے۔

ان کی چیخ و پکار کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے دوسرے کے گلے پر پاؤں
بھی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ ان دونوں کے بعد میں سبھاش دت عرف عین الحق کی



ہا۔ مجھے اپنی جانب بڑھتے دیکھ وہ گھگیایا۔ ''اللہ کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ میں تو تکلیف سے
رہا ہوں، جان سے مت مارو۔'' عین الحق نے التجا کی۔

''تم دونوں کی موت یقینی ہے۔ صرف ایک شرط پر بخش دوں گا۔''

''کون سی شرط؟'' سراج نے پوچھا۔

''مجھے کنائی کے چھپنے کی جگہ بتا دو۔''

''وہ اپنے کسی کارخانے میں چھپا ہوگا۔'' سراج نے کراہتے ہوئے کہا۔

کارخانہ؟ کس چیز کا کارخانہ؟'' میں نے پھر سوال کیا

''مشن کی تکمیل کے لئے کثیر سرمائے کی ضرورت ہے۔ اخراجات کو پورا کرنے کے
لیے وہ کئی دھندے کرتا ہے۔ پہلا دھندا ہے لڑکیاں اغوا کر کے یا نوکری کا جھانسا دے کر کلکتہ
بھیجنا۔ وہاں سونا گاچھی کے طوائف خانے میں انہیں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اس رقم سے لٹریچر
چھپوا کر منگوایا جاتا ہے جسے ہم گاؤں گاؤں جا کر تقسیم کرتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''پتا بتاؤ'' میں نے حکم دیا اور اس نے مشینی انداز میں تینوں پتے بتا دیے۔ پتا نوٹ
کرنے کے بعد میں نے ان دونوں کو بھی ختم کر دیا اور باہر نکل آیا۔ دروازے پر ایک سپاہی کی
لاش پڑی تھی جبکہ دوسرا سپاہی اور ایس آئی غائب تھا۔ شاید انہیں ہوش آ گیا تھا اور وہ دونوں
بھاگ نکلے تھے۔ ان کے بزدلی پر مسکراتا ہوا میں سڑک پر نکل آیا کچھ دور چلنے کے بعد مجھے ایک
ٹیکسی نظر آئی اسے ہاتھ کا اشارہ دے کر میں نے پاس بلایا اور پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے
لا۔

''صدر بازار۔'' ٹیکسی مرکزی شاہراہ کی بھیڑ کو چیرتی ہوتی صدر بازار کی جانب
اٹے بھرنے لگی اور میں خیالوں میں ڈوب گیا۔

☆=====☆=====☆

ہوا کے جھونکوں میں مجھے فریدہ نوحہ کناں نظر آ رہی تھی۔ میں نے بہت رخ بد
ذہن کو بہت موڑا، خیالوں کے روشن پردے سے آنکھیں موڑیں مگر وہ ہر طرف تھی، ہر سُو تھی
اس کی وہ اندھی یلغار مجھ پر مسلسل جاری تھی۔ مجھے فرار کی راہ نہیں مل رہی تھی۔ میں اندر ہی اند
ٹوٹ کر بکھر رہا تھا کہ ٹیکسی جھٹکے سے رک گئی۔ میرے خیالات بکھر گئے میں نے چونک کر گرد
موڑی اور اچھل پڑا۔ ٹیکسی کسی گیرج کے اندر کھڑی تھی جس کا دروازہ بند کیا جا رہا تھا۔ میں
خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور چوکنا ہو کر اترا۔ ملگجے اندھیرے میں کئی آدمی نظر آئے۔ ایک کے
ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور باقی کے ہاتھ میں پستول، سب کی نال میری جانب اٹھی ہوئی تھی۔

''کیوں، میرا ریسیپشن پسند آیا؟'' ایک کونے سے کنائی سنیال کی آواز سنائی دی۔

''سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا۔'' کہتے ہوئے میں نے ٹیکسی سے باہر قدم نکالا۔

''میں جانتا تھا تم باہر نکلو گے اسی لیے دو ٹیکسیاں بھجوادی تھیں۔'' کنائی سنیال نے
کہا۔

''بہت بہت شکریہ، میرے پیسے بچ گئے۔ میں تو خود تمہیں ڈھونڈ رہا تھا، کہو۔ کیوں
بلایا ہے؟'' میں نے بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔

''اس لیے''۔ یہ کہتے ہوئے اس نے فائر کر دیا۔ ایک دہکتا ہوا انگارہ میری جا
میں گھستا چلا گیا اور میں لڑکھڑا کر ٹیکسی کی باڈی سے ٹک گیا۔

کنائی سنیال کی گولی نے میری ران کو ادھیڑ دیا تھا اور خون کا فوارہ سا ابل پڑا تھا۔

''اب تو سمجھ گئے ہوگے کہ میں نے کیوں بلایا ہے؟'' کنائی نے کہا۔

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور زخم پر ہاتھ رکھ کر خون بند کرنے کی کوشش
کرتا رہا۔

''اسے کمرے میں لے چلو۔'' کنائی سنیال نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

''چل بے اندر چل۔'' اسٹین گن والے نے نال کو میری پیٹھ پر رکھتے ہوئے کہا۔



شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے اس کی دہاڑ سے چرند و پرند کانپتے ہیں لیکن وہی شیر جب
پنجرے میں بند ہو جاتا ہے تو کینچوا بن جاتا ہے۔ میں بھی کینچوے کی طرح بے ضرر بن گیا تھا۔
ران کا زخم خون اگل رہا تھا اور میری آنکھیں شعلے۔ اس کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا اس لئے
دھکے کھاتا ہوا ان کے آگے آگے چلنے لگا۔

اندر کے کمرے میں لے جا کر مجھے بند کر دیا گیا۔ باہر سے دروازے کو مقفل کرتے
ہوئے کنائی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اس پر ہر وقت نگاہ رکھنا۔ ایک پل کے لئے بھی
کھڑکی سے مت ہٹنا یہ انسانی شکل میں بدروح ہے۔ دو بار قید سے بھاگ چکا ہے۔''

''اور اب تیسری بار بھی بھاگوں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا مگر سوچنا بہت
آسان ہے اور سوچ کو عملی شکل دینا بہت مشکل۔ کنائی سنیال نے فرار کو ناممکن بنا دیا تھا۔ پھر بھی
میں نے حوصلہ نہ ہارا اور فرار کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ کھڑکی پر اگر موت کے ''فرشتے'' ہر وقت
موجود نہ رہتے تو میں پچھلی کھڑکی توڑ کر نکل بھاگتا۔ سنیاسی کی دوا سوم رس کے استعمال سے
میرے اندر اتنی طاقت آ چکی تھی کہ لوہے کی سلاخیں میرے ہاتھوں میں آتے ہی موم کی طرح
مڑ جاتیں لیکن کھڑکی پر طاقت آزمانے سے پہلے ہی وہ دونوں فائرنگ شروع کر دیتے اور میرا
جسم چھلنی ہو جاتا۔ ''ان کی آنکھوں میں کیسے دھول جھونکوں؟'' اسی بات پر غور کر رہا تھا کہ دماغ
نے ایک راہ دکھا دی۔ میں نے ان سے کہا۔ ''بھیا! ایک گلاس پانی تو پلا دو پیاس سے گلا سوکھ
رہا ہے۔''

''تو بھی کیا یاد کرے گا۔ لے پانی پی لے۔'' ان میں سے ایک نے گلاس بڑھا دیا۔

سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ بڑھا کر میں نے گلاس تھام لیا اور بستر کے پاس آ
کر بولا۔

''سنو اوئے غدارو! تم لوگوں نے مجھے زندہ گرفتار تو کر لیا ہے لیکن قید میں نہیں رکھ
پاؤ گے۔ میں خودکشی کر رہا ہوں۔ یہ رہی زہر کی ٹیبلٹ۔'' میں نے اپنی ہتھیلی اونچی کر کے گولی
انھیں دکھائی اور پھر منہ میں رکھ کر پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ گھونٹ گھونٹ پانی پیتے
ہوئے میں نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ وہ
ہونقوں کے مانند ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ انھیں مزید الجھانے کے لئے میں نے
جھومنا شروع کر دیا اور لہرا کر زمین پر لڑھک گیا۔ پھر جانکنی میں مبتلا مریض کی طرح ہاتھ
پیر پٹکنے لگا۔ میرے منہ سے خون کے قطرے بھی ٹپکنے لگے جن کی سرخی سے فرش لال ہونے

لگا تھا۔ میں نے ڈھیر سارا خون اگلا اور ہاتھ پیر چھوڑ دیئے۔

''استاد! یہ تو گیا۔'' ان میں سے ایک بولا۔

''جلدی دیکھو' سنیال ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہت اہم قیدی ہے یہ۔''

''تم بھی آؤ۔''

دروازے کے قفل میں چابی گھومنے کی آواز آئی' پھر دروازہ کھلا اور وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ ایک نے میری آنکھوں کو پھیلا کر دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔ اس کا دوسرا ساتھی مجھ سے لپٹ گیا۔ ہاتھی سے کتے لپٹیں' یہ ناممکن ہے۔ میں نے اسے زوردار گھونسا مارا۔ یقین کریں' میرا گھونسا لگتے ہی کڑ کڑ کڑچ کی آواز ابھری اور میرا آدھا ہاتھ اس کے سینے کی ہڈیوں کو توڑتا ہوا اندر گھس گیا۔ میں نے جھٹکے سے ہاتھ باہر کھینچا اور وہی خون آلود ہاتھ گھما کر اس کے دوسرے ساتھی کے گال پر رسید کیا۔ وہ عجیب سی آواز نکالتا ہوا گر کر تڑپنے لگا۔ اس کا جبڑا ٹیڑھا ہو گیا تھا اور تکلیف سے آنکھیں ابلنے لگی تھیں۔ میں نے اس کی قمیص سے اپنا خون آلود ہاتھ پونچھا اور باہر نکل آیا۔

کھڑکی کے پاس دونوں کی اسٹین گنیں رکھی تھیں۔ میں نے گولیوں کا چیمبر کھولا اور اسے باہر کی طرف اچھال کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے منہ سے نکلنے والا خون بند ہی نہیں ہو رہا تھا۔ انھیں دھوکا دینے کے لئے میں نے اپنے گال کے اندرونی حصے کو چبا لیا تھا۔ نرم گوشت میں دانت خنجر کی طرح اتر گئے تھے۔ اس وقت تو جوش کا عالم تھا لیکن اب ناقابل برداشت جلن ہو رہی تھی۔ میں نے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کلی کرنے کے لیے نلکے پر پہنچ گیا۔ کلی کرتے ہوئے مجھے اپنی بے وقوفی پر ہنسی آ گئی۔ میں فریدہ کا پتا معلوم کیے بغیر باہر جانے کی سوچ رہا تھا۔ اس خیال نے مجھے روک لیا۔ کنائی کی گولی سے ران ادھڑ چکی تھی۔ خون جمنے سے زخم کا منہ تو بند ہو گیا تھا مگر درد کی لہر اٹھ رہی تھی۔ درد پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لنگڑاتا ہوا لوٹ کر زخمی کے پاس آیا اور بولا۔ ''بتا کنائی کہاں ملے گا؟''

''مجھے نہیں پتا۔'' اس نے جبڑا سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''میں پھر تیرا جبڑا ٹیڑھا کیے دیتا ہوں جب یاد آ جائے تو بتا دینا۔''

اسے تکلیف یاد آ گئی اور وہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔

''بتاتا ہے یا.....'' میں نے اسے مکا دکھایا۔

''صدر بازار میں انو میاں کے گھر میٹنگ ہے۔ وہ وہیں ہو گا۔''



''انو کے گھر کی پہچان؟''

''وہ گھر بیڑے کا ہے اور سفید رنگ سے رنگا ہوا ہے۔''

''فریدہ کے بارے میں بھی بتا دے۔''

''اس کے بارے میں مجھے نہیں پتا۔''

''ٹھیک ہے۔ اب آرام کر۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی کنپٹی دبا دی اور بے ہوش کرنے کے بعد میں باہر نکل آیا۔

ایک رکشے والا سواری کا منتظر تھا۔ میں نے سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ''صدر بازار۔'' رکشے والا ہانپتا ہوا سائیکل رکشا کھینچ رہا تھا۔ اس کے پیروں کی رگیں ہر بار دباؤ کے ساتھ ابھر آتیں۔ انسانیت کی تذلیل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن چپ تھا۔ سوائے کڑھنے کے اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ پیسے تو میرے پاس ہیں نہیں' کرایہ کہاں سے دوں گا؟

اگر میں بدمعاشی پر اتر آتا تو اسے کچھ نہ دیتا اور دھمکا کر بھگا سکتا تھا لیکن میرے سینے میں بھی دل تھا جو کسی بھی غریب کی پریشانیوں پر رونے لگتا تھا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد میں نے اپنے دل کو تسلی دی اور صدر بازار آتے ہی رکشے سے اتر پڑا۔ سامنے ہی ایک سنار کی دکان تھی۔ دکان کے اندر پہنچ کر میں نے چاندی کی انگوٹھی اتاری اور کہا۔ ''میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔''

دکان دار نے اس کا وزن کیا اور میرے ہاتھ پر کچھ رقم رکھ دی۔ رکشے والے کو رخصت کر کے میں نے سفید بیڑے والے گھر کی جانب قدم بڑھا دیا۔ نزدیک پہنچنے پر مجھے اس جھگی سے تیز تیز باتوں کی آواز سنائی دی۔ کئی افراد ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ایک جگہ سے مجھے چٹائی ہٹی ہوئی نظر آئی۔ میں نے اس روزن پر آنکھیں لگا دیں۔ جھگی میں بیس بائیس مرد عورتیں بیٹھی تھیں۔ سب کے سب بنگلہ بھاشا میں باتیں کر رہے تھے۔ ملک میں سیاسی عدم استحکام کا دور دورہ تھا۔ ان کی گفتگو کا موضوع بھی سیاست تھا۔ وہ سب باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر شخص اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی سب مئودب ہو گئے۔ اس شخص کے چہرے سے عیاری ٹپک رہی تھی۔ اسے میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ کنائی سنیال تھا۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ پتا نہیں کہ مجھے یہ کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی خطرناک بات ہونے والی ہے۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر اس کی باتیں سننے لگا۔ اس کی

زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے ذہن میں دھماکے سے کر رہا تھا۔ وہ تقریر کے انداز میں کہہ رہا تھا:

''پاکستان کو آزاد ہوئے گیارہ سال ہو گئے لیکن ہم لوگوں کو کیا ملا؟ پہلے بھی ہم نفرت کا شکار تھے اور آج بھی ہیں۔ پہلے ہمیں ہندوؤں کی غلامی کرنا پڑتی تھی اور آج مغربی پاکستانیوں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ ان سے اچھے تھے ہمارے ہندو زمیندار جو ہماری زبان کے تو دشمن نہیں تھے۔ ہماری تہذیب و ثقافت کے تو دشمن نہیں تھے۔''

میں اس کی زہر میں بجھی باتوں میں اس طرح کھو گیا تھا کہ مجھے گرد و پیش کی بھی خبر نہ رہی اور میری یہی خود فراموشی مجھے لے ڈوبی۔ مجھے یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ ایک شخص میرے پیچھے آ کر کھڑا ہوا ہے۔ احساس ہوا تو اس وقت جب میری گردن اس کے قوی بازوؤں کے شکنجے میں آ چکی تھی۔ مجھے سانس رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ میں نے جھٹکا دے کر آزاد ہونا چاہا تو اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال میری پسلیوں میں چبھوتے ہوئے کہا۔

''خبردار! شور مچایا تو گولی داغ دوں گا۔ سیدھی طرح سے اندر چلے چلو۔''

مجبوراً میں نے اس کے حکم پر قدم بڑھا دیا۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا اندر لے آیا اور مقرر سے کہا۔ ''سر! یہ خان باہر کھڑا ہماری باتیں سن رہا تھا۔ لگتا ہے سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔''

مقرر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ''اے مورا! سچ سچ بتا تو نے کیا کیا سنا؟''

''تمہاری تقریر کا ہر لفظ جوان معصوموں کے کچے ذہنوں میں زہر گھول رہا تھا''۔ میں نے بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔

''کیا یہ باتیں غلط ہیں؟'' کنائی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم ہم پر اپنی ثقافت تھوپ نہیں رہے ہو، ہم سے ہماری زبان چھین نہیں رہے ہو۔''

''ہم مشرق سے مغرب تک صرف مسلمان ہیں۔ ہماری ثقافت وہ ہے جسے اسلامی کہا جاتا ہے۔ رہا زبان کا مسئلہ تو ہماری اصلی زبان وہ ہے جس میں خدا نے ہم سے کلام فرمایا ہے۔ بچہ جب تک شیر خوار ہوتا ہے وہ ''غوں غاں'' کی زبان میں کلام کرتا ہے اور جب بولنے کا وقت آتا ہے تو وہ ماں باپ کی زبان اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح اس وقت ہم سب ایامِ شیر خواری میں ہیں کوئی بنگلہ تو کوئی اردو اور کوئی پشتو اور پنجابی بول رہا ہے لیکن جب بولنے کا وقت آئے گا تو ہمارا ہر فرد صرف عربی بولے گا۔''

''وہ وقت کبھی نہیں آئے گا'' کنائی چیخا۔



''وہ وقت اٹل ہے کنائی! یوم حشر ضرور آئے گا۔''

اب مقرر بول اٹھا۔ ''عربی ہزاروں میل دور کی زبان ہے اور ہماری زبان اس سے بھی پیاری ہے جبھی تو رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا ہے مودیر گوربومود پرآشا آماد پرای بانگلہ بھاشا یعنی ہمارا غرور، ہماری امید ہے۔ بنگلہ زبان۔ یہی زبان سب افضل ہے''۔

اس کی یہ بات میرے لیے ٹرپ کا پتا ثابت ہوئی اور میں نے اسے کھیلنے میں توقف نہ کیا۔ فوراً وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے بولا۔ ''سن لیا تم نے۔ یہ تمہارے ہمارے سب کے منہ پر جوتا مار رہا ہے۔ قرآن مجید کو جھوٹا قرار دے رہا ہے۔''

میرے ان الفاظ نے ان کے سوئے ہوئے احساس کو جگا دیا۔ میرے الفاظ کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''سر! آپ کو معافی مانگنا ہوگی۔''

کنائی سنیال نے بازی الٹتے دیکھ کر فوراً پینترا بدلا۔ ''مجھے پتا نہیں تھا کہ قرآن عربی میں ہے۔''

کہیں لوگ پھر اس کے جال میں نہ آ جائیں، اس خدشے کے تحت میں نے نپے تلے انداز میں کہا۔ ''بھائیو! آپ اتنی جلدی بھول گئے کہ آزادی سے پہلے ہندو آپ کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے؟ کیا آپ پر مدرسے کھولنے کی پابندی نہیں تھی؟ کیا آپ کے ساتھ ہتک آمیز سلوک نہیں ہوتا تھا؟ ہندو زمینداروں کے گھروں کے سامنے سے ٹوپی پہن کر گزرنے پر پابندی نہیں تھی؟ مسجدیں مندروں سے دور بنانے کا حکم نہیں تھا؟ بولیے جواب دیجیے۔''

ہر چہرے پر تغیر آ چکا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر پھر چوٹ کی۔ ''بولیے، کیا یہ سچ نہیں کہ زمیندار کو جس کی لڑکی پسند آ جاتی تھی، اس کو زبردستی حویلی میں لا کر باندی بنا لیتا تھا، کیا آزادی کے بعد کسی غیر بنگالی مسلمان نے ایسا کیا؟''

میں نے بات پوری کر کے ردعمل دیکھنے کے لیے حاضرین پر نظر ڈالی۔ اسی وقت مجھے لانے والے نے پیچھے سے میری گردن پر پوری قوت سے گھونسا مارا۔ میری آنکھوں کے سامنے لال پیلے تارے گردش کرنے لگے۔ میں نے گرتے گرتے سنا، کسی جوشیلے نوجوان نے چیخ کر کہا تھا۔ ''خبردار! اب اگر تم نے خان کو ہاتھ لگایا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔''

اس کے بعد دھینگا مشتی اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ سب ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے تھے اور جھگی میدان کارزار بن گئی تھی کچھ لوگ مجھ پر بھی آ گرے تھے۔

انہیں الگ ہٹاتے ہوئے میں کھڑا ہوگیا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس کا ساتھ دوں؟ کون میرا حامی ہے اور کون مخالف؟ اسی شش و پنج میں دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ ہی دیر میں نتیجہ سامنے آ گیا۔ کنائی سنیال کے بہی خواہ پسپا ہونے لگے۔ تو اس نے باہر چھلانگ لگا دی۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں بھی لپکا لیکن جھگی میں کئی لوگ آڑے ترچھے پڑے تھے۔ ان سے پھلانگنا اور کھڑے ہوئے لوگوں کو سامنے سے ہٹانا آسان نہیں تھا۔ کسی طرح انہیں ہٹا کر جب باہر نکلا تو گلی ویران ساحل کا منظر پیش کر رہی تھی ہلکی سی امید تھی تو ان لوگوں سے جو بے ہوش پڑے تھے یقیناً ان میں سے کوئی نہ کوئی اس کا خاص آدمی ضرور ہوگا۔ معلومات حاصل کرنے کے لیے میں جھگی میں لوٹ آیا۔

میری حمایت میں آواز بلند کرنے والے نوجوان نے پوچھا۔ ''خان بھائی! کنائی کو آپ سے کوئی ذاتی پُرخاش تھی کیا؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں، وہ میرا نہیں بلکہ اسلام کا دشمن ہے، اس لیے آپ لوگوں کو بہکا رہا ہے۔''

وہ فخر سے سینہ پھلا کر بولا۔ ''ہم بہکنے والے نہیں ہیں۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''شیطان جلدی ہار نہیں مانتا وہ اپنی کوشش جاری رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کنائی بھی شیطان کا ایک روپ ہے، اسی لیے وہ تمہیں جہنم کے راستے پر کھینچ رہا ہے۔ کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مقبول کا یہ فرمان نہیں کہ سب سے بڑا گناہگار وہ ہے جس نے اپنے بھائی کا خون بہایا۔ کیا وہ تم لوگوں کو اپنے بھائیوں کا خون بہانے پر نہیں اکسا رہا؟ نفرت ہی تو قتل و غارت گری پر اکساتی ہے۔ تمہارے دلوں میں نفرت کے بیج بو کر تمہارے ہاتھوں سے تمہارے بھائیوں کا گلا کٹوائے گا اور تم جہنم کا ایندھن بن جاؤ گے۔''

اس نے کہا۔ ''ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ سنتے سب کی ہیں مگر کرتے اپنے من کی ہیں۔''

''تو میرے من کے راجہ!'' میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''ان زخمیوں سے اگلواؤ کہ ان کا مرکزی اڈا کہاں ہے؟''

''ابھی لیجیے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک کے سر پر ٹھوکر ماری وہ کراہتا ہوا اٹھ گیا۔

''حضور اپنی زبان کھولنا پسند کریں گے؟'' اس نے مصنوعی پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''ذرا اپنا نام



تو بتائیں؟''

''گوپال!'' زخمی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بتایا۔

''شری گوپال جی مہاراج! ذرا سی کرپا اور کریں اور یہ بتائیں کہ آپ کا اڈا کہاں ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا اس کے اس انداز پر میں نے مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''یہ سوال مجھ سے کر رہے ہو کیا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''فاروق کی نظریں کہیں بھی رہیں نشانہ ہدف پر ہی رہتا ہے۔''

''تو مسٹر فاروق! ان سے پوچھیں کہ کنائی کہاں ملے گا؟'' میں نے کہا۔

''تم نے سنا؟'' فاروق نے گوپال کی کمر پر لات رسید کرتے ہوئے کہا۔

''وہ آج کی ٹرین سے ڈھاکا جا رہا ہے۔ سیٹ میں نے ہی ریزرو کرائی ہے۔'' گوپال نے بتایا۔

''اس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، وہ اکیلا ہے، کل ہی فریدہ نامی لڑکی کو اس نے کرشنا کے ساتھ جیسور بھیجا ہے اور اس کے لڑکے کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔''

اس کے جواب نے مجھے پریشان کر دیا، کہیں وہ ہاتھ سے نکل نہ جائے، یہ سوچ کر میں نے کہا ''فاروق! تم ان سے نمٹو۔ میں اسٹیشن چلا۔''

میں جھگی سے باہر نکل آیا اور سائیکل رکشا پر سوار ہو کر اسٹیشن جا پہنچا۔

☆=====☆=====☆

انسان اپنی طرف سے تو مقدور بھر کوشش کرتا ہے مگر کامیابی، ناکامی قسمت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی قسمت نے عجیب مذاق کیا جوں ہی میں نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا، ٹرین کا آخری ڈبا نظر آیا اگر اس کی رفتار تیز نہ ہوتی تو دوڑ کر سوار ہو جاتا مگر اب منہ لٹکائے باہر نکل آیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ یکایک بس کا خیال آیا۔ میں بس اسٹاپ کی طرف دوڑا۔ اسے حسنِ اتفاق ہی کہیے کہ بس میں سیٹ مل گئی۔ میرے برابر ایک عجیب الہیت شخص بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے تاڑ لیا کہ وہ اندھیری دنیا کا باسی ہے۔ اس کے لہجے نے بھی تائید کر دی۔ اس نے اوباشوں کی طرح مجھے مخاطب کیا لیکن میں نے اسے منہ لگانا مناسب نہ

سمجھا اور کھڑکی کے باہر دیکھتا رہا۔

تین گھنٹے کا سفر طے کر کے بس نواکھالی میں رکی۔ کمر سیدھی کرنے کے لیے میں نیچے اترا۔ سامنے ہی چائے کی ایک دکان تھی۔ میں نے پاکٹ سے ریزگاری نکال کر گنی اور چائے پینے چل پڑا۔ میرے پیچھے وہ بھی آ گیا۔ اس نے قریب پہنچ کر بڑے ہی بے ڈھنگے انداز میں کہا۔ ''ابے او خان! ایک کپ چائے پلائے گا؟''

میرے پاس بہت کم پیسے رہ گئے تھے۔ میں نے چاہا کہ انکار کروں، پھر سوچا کہ ایک چونی ہی کی تو بات ہے۔ دو چائے کی قیمت دے کر بھی دو روپے بچ جائیں گے جو دوپہر کے کھانے کے لیے کافی ہیں۔ ڈھاکا پہنچتے ہی پیسوں کا انتظام ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر میں نے کہا۔ ''چلو پلا دیتا ہوں۔''

میری نرمی پر وہ شیر بن گیا اور دانت نکوستے ہوئے بے حیائی سے بولا۔ ''میں جانتا تھا تم ضرور پلاؤ گے۔ اگر انکار کرتے تو گھونسا مار کر دانت ہلا دیتا۔''

اس کا جملہ ختم ہوا ہی تھا کہ ''وہ او غ'' کی آواز نکالتے ہوئے مجھ سے ٹکرا گیا کیونکہ میں اس کے آگے تھا میں پھرتی سے پلٹا، اس کے پیچھے خطرناک شکل والے چار غنڈے کھڑے تھے۔

''کیوں، ہمیں دھوکا دے کر بھاگنا چاہتا تھا؟'' ان میں سے ایک نے پھر ا گھونسا رسید کیا۔

''استاد! یہ خان بھی اسی کا ساتھی ہے۔'' ان میں سے ایک نے میری جانب اشارہ کیا تو باقی دو نے مجھے گھیر لیا۔ میں نے اپنے آپ کو نرغے میں پایا تو میرے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے الٹا ہاتھ گھمایا، میں تو پہلے ہی ہوشیار تھا۔ فوراً پیچھے ہٹ گیا وہ اپنے ہی زور میں گھوم گیا۔ دوسرے نے لات چلا دی۔ میں اس کی جانب سے ہوشیار نہیں تھا۔ اس کی ایڑی میری ٹانگ میں لگی۔ مجھے تو کچھ نہ ہوا البتہ وہ پیر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ شاید سنیاسی کی دوا کا اثر تھا کہ میرا جسم فولاد ایسا ٹھوس بن گیا تھا۔ دو کی درگت دیکھنے کے باوجود تیسرا آگے بڑھا۔ اس کے جارحانہ انداز کو دیکھتے ہوئے میں نے پہل کر دی اور اسے ہاتھوں میں سنبھال کر دور اچھال دیا۔ وہ ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کی حالت دیکھ کر تینوں ایک ساتھ میری جانب لپکے لیکن میں تر نوالہ تو تھا نہیں۔ فوراً ہوا میں قلابازی کھائی اور ان کے سروں پر لاتیں مارتا ہوا دوسری جانب کود گیا۔ شاید انہوں نے اتنا پھرتیلا شخص پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ تینوں غصے



میں پاگلوں کی طرح پھر میری جانب لپکے۔

لڑائی میں جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ان کی اسی غلطی سے فائدہ اٹھایا اور ایک کو لات اور دوسرے کو گھونسا انعام میں دے دیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر پوری قوت استعمال کی تو وہ مر جائیں گے اور میرے لیے مشکلیں کھڑی ہو جائیں گی اسی لیے ہلکے ہاتھ استعمال کر رہا تھا پھر بھی وہ ان کے لئے گرز ایسے تھے۔ دو تین ہاتھ کھاتے ہی تینوں لمبے لیٹ گئے۔

یہ جھڑپ قلب شہر کے بس اسٹاپ پر ہوئی تھی۔ پولیس والے کیسے نظر انداز کر دیتے؟ جس طرح انگریزوں کے دور حکومت میں کسی انگریز پر حملہ کرنا ناقابل معافی جرم ہوتا تھا، ویسا ہی بنگال کی سرزمین پر کسی پنجابی یا پٹھان پر حملہ سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ پولیس میں اس وقت ستر فی صد غیر بنگالی افسر ہوا کرتے تھے وہ غیر بنگالیوں کی طرفداری پر تُل جاتے۔ وہاں پہنچنے والی پارٹی کا افسر بھی پنجابی تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں شیر ہو گیا اور دہاڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ دن دہاڑے بھری پُری سڑک پر رہزنی ہوتی ہے۔ اگر میں کمزور ہوتا تو ابھی لٹ جاتا۔''

مجھے غصے میں ابلتے دیکھ کر افسر نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں رپورٹ لکھا دیں۔ میں سب سے سمجھ لوں گا۔''

''جو کرنا ہے آپ خود کریں۔ مسافر ہوں۔ میری بس چھوٹنے ہی والی ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ جائیں۔'' افسر نے کہا۔

بغیر چائے پیئے میں لوٹ آیا۔ بس میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ شخص بھی آ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر کے بعد بولا ''خان بھائی! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اگر آپ نہ ہوتے تو آج میری موت یقینی تھی۔''

میں نے بیزاری سے جواب دیا ''موت کا ایک دن معین ہے کسی کے دخل دینے سے موت نہیں ٹلتی۔''

وہ اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں کرتا اور وقت پر کام آنے کی قسمیں کھاتا رہا اور میں اونگھتا رہا۔ راستے میں تین جگہ بس رکی۔ تینوں جگہ چائے ناشتا اسی نے کرایا۔

شام چھ بجے ہم لوگ ڈھاکا پہنچے۔ اس کی ضد پر میں نے اپنا پتا بتا دیا۔

گھر پہنچ کر مجھے عجیب سی بے بسی کا احساس ہوا۔ فریدہ کے ساتھ پتا نہیں ظالموں

نے کیا سلوک کیا ہوگا، یہ سوچ سوچ کر مجھے ہول آنے لگا۔ ساری رات نیند نہ آئی۔ صبح نماز کے بعد آنکھ لگی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دوسری دستک پر دروازہ کھولا تو میرا دل دھڑک اٹھا۔ دروازے پر ابوالبشر کھڑا تھا۔ اس نے ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی۔ میں نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ باورچی خانے میں پوٹلی رکھ کر اس نے پوچھا ''فریدہ نظر نہیں آ رہی ہے۔''

میں اسی سوال سے ڈر رہا تھا اس لئے گھبرا گیا اور اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ''پوٹلی میں کیا ہے؟''

''پٹالی گڑ اور چیوڑا ہے۔''

''واہ! میں بھی سوچ رہا تھا کہ کھجور کا گڑ منگواؤں۔''

''فریدہ سے کہیں کہ وہ گڑ میں چاول پکائے لیکن وہ ہے کہاں؟''

''میں تو سوچ رہا ہوں کہ آج تاڑ کے گڑ میں چاول پکائے جائیں۔''

''تاڑ کا گڑ ابھی لے آتا ہوں لیکن فریدہ ہے کہاں؟''

''ابا کیسے ہیں۔ ان کے بارے میں تو تم نے بتایا ہی نہیں؟''

''وہ بھی کل آ رہے ہیں لیکن فریدہ کہاں ہے؟''

ابوالکلام صاحب کے آنے کا سن کر میں پریشان ہو گیا۔ اب تک تو صرف ابوالبشر پوچھ رہا تھا، اب ابوالکلام صاحب بھی میرا سر کھائیں گے کہ فریدہ کہاں ہے؟ یا اللہ! میں کیا کروں؟ انھیں کیسے بتاؤں کہ فریدہ کہاں ہے۔ میں فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ غسل کرنے کے لئے باتھ روم میں گھسا۔ موقع غنیمت جان کر میں گھر سے نکل پڑا۔ باہر آ کر میں بے خیالی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ بی سی سی روڈ پار کر کے جب میں ٹھٹھری بازار میں پہنچا تو ایک نیا خیال دماغ میں آیا اور میرے قدم ہکا غنڈے کے اڈے کی جانب اٹھنے لگے۔ ریلوے لائین پار کرتے ہی میں نے ناک پر رومال رکھ لیا۔ شراب کی بھٹی سے اٹھنے والی بدبو نے فضا کو آلودہ کر دیا تھا۔ مجبوری تھی اس لیے برداشت کرتا ہوا اس کے اڈے پر پہنچا۔ اتفاق سے ہکا اڈے پر موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا ''کہو خان کیسے آنا ہوا؟''

''مجھے تم سے ایک کام ہے۔''

''بولو بسر و چشم تیار ہوں۔ میں تو بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔ یہ میرا اصول بھی ہے اور کاروباری انداز بھی۔''



''کنائی سنیال کو جانتے ہو؟''

''کون کنائی سنیال؟''

''جگناتھ کالج میں پروفیسر تھا۔''

''اس کا پیٹ چاک کرانا ہے؟''

''نہیں، اس کا پتا چاہیے۔''

''کوئی خاص وجہ؟''

''اس نے میری آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے۔''

''میں اس کے ہاتھ توڑ دوں؟''

''نہیں صرف اس کا پتا لادو۔''

''شام تک مل جائے گا۔''

''اتنا وقت نہیں ہے۔''

''کوشش کرتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے آواز لگائی ''بچو۔''

ایک منحنی سا نوجوان آ کر کھڑا ہو گیا۔

''جاؤ جا کر سب سے کہو ایک گھنٹے میں مجھے کنائی سنیال کا پتا چاہیے۔ وہ کچھ دنوں پہلے تک جگناتھ کالج میں لیکچرار تھا۔''

نوجوان نے ''جی اچھا'' کہا اور باہر نکل گیا۔

شراب کے بھبکوں کے درمیان میرا دم گھٹ رہا تھا لیکن مجبوری تھی اس لیے بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ ہکا نے کئی بار پوچھا خان چائے پیو گے لیکن میں انکار کیے جا رہا تھا۔ جانتا تھا اس کے پیسے جوئے اور شراب کے ہیں اور دونوں کی آمدنی کلی طور پر حرام ہے۔ حرام کے پیسوں سے خریدی گئی غذا بھی میرے نزدیک حرام ہے۔ حرام غذا فاسد خون پیدا کرتی ہے اور فاسد خون ذہن میں فساد پیدا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ رشوت اور بے ایمانی کے پیسوں پر پلنے والے بچے والدین کا ادب نہیں کرتے۔ اس لیے میں انکار کیے جا رہا تھا۔ میرے بیٹھے رہنے کی وجہ سے اسے بھی کوفت ہو رہی تھی کیوں کہ میرے سامنے وہ حرام شے کی چسکیاں نہیں لے پا رہا تھا۔ شاید اسی لیے وہ بار بار پہلو بدل رہا تھا کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ تو وہ چونک گیا۔ ان کا ایک گرگا داخل ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے ہکا نے کہا ''کہو کیا خبر لائے؟''

''اس کا پتا مل گیا ہے؟''

میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''متھرا پور میں۔''

''چلو بھئی! اسے فوراً گھیرنا ہے۔'' میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

''پوری بات تو سنیئے۔ گنڈریا میں او باپل کے پاس ایک پرانی عمارت ہے۔ سجا نیو اس کے مالک کا نام ڈاکٹر سجاش ہے۔ صبح وہ اسی مکان میں تھا لیکن اس وقت وہ وہاں نہیں ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ اندر نہیں ہے؟''

''اس علاقے کا دادا پانچو میاں میرا دوست ہے۔ وہ کنائی سنیال کو پہچانتا ہے۔ اس کے لیے کئی بار کام بھی کر چکا ہے۔ آج بھی دونوں کے درمیان معاہدہ ہوا ہے۔''

''کس قسم کا معاہدہ؟'' میں نے پوچھا۔

''پرسوں سے خواجہ اجمیری بابا کا عرس شروع ہونے والا ہے۔ عرس کے موقع پر جلسہ وعظ کی محفل منعقد ہوگی۔ کسی قسم کی بدنظمی نہ ہو، اسی لیے پچاس روپے روز پر اسے حاصل کیا ہے۔''

''اتنی بڑی رقم؟ اس کے ساتھ کتنے لوگ ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''دس آدمی۔''

''یہ جلسہ ہوگا کہاں؟''

''جینجیرا میں۔''

''اوہ، گنگا کے اس پار ٹھیک ہے میں بھی شرکت کروں گا۔''

''اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو بتا دینا آدمی ساتھ کر دوں گا۔'' بکا نے کہا۔

''اگر ضرورت پڑی تو لے لوں گا۔'' پھر میں نے خبر لانے والے سے کہا۔ ''تم کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے۔''

اس نے جواب دیا۔ ''میرے دوست پانچو نے بتایا ہے کہ سنیال صبح آیا تھا تو اس کی گود میں ایک بچہ تھا جسے وہ ڈاکٹر کی بیوی کے پاس چھوڑ کر ٹنگائل گیا ہے۔ شام تک واپس آ جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''فوراً میرے ساتھ چلو، اس بچے کو حاصل کرنا ضروری ہے۔''

''چلیے!'' کہتے ہوئے وہ مڑ گیا۔



ہم دونوں ریلوے لائن سے ہوتے ہوئے پھولبڑیا کراسنگ پہنچے۔

''استاد! رکشا لے لو۔'' اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے ایک سائیکل رکشا والے کو آواز دی وہ اپنا رکشا کھینچتا ہوا نزدیک آ گیا۔ ہم دونوں اس پر بیٹھ کر متھرا پور کی طرف چل پڑے۔ نواب پور کے رش بھرے علاقے کو پار کرتا ہوا رکشا وکٹوریا پارک پہنچا اور پھر قائداعظم کالج کی طرف مڑ گیا۔ لکھی بازار ہوتے ہوئے ہم دونوں گنڈریا کے او باپل پر پہنچ گئے۔ متھرا پور کی گنجان آبادی کی اس عمارت میں داخل ہونے میں ہمیں دشواری نہیں ہوئی۔

اندر صرف ڈاکٹر سجاش اور اس کی بیوی تھی۔ میں نے سجاش کی گردن دبوچ کر پوچھا۔ ''بتا کنائی کہاں ہے؟''

وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے نہیں پتا۔ جاتے وقت اس نے بتایا تھا کہ ٹنگائل جا رہا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ٹنگائل نہیں گیا ہے کہیں اور گیا ہے کیوں کہ اپنے پروگرام کی صحیح خبر وہ کسی کو نہیں دیتا۔''

میں نے کڑک کر پوچھا۔ ''بچہ کہاں ہے؟''

اس کی بیوی نے کہا۔ ''وہ اندر ہے۔ اسے لینے آئے ہو تو لے جاؤ مگر بھگوان کے لیے میرے شوہر کو کچھ نہ کہو۔''

''اچھی بات ہے۔ جاؤ بچے کو لے آؤ۔''

وہ فوراً بچے کو لے آئی۔ میں نے بچے کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔ ''جب وہ آئے تو مجھے خبر کر دینا۔ میری دکان کیپٹن بازار میں ہے۔ کسی سے بھی میرے بارے میں پوچھ لینا۔ پتا چل جائے گا۔''

بچے کو لے کر میں اپنے گھر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولا تھا ابوالبشر نے۔ اس نے میری گود میں اپنے بچے کو دیکھ کر پوچھا۔ ''فریدہ نہیں آئی؟''

''بتاتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اندر داخل ہوا اور اپنے کمرے میں لے جا کر بچے کو لٹا دیا۔ شاید اسے کوئی نشہ آور دوا دی گئی تھی۔ اس پر غشی سی طاری تھی۔ میں نے بچے کو پیار کرتے ہوئے ابوالبشر سے کہا۔ ''بشر تم ایک بات مانو گے؟''

''کیا؟''

''فریدہ کے بارے میں کوئی سوال نہ کرو۔''

''کیوں؟''

جواب میں، میں نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا۔''اب اسے کہاں تلاش کیا جائے؟''

''یہ کام میرا ہے تم صرف اتنا کرو کہ جب ابا آئیں تو انہیں کسی بہانے واپس بھیج دینا۔''

''جو حکم۔''اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں نے اس کے سامنے زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اس کا مجرم ہوں۔ میری وجہ سے فریدہ کا یہ حال ہوا ہے اس لیے میں باہر نکل آیا اور جیریا ٹولی کی گلیوں کو پار کرتا ہوا نشاط سینما کے پاس لگے چائے کی ایک دکان میں جا کر بیٹھ گیا۔

نشاط سینما کے سامنے والے ہوٹل اپنی نوعیت کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ اسے فرمائشی پروگرام کا نام دیا گیا تھا۔ تینوں ہوٹل والوں نے چینجر لگا رکھے تھے۔ جن پر نئی فلموں کے ریکارڈ بجتے رہتے تھے۔ اپنی پسند کا گانا سننے والوں کو ایک پرزے پر فلم کا نام اور گانے کے بول لکھ کر دینے پڑتے تھے۔ کاؤنٹر میں وہ ریکارڈ لگا دیتا تھا۔ میں نے بھی ایک پرزے پر فلم اسلام لکھ کر پہلا بند لکھ دیا۔

اسی ریکارڈ کو کئی بار سننے کے بعد وہاں سے اٹھا اور امینیہ ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں کی بریانی کافی مشہور تھی۔ اسی کا آرڈر دیا۔ کھانا کھا کر باہر نکل رہا تھا کہ میری نظر دیوار گھڑی پر پڑی۔ رات کے نو بج رہے تھے، اتنی رات تک باہر رہنا مناسب نہیں ہے، یہ سوچ کر میں گھر کی طرف چل پڑا۔

اگلی صبح اٹھ کر میں پھر آوارہ گردی کرنے نکل پڑا اور رات گئے لوٹا لیکن دوسرے دن اِدھر اُدھر چکرانے کی بجائے سیدھا ہکا غنڈے کے اڈے پر پہنچا۔ اس سے کہا کہ مجھے شام تک بارہ آدمی چاہئیں۔ اس نے مطلوبہ تعداد میں غنڈے فراہم کر دینے کا وعدہ کر لیا۔ اس اڈے سے نکل کر میں بیت المکرم مسجد پہنچا۔ مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی۔ بازار نہیں بنے تھے۔ دکانیں کھل گئی تھیں۔ ان میں سے ایک میرے واقف کار کی تھی وہ پشاور کا رہنے والا تھا۔ اس نے رنگون میں کاروبار شروع کیا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاری کے بعد وہ ڈھاکہ منتقل ہو گیا تھا۔ وہ آتشیں اسلحہ کا ڈیلر تھا۔ اس کی دکان پر پہنچ کر میں نے فرمائش کی۔''زور آور خان میرے لیے ایک پستول کا انتظام کر دو۔''



''لائسنس لے لو۔ میں فوراً انتظام کر دوں گا۔''

''مجھے پستول کی ضرورت آج ہے۔ لائسنس لینے میں وقت لگے گا۔''

''اگر زیادہ ضرورت ہے تو میرا پستول لے جاؤ لیکن غصے میں استعمال نہ کرنا۔ صرف اپنی حفاظت کے لیے استعمال کرنا۔''

''مجھ پر یقین ہے تو دے دو ورنہ کوئی بات نہیں۔''

''دل چھوٹا مت کر۔ لے میرا پستول لے جا۔''

پستول لے کر میں گلستان سے ہوتا ہوا واپس کیپٹن بازار پہنچا۔

ابوالبشر نے دکان کے اندر پالنا لگا لیا تھا۔ جھولے میں اس کا بیٹا جھول رہا تھا۔ میں نے بچے کو پیار کرنے کے بعد کہا۔''بشرا سے اپنی ماں کے پاس چھوڑ آؤ۔ پتا نہیں فریدہ کب ملے گی اتنے دنوں تک بچے کو کیسے رکھو گے؟''

''اگر ماں نے پوچھا کہ فریدہ کہاں ہے تو؟''

''کہہ دینا، اس کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے بچے کو ماں سے دور رکھنے کی صلاح دی ہے۔''

''جو حکم۔''

دکان میں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں گھر آیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سورج غروب ہونے والا ہے۔ میں نے بستر چھوڑ دیا اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر باہر نکل آیا۔ ہکا نے وعدے کے مطابق اپنے آدمیوں کو جمع کر رکھا تھا۔ انہیں ساتھ لے کر میں صدر گھاٹ پہنچا۔ کشتی والے مختلف گھاٹوں کے نام لے لے کر آوازیں لگا رہے تھے۔ میں نے ایک بڑی کشتی والے سے پوچھا''جینجیرا بازار چلو گے؟''

''جی مالک!''اس نے جواب دیا۔

ہم سب اس کی کشتی پر سوار ہو گئے۔ بوڑھی گنگا کے پانی پر تیرتی ہوئی کشتی بادام تلی گھاٹ سے جینجیرا کی طرف بڑھنے لگی۔ دوسرے کنارے پر اتر کر ہم سب بازار میں پہنچے۔ بازار کے آخری حصے میں بڑی سی قنات لگی تھی۔ دریاں بچھی ہوئی تھیں جن پر سیکڑوں کی تعداد میں لوگ بیٹھے تھے۔ ڈائس پر مائیک کے سامنے ایک شخص کھڑا دھواں دھار تقریر کر رہا تھا اور لوگ واہ واہ کر رہے تھے۔ نعرہ تکبیر اور نعرہ رسالت بھی گونج رہے تھے۔ میں بھی ہمہ تن گوش

ہوکر تقریر سننے لگا۔

خواجہ معین الدین چشتی کا عرس مشرقی پاکستان میں بڑے جوش وخروش سے منایا
ہے ان کے نام کا لنگر رجب کا مہینہ آتے ہی تقسیم ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ جگہ جگہ قوالی او
کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ یہ محفل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور اس پاکیزہ محفل میں
شخص دوسرے مسلمان فرقے کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ اس فرقے سے تعلق رکھنے والے ا
کو کافر قرار دیتے ہوئے حاضرین کو خوں ریزی کی ترغیب دے رہا تھا۔ میں زیادہ دیر
خاموش نہ رہ سکا اور کھڑے ہوکر بولا۔

''کیا آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں گے؟''

اس نے گھبرا کر تقریر روک دی اور بولا ''یہ کون کافر ہے؟''

''یہ دینی جلسہ ہے اس لیے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

''پوچھو۔''

''آپ مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف کیوں بھڑکا رہے ہیں؟ ایک بھائی کو بھ
کا خون بہانے کی ترغیب کیوں دے رہے ہیں؟''

لگتا ہے تم کافر ہو کافر!'' وہ انتہائی غصے سے بولا

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''واہ میرے بھائی! رسول خدا کا فرمان تو یہ تھا کہ ج
تک ثابت نہ ہوجائے، کسی کافر کو بھی کافر نہ کہو اور تم مجھے کافر کہہ رہے ہو''۔

اس نے جھلا کر کہا ''اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تم بھٹکے ہوئے ہو۔ رسول خدا کی با
بھول گئے، ان کی آل کو بھول گئے ہو اولیائے کرام کو بھول گئے ہو۔ ایسے بھٹکے ہوئے شخص
فوراً قتل کردینا چاہیے''۔

میں نے اپنے پرانے انداز میں کہا۔ ''واہ جناب! قرآن مجید میں ارشاد ہوا
لا اکراہ فی الدین''، یعنی دین میں جبر نہیں اور تم تلوار کی باتیں کرنے لگے۔ سچ سچ بتاؤ تم مسل
ہو یا نہیں؟''

اس نے مائیک پر چیخ کر کہا ''ایمان والو! تم انصاف کرو۔ یہ پٹھان کا بچہ تمہار
عالم کے ایمان پر شک کررہا ہے بولو کیا ایسے کافر کو زندہ رہنا چاہیے؟''

''نہیں۔ مار دو اسے زندہ بچ کر نہ جائے۔'' لوگوں نے نعرے لگانا شروع کردیے
وہ بپھر اٹھے تھے۔ مجھے اپنی جان بچانا مشکل ہوگیا تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور



جگہ ڈٹا رہا۔ میں اگر چاہتا تو دس بارہ کی ہڈیاں توڑ سکتا تھا لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ وہ بے
چارے تو معصوم تھے کہ عوام معصوم فطرت ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات کو اس بدبخت نے
بھڑکایا تھا۔ سزاوار وہی تھا۔ اس لیے میں نے پوری قوت سے چلا کر کہا۔

''آپ لوگ رک جائیں۔ پہلے میری بات سنیں۔ اگر میں غلط کہوں تو جو سزا آپ کی
وہ میری۔ دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیں۔ کیا یہ ملک کسی ایک فرقے کی ملکیت ہے؟ کیا اسے
حاصل کرنے کے لیے کسی ایک مسلک والوں نے قربانیاں دی تھیں؟ یہ تو ہم سب کی مشترکہ
ملکیت ہے۔ ہندوؤں نے قتل وغارت گری کرتے وقت فرقوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق کی
تھی؟ کیا ننھے ننھے بچوں کو تلواروں پر اچھالتے وقت، معصوم دوشیزاؤں کی عصمت سے کھیلتے
وقت، ضعیف اور بیمار مسلمانوں کا گلا کاٹتے وقت ان ظالموں نے کسی ایک فرقے یا مسلک کو
چھوٹ دی تھی؟ کیا انہوں نے ہر کلمہ گو کے گلے پر خنجر نہیں چلایا تھا؟ یاد رکھیے، خدا رحمت نازل
کرتا ہے تو قہر بھی نازل کرتا ہے۔ من وسلویٰ آسمان سے بھیجتا ہے تو اسی قوم کو لعنت کا مستحق بھی
بنا سکتا ہے۔ کہیں ہم بھی یہودیوں کی طرح لعنت کے مستحق نہ بن جائیں۔ آیئے مل کر عہد
کریں کہ خداوند کریم کے بخشے ہوئے اس تحفے یعنی پاکستان کی حفاظت کریں گے اور ہمیں
آپس میں لڑا کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والوں کا ستیاناس کردیں گے۔''

میری تقریر ختم ہوتے ہی ہکا کے غنڈوں نے نعرہ لگایا۔'' پاکستان کے دشمن مردہ
باد۔''

معصوم عوام کو تو بس شہ چاہیے۔ وہ بھی یہی نعرہ لگانے لگے۔ میں نے ڈائس پر پہنچ کر
ایک ہاتھ سے مائیک تھاما اور دوسرے ہاتھ سے زہر اگلنے والے کی گردن پکڑ کر چیختے ہوئے
بولا ''نعرے بعد میں لگائیں۔ پہلے زندہ حقیقت کو دیکھ لیں۔ یہ اپنے آپ کو کٹر مسلمان کہہ رہا
ہے لیکن میرا دعویٰ ہے کہ یہ ہندو ہے جو ہماری صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے لیے آیا
ہے۔ یقین نہ ہو تو آپ سب خود دیکھ لیں۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ جھٹکا مار کر الگ ہوگیا۔

میں بھی انسان ہوں غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی ہیں۔ میری تمام توجہ سامعین کی
جانب تھی۔ جس کا اس نے فائدہ اٹھایا تھا اور اب دور کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے وہیں سے چلا
کر کہا۔ ''نادانو! یہ تم سب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ دراصل میں نے اس کی سازش پر وار کیا ہے
اس لیے مجھے ہندو کہہ رہا ہے۔ میں تم سب سے پوچھتا ہوں، کہاں گئی تمہاری غیرت؟ کیوں تم
لوگ خاموش ہو؟ اسے پیس کر رکھ دو۔ یہ ہمارے جلسے کو سبوتاژ کرنے آیا ہے۔ خواجہ بابا کے نام

پر میں سب سے التجا کرتا ہوں کہ اسے ختم کردو۔ جنت تمہاری ملکیت بن جائے گی۔''
کہیں پھر سامعین بھپر نہ اٹھیں، اسی خیال سے میں نے کہا۔'' دوستو! میں نے نہیں کہا ہے۔ آپ سب خود دیکھ لیں یہ ہندو ہے۔''

میرا اشارہ پاتے ہی ہکا کے غنڈوں نے اسے جکڑ لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ا لباس دھجیوں میں بدل گیا۔ پھر کیا تھا۔ مجمع بے قابو ہو گیا مجمع کو اکسا دینا آسان ہے لیکن ا قابو میں لانا دشوار ہے۔ جینجیرا بازار سے کیرانی گنج تھانہ دور نہیں تھا۔ اس حادثے کی خبر پلک جھپکتے ہی پہنچ جاتی اور وہاں بھونچال آ جاتا وہ سب مجھے گرفتار کرنے دوڑ پڑتے اس میں نے ہکا کے آدمیوں کو واپسی کا اشارہ کیا اور گنگا گھاٹ کی طرف چل پڑا۔

راستے میں ہکا کے غنڈوں میں سے ایک نے پوچھا

''خاں صاحب، آپ اتنی جلدی کیوں بھاگ لیے؟''

''اس لیے کہ تمہارے سسرالی رشتے دار مجھے اشتعال پھیلانے کے جرم میں گ کر لیتے۔ کیرانی گنج تھانہ زیادہ دور تو ہے نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بہت چالاک ہیں آپ' وقت کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیتے ہیں۔'' اس جواب دیا۔

''باتیں کم کرو اور بھاگنے کی سوچو۔'' میں نے مشورہ دیا اور رفتار تیز کر دی کچھ ہی میں ہم سب گھاٹ پر پہنچ گئے۔ اتفاق سے ساری کشتیاں دوسرے کنارے پر تھیں صرف کشتی کھڑی تھی۔ اس پر بھی مسافروں کا ہجوم تھا۔

''صرف دو آدمی۔'' ملاح نے سب کو روکتے ہوئے کہا۔

''خان صاحب، آپ اور پچی چلے جائیں۔ ہم لوگ دوسری ناؤ سے آ جا گے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

میں نے کشتی پر قدم رکھ دیا۔ میرے ساتھ ایک منحنی سا نوجوان پچی بھی سوار ہو ملاح نے لگھی سے ساحل کو پیچھے دھکیلا۔ کشتی تیرتی ہوئی گہرے پانی میں پہنچ گئی۔ ملاح نے چلاتے ہوئے بھٹیالی گانا چھیڑ دیا۔ چاند کی روشنی میں گنگا کا حسن نکھر آیا تھا۔ عجیب مسح ماحول تھا۔ ملاح کی پُرسوز آواز نے اس ماحول کو حسن عطا کر دیا تھا۔ وہ دردبھری آواز میں تھا'' شوب شوکھی تے پار کودیتے نیبو آنا آناتو ماربیلا ٹیبوشوکھی تو مار کا نیر شونا شوکھی رے.....

مجھے بھی یہ گانا بہت پسند تھا۔ میں بھی کبھی کبھی اپنی بھونڈی آواز میں گنگنایا



حالانکہ میں نہ تو ملاح تھا اور نہ ہی کسی کی سہیلی کو گنگا کے پار اتارتا تھا اور نہ کسی کے کان کا سونا زرگار بنانے کے لیے لیتا تھا لیکن کہتے ہیں ناں، موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ وہ سیدھی دل میں اترتی ہے۔ وہ گانا بھی میرے دل میں بس گیا تھا بلکہ آج بھی بسا ہوا ہے۔ بنگال کو الوداع کہے بیس سال ہو گئے ہیں لیکن آج بھی اس بڑھاپے میں اس گانے کو گنگناتا ہوں کیوں کہ ہندوستانی موسیقار پنی لہری نے فلم شرابی میں اس گانے کی موسیقی چرا کر دے دی لیکن اس میں اس بے چارے موسیقار کا قصور نہیں ہے قصور تو اس پوری قوم کا ہے جس کی نگاہوں میں مسلمان کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں اور وہ ہر اس چیز پر قبضہ جما لیتی ہے جو مسلمانوں سے منسوب ہو۔ اپنی اسی خصلت سے مجبور ہو کر وہ مشرقی بنگال میں مداخلت کر رہی تھی اور میں اس کی سازشوں کو ٹھوکروں میں اڑا رہا تھا۔

میں خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ کشتی رک گئی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی اترا اور بادام تلی کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے ساتھ پچی بھی تھا۔ ہم دونوں باتیں کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے کہ کسی جن کی طرح سنیال یکا یک سامنے آ گیا۔ وہ میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے میری ٹھوڑی کو دو انگلیوں سے اٹھاتے ہوئے کہا'' کیوں بے خان! تو نے اپنے آپ کو کیا سمجھا ہے؟ کیوں میرا راستہ کھوٹا کر رہا ہے؟''

میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔'' میں تمہاری موت ہوں اور موت کا ایک ہی کام ہے راستہ کھوٹا کرنا، سمجھے۔''

''تیری بیوی میرے قبضے میں ہے۔ اس کی درگت بن رہی ہے پھر بھی تجھے عقل نہیں آئی۔''

''فریدہ وطن کی بہادر بیٹی ہے۔ وہ اپنی قربانی دے کر وطن کی آبرو بچا رہی ہے۔ وطن کو لہو سے سینچا جاتا ہے اور لہو دیتے ہیں محبان وطن، اس نے بھی لہو دیا ہے جس کے ایک ایک قطرے کی قیمت میں تم سے وصولوں گا۔''

''چہ پدی اور چہ پدی کا شوربہ۔ مکھی ہاتھی سے ٹکرائے گی' واہ بہت خوب۔''

''سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا۔ ہم سے ٹکرا کر تمہاری پوری قوم پاش پاش ہو جائے گی۔''

''تو میاں محبِ وطن! تمہیں اپنی بیوی چاہیے؟''

''فریدہ میری بیوی نہیں ہے پھر بھی وہ میری ذمے داری ہے۔ بتا وہ کہاں ہے؟''

"اسے اب تم کبھی دیکھ نہیں سکو گے۔ ہاں اگر میرا ساتھ دینے پر تیار ہو جاؤ تو پتا بتا دوں گا۔"

"کمینے!" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ "تو نے اپنے آپ کو ہے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اس نے میرا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "خبردار اب اگر ایسی بھول کی تو گولیاں چھید کر رکھ دیں گی۔ اپنے پیچھے بھی دیکھ لے پانچ پانچ پستول کی نالیں اٹھی ہوئی ہیں۔"

میں نے مڑ کر جائزہ لیا۔ میرے ارد گرد پانچ نوجوان کھڑے تھے جو مجھے نظروں سے گھور رہے تھے۔ ہر ایک کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور ہر جیب پھولی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہر ایک نے جیب میں پستول چھپا رکھا ہے۔

"مجھے اپنی جان کی پروا نہیں ہے۔ تمہیں ہر حال میں فریدہ کا پتا بتانا ہوگا۔" میں بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔

"تو سن لو وہ بھارت پہنچا دی گئی ہے اس وقت وہ کلکتے میں بیٹھی ہوگی۔"

"کلکتہ چاند پر نہیں ہے۔ میں اسے وہاں سے چھڑا لاؤں گا لیکن تمہیں کس حالت میں چھوڑنے والا نہیں۔"

"میں تو خود تمہیں لینے آیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قدم بڑھایا۔ ہاتھ آ شکار کو میں کیسے چھوڑ دیتا۔ فوراً میرا داہنا پیر گھوم گیا۔ میرے جوتے کی نوک اس کی پنڈلی ٹکرائی۔ وہ چیخ کر الٹ گیا۔ اس کے گرگوں نے پستول نکالے ہی تھے کہ پچی نے ایک دوسرے پر دھکا دیا۔ دونوں آپس میں الجھ کر گر پڑے لیکن تیسرے نے گولی چلا دی۔ سما شکن دھماکا گونجا اور مجھے اپنی پنڈلی میں دہکتا ہوا انگارہ دھنستا محسوس ہوا۔ ایک ہی لمحے میں پیر میں دو گولیاں دھنسی تھیں۔ مجھے اپنا پیر بیکار ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے زخمی دیکھ کر پچی گھبر اور کنائی سنیال کو موقع مل گیا وہ مجھے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ لوگ دوڑ پڑے وہ سب اسلام پور روڈ کی جانب فرار ہو گئے۔

بھری پُری سڑک پر کسی کو گولی مار دینا معمولی بات نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لو اکٹھے ہو گئے۔ بڑھتی ہوئی بھیڑ دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ مجھے آنے والے وقت کا خوف ستا لگا۔ پولس خواہ مخواہ کی پوچھ گچھ کر کے میرا وقت برباد کرتی اسی ڈر سے میں نے پچی کہا۔ "دوست! مجھے سہارا دو۔ یہاں سے جتنی جلد ہو سکے بھاگ چلو۔"



پچی نے ایک سائیکل رکشا روکا اور مجھے بٹھا کر اسلام پور روڈ کی جانب چل پڑا۔ مجھ غشی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ "مجھے میڈ فورڈ اسپتال لے چلو۔ وہاں ڈاکٹر صفدر اعوان ہوگا اس سے کہنا میرا آپریشن خفیہ طریقے پر کرے۔ پولیس کیس نہیں بننا چاہیے۔"

"آپ خود ہی کہہ دیجیے گا۔"

"نہیں دوست! میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر صفدر کا مکان اسپتال کی پشت پر ہے۔ وہیں لے جانا۔" کچھ ہی دیر میں میرے حواس کے چراغوں کا تیل ختم ہو گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر تن گئی۔

☆======☆=====☆

پتا نہیں، مجھے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ جب آنکھ کھلی تو فجر کا وقت تھا مؤذن کی آواز خدا کے حضور جھک جانے کی دعوت دے رہی تھی۔ میں نے فوراً بستر چھوڑ دیا زمین پر پیر رکھتے ہی پنڈلی میں درد کی تیز لہر اٹھی۔ میں نے سختی سے دانت بھینچ کر درد کو جھیلا اور لنگڑاتا ہوا واش بیسن تک پہنچا وضو کر کے خدا کے حضور جھک گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر مڑا ہی تھا کہ میری نظر ڈاکٹر صفدر پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے سلام کے لئے ہاتھ اٹھا دیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔ "واقعی تم انسان نہیں ہو جن ہو۔ اتنے بڑے آپریشن کو فیس کرنا آسان نہیں۔ مجھے تو تمھاری قوت ارادی پر حیرت ہے۔ میڈیکل سائنس کے لئے عجوبہ ہو تم۔ ران میں پھنسی گولی کئی دن پرانی تھی۔ کب لگی تھی؟"

"چار پانچ دن پہلے۔ چٹا گانگ میں لگی تھی۔"

"او مائی گاڈ۔ وہاں سے آئے کیسے؟"

"بس کے ذریعے۔"

"واقعی تم انسان نہیں۔ اتنا بڑا زخم پھر آپریشن اور ابھی کھڑے ہو کر نماز ادا کر لی۔"

"نماز تو وقت نزع پر بھی ادا کر لوں گا۔ سب سے پہلی پُرسش نماز کی ہوگی، کیونکہ مسلمان کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔"

"بھئی کیوں شرمندہ کر رہے ہو۔"

"شرمندہ نہیں کر رہا ہوں، یاد دلا رہا ہوں۔ عمل کرو یا نہ کرو تمھاری مرضی کیوں کہ سزا و

جزا تمہیں ملے گی۔ اپنے عمل کے ذمے دار تم ہو میں نہیں۔''

''بھئی میں تو تمھارا زخم دیکھنے آیا تھا لیکن تم نے تو وعظ شروع کر دیا۔''

''میرا زخم کل تک مندمل ہو جائے گا لیکن میں آج ہی گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''جیسی تمہاری مرضی میں روکوں گا نہیں کیوں کہ تمہیں سب کی نظروں سے چھ رکھے ہوئے ہوں۔''

اسی دن دوپہر میں ہکا اپنے گرگوں کے ساتھ ملنے آیا۔ جب میں نے کہا کہ میر جارہا ہوں تو وہ اچھل پڑا۔

''خان صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کل گولی لگی اور آج اسپتال سے چ لے رہے ہیں۔''

''میاں! ایک گولی کئی دن پہلے کی بھی پھنسی ہوئی تھی۔ وہ بھی کل نکالی گئی ہے۔''

''پھر بھی آپ کہہ رہے ہیں کہ گھر جائیں گے؟''

''ہاں' یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ پولس کو بھنک پڑ گئی تو بے چارا اصفدر پھنس جا گا۔''

''چلیے میں لے چلتا ہوں۔'' ہکا نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہو کہا۔

وہ جیپ پر آیا تھا۔ اسی کے ساتھ میں گھر تک آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میر ذہن کو خوشگوار جھٹکا لگا۔ آنگن میں فریدہ بیٹھی چاول چن رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس چاول کی سینی ایک جانب رکھ دی اور گھبرائے ہوئے انداز میں سہارا دینے دوڑی۔

''آپ لنگڑا کیوں رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''گولی لگی ہے' لیکن تم کب آئیں؟''

''آج ہی..... میں نے کنائی اور اس کے ایک ساتھی کو گولی ماردی ہے۔ مجھے ا لوگوں نے کھیل گاؤں کے ایک گھر میں قید رکھا تھا۔ کلکتہ لے جانے کی تیاری کر رہے تھے ک مجھے موقع مل گیا اور میں نے اس کے پستول سے اسے ہی گولی ماردی۔ اس کے ایک ساتھی ۔ راستہ روکنا چاہا تو اس پر بھی فائر کر دیا۔''

''کہیں پولس کیس نہ بن جائے۔''

''مجھے فکر نہیں ہے۔ ان لوگوں نے بھی مجھے بڑی اذیت دی تھی۔ میرا بس چلتا تو ان



سب کی بوٹی بوٹی کر دیتی۔''

''خیر جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اگر فردوس کے پاس جانا چاہتی ہو تو پہنچا دوں گا۔ کچھ دن وہاں رہو گی تو دل کا بوجھ اتر جائے گا۔''

''نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''ارے مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' میں نے چونک کر کہا۔ ''باہر ہکا اور اس کے ساتھی کھڑے ہیں۔''

میں فوراً باہر نکالیکن وہ لوگ نظر نہ آئے۔ مجھے اتار کر لوٹ گئے تھے۔ انھیں غائب پا کر میں واپس آیا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

اگلے دن میری خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ فردوس کا خط آیا تھا۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے اردو رسم الخط میں لکھا تھا کہ میں ایک پیارے سے بچے کا باپ بن گیا ہوں۔ اس بچے کا نام علی شیر چچا نے میرے نام کی مناسبت سے ذوالفقار رکھا ہے۔ میں ضیغم اور وہ ذوالفقار! دونوں کے معنی ایک ہیں۔

میں نے دل سے دعا کی۔ ''اے خداوند کریم! اسے بھی محبّ وطن بنانا۔'' بچے کو دیکھنے کے لئے میرا دل تڑپ اٹھا تھا میں نے پھر دل سے دعا کی کہ میرا زخم جلد سے جلد بھر جائے تا کہ میں اپنے بچے کو ایک نظر دیکھ سکوں لیکن دوپہر کو جب اخبار دیکھا تو میرا سکون درہم برہم ہو گیا۔ اخبار میں خبر چھپی تھی کہ مشہور سماجی کارکن پروفیسر کنائی سنیال کو ایک عورت نے گولی ماردی لیکن وہ جانبر ہو گئے۔ گولی دل کے مقام سے دو انچ کی دوری پر اٹک گئی تھی۔ پروفیسر نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ اس عورت کو ضیغم عابدی نامی ایک میوہ فروش نے بھیجا تھا۔ جس سے ان کی نظریاتی کشمکش چل رہی تھی۔ پولیس اس میوہ فروش کو تلاش کر رہی ہے۔ خبر پڑھ کر میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اگر میں ڈھاکا سے نکل جاتا تو سب یہی سمجھتے کہ میں واقعی مجرم ہوں۔ مجھے مردانہ وار مقابلہ کرنا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں ستھرا پور تھانے کے داروغہ کے پاس پہنچ گیا۔ ہکا کے غنڈوں کو شکست دینے کی وجہ سے وہ میرا گرویدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اسے پوری کہانی سنا دی۔ اس نے مشورہ دیا کہ ایس پی صاحب سے مل لوں۔ اسی نے ایس پی صاحب سے ملاقات بھی کرا دی۔ میری اطلاع پر وہ دنگ رہ گئے۔ انھوں نے کہا میں تحقیقات کراؤں گا۔ اگر آپ کی اطلاع صحیح ثابت ہوئی تو آپ کو انعام بھی ملے گا لیکن جب تک میں مطمئن نہیں ہو جاتا' آپ شہر سے باہر نہیں جائیں گے۔

مجھے پتا تھا کہ نائی سنیال کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ اس پر جرم ثابت کرنا ناممکن ہے
بھی یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ امید پر دنیا قائم ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری
پریشانیاں بڑھنے لگیں۔ ایس پی صاحب کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ ہر روز دکان
جاتے وقت سوچتا، آج ضرور پولیس گرفتار کرلے گی۔ ایک روز میں دکان جارہا تھا کہ کسی
آواز دی۔ ''خان بھائی۔''

میں نے مڑ کر دیکھا تو اکھالی میں جس شخص کی میں نے جان بچائی تھی، وہ چلا آرہا
تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے پوچھا ''کہو بھائی شفیق کیا خبر ہے؟ کہاں تھے؟''

''ڈھاکا ہی میں تھا۔ آپ اپنی سنایئے؟''

''بس کسی طرح گزر رہی ہے۔''

''خان بھائی! آپ نے میری زندگی بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے، اسے میں بھول
نہیں سکتا، اس لیے ایک پیشکش کررہا ہوں۔''

''کیسی پیشکش؟''

''چلیے کہیں بیٹھتے ہیں۔ آرام سے بتاؤں گا۔''

وہ سامنے ہی میری دکان ہے۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔''

دکان میں پہنچ کر اس نے کہا۔ ''خان بھائی! اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو کروڑ پتی بنا
سکتا ہوں۔''

''کیسے؟''

''دو ماہ پہلے ہم نے ڈاکا ڈالا تھا اس میں آپ کو حصے دار بنا کر۔''

''اتنی بڑی رقم تو بینک لوٹنے سے بھی ہاتھ نہیں آتی۔ تم نے کہاں ہاتھ صاف کر
لیا؟''

''بینک پر ہی ہاتھ صاف کیا ہے لیکن کرنسی نوٹ نہیں لوٹے۔''

''پھر کیا لوٹا ہے؟''

''ہم نے سفید کاغذ لوٹا ہے۔'' اس نے کہا۔

''سفید کاغذ؟''

''ہاں، لیکن وہی کاغذ ہم سب کو کروڑ پتی بنادے گا۔ لوٹتے وقت ہم پانچ تھے ایک
پولیس کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس کی جگہ آپ کو لے لیتے ہیں۔''



میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنا قیمتی کاغذ کون سا ہے جو پانچ آدمیوں کو کروڑ پتی بنا
دے گا۔ میں نے الجھن رفع کرنے کے لیے پوچھا۔ ''کیا اس کاغذ پر کسی خزانے کا نقشہ ہے؟''

''نہیں، وہ کاغذ ہی خزانہ ہے۔''

''کھل کر بتاؤ تب میں ساتھ دوں گا۔''

''کاغذ کی اہمیت بتانے سے پہلے یہ سن لیں کہ وہ خزانہ ہمارے ہاتھ لگا
کیسے؟ میرے والد اس پریس میں ملازم ہیں جہاں کرنسی نوٹ، عدالتی اسٹامپ اور ڈاک ٹکٹ
چھپتے ہیں۔ میں اپنے والد کا اکلوتا بیٹا ہوں اس لیے بچپن میں ہی بے جا لاڈ پیار سے بگڑ گیا
تھا۔ کچھ اور بڑا ہوا تو بگڑے ہوئے لڑکوں سے دوستی ہوگئی۔ ان کی سنگت نے مجھے جواری اور
شرابی بنادیا۔ بری عادتوں پر امی نے پردہ ڈال رکھا تھا۔ اکثر میں ان سے رقم مانگ لیتا تھا اور وہ
دے دیتی تھیں۔ پہلے دوستوں کے ساتھ جوا کھیلتا تھا دو چار روپے کی بازی لگتی تھی۔ کبھی پاکٹ
خالی ہو جاتی اور کبھی بھاری۔ آہستہ آہستہ میں نے جوئے کے اڈے پر بھی جانا شروع کر
دیا۔ کچی شراب کی بوتل حلق میں انڈیل کر ساری ساری رات جوا کھلتا رہتا۔ اپنا یہ شوق پورا
کرنے کے لیے کبھی ابو کی جیب صاف کردیتا اور کبھی امی کا بٹوا اڑا لیتا۔ یہ بات زیادہ دن تک
پوشیدہ نہ رہ سکی پھر ہر بار امتحان میں فیل ہو جانے پر ابو نے مجھے ٹیکنیکل کام سکھانا شروع
کردیا۔ یعنی خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد مجھے اپنے ساتھ پریس لے جانے
لگے۔ انھوں نے سوچا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی جگہ مجھے لگوادیں گے۔ میرے والد نوٹ
چھاپنے کے لیے رنگ تیار کرتے تھے۔ مختلف رنگوں کو ملا کر خاص کیمیکل تیار کرنے میں ان کا
کوئی ثانی نہیں تھا۔ انھوں نے اپنا فن مجھے بھی سکھانے کی کوشش کی لیکن اس بور کام میں میرا دل
نہ لگا۔ جب بھی موقع ملتا میں نکل بھاگتا۔ مجھے ''گنگا جلی'' کی سیر کا بھی چسکا لگ گیا تھا۔ کسی نئی
وائف کی آمد کا سنتے ہی میں دوڑ پڑتا۔ ایک بار جب میں گنگا جلی میں داخل ہو رہا تھا کہ کسی نے
میری جیب کی صفائی کردی۔ مجھے مطلق خبر نہیں تھی کہ جیب خالی ہو چکی ہے۔ میں شان سے سر
اٹھائے ایک کمرے میں گھس گیا۔ وہاں مجھے احساس ہوا کہ میں قلاش ہو چکا ہوں۔ اس سے
پہلے کہ بات بڑھتی ایک نوجوان نے میری عزت بچالی۔

وہاں سے نکل کر ہم دونوں اسٹار سینما کے پیچھے والے دیسی شراب کے اڈے پر
پہنچے۔ اس نے مالٹا کا آرڈر دیا۔ مرت سنجیونی سورا پینے والے کے لیے مالٹا انگریزی شراب
ہی تھی۔ میں نے دل بھر کے پی۔ پھر وہ مجھے لے کر اپنے گھر پہنچا۔ وہاں ایک اور شخص ملا جس

کا نام شاہد تھا۔ وہ کالومیاں کا دوست تھا۔ ہم تینوں نے ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ کھ
کے بعد باتیں ہونے لگیں۔ میری ٹریننگ کا سن کر کالومیاں نے کہا تم بے بیوقوف ہو
ساتھ دو تو میں تمھیں کروڑ پتی بنادوں گا۔

میں نے پوچھا ایسا کون سا کام ہے؟

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اپنے والد کا فن سیکھ لو۔''

اس ایک جملے نے اس کا مافی الضمیر مجھے سمجھا دیا میں اچھل پڑا تھا۔ حیرت
نگاہوں سے اسے دیکھتے بولا۔ ''واقعی غضب کا آئیڈیا ہے۔ حیرت ہے اب تک میرے
سڑے ہوئے دماغ میں یہ بات کیوں نہ آئی۔ اگر کلر مکسنگ کا فن سیکھ لوں تو نوٹ چھاپنا با
ہاتھ کا کھیل بن جائے گا۔''

اس نے میرے دماغ کو پھر ایک جھٹکا دیا۔ ''لیکن ہم نقلی نہیں اصلی نوٹ چھا
گے۔ جعلی نوٹ تو مارکیٹ میں لے جاتے ہی پکڑے جائیں گے اور کروڑ پتی بننے کی بج
جیل پہنچ جائیں گے۔''

میں پہلے تو ہونقوں کی طرح منہ پھاڑے اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔
پوچھا۔ ''اصلی نوٹ کیسے چھاپیں گے؟''

''یہ تمھیں اگلی ملاقات میں بتاؤں گا۔ اصلی نوٹ چھاپنے کی اسکیم میرے باس
پاس ہے۔ وہی تمھیں سمجھائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

یہ داستان سنانے کے بعد اس نے کہا۔ ''خان صاحب آپ یقین کریں' میں حیر
کے سمندر میں غوطے کھانے لگا تھا کہ وہ اصلی نوٹ کیسے چھاپے گا لیکن تیسرے دن جب
کے باس سنیل مکرجی نے اسکیم بتائی تو میں اچھل پڑا۔''

میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ سنیل مکرجی کنائی سنیال کا داہنا ہاتھ تھا۔ اس ڈ
کا سلسلہ کہیں نہ کہیں ملک کی بنیاد ہلا دینے کی سازش سے ملا ہوا ہے' یہ سمجھنے میں مجھے د
لگی۔ میں پوری دلچسپی سے اس کی روداد سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا تھا۔ شفیق نے سا
لے کر اپنی کہانی پھر شروع کر دی۔ ''خان بھائی! سنیل مکرجی نے اپنا پلان بتانے کے بعد کہا
آج سے چھوٹی موٹی چوریاں کرنا چھوڑ دو۔ جیب خرچ کے لیے ہر ماہ تمھیں دو سو روپے ملا کر
گے۔ جانتے ہو کیوں؟''

میں نے پوچھا۔ ''کیوں؟''



''تاکہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تمھیں چوری نہ کرنا پڑے اور تم پولیس
سے دور رہ سکو۔ کیوں کہ اگر ایک بار تم پولیس کی نظروں میں آ گئے تو میرے لیے بالکل بے کار
ہو جاؤ گے۔''

میں خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

وہ پھر بولا۔ ''اپنے والد کی نظروں میں تم اپنا وقار بلند کرنے کی کوشش شروع کر دو تا
کہ جلد سے جلد ہمارے کام کے لائق بن جاؤ۔ کلر مکسنگ سیکھنے کے بعد تمھاری ملاقات ایک اور
نوجوان سے کراؤں گا جو تمھاری طرح ناکارہ تھا اور اس کے والد بھی اسی پریس میں بلاک
میکنگ کا کام کرتے ہیں اور اب وہ بھی دل لگا کر بلاک میکنگ سیکھ رہا ہے۔'' سنیل نے بتایا۔

''لیکن جناب!'' میں نے کہا۔ ''یہ کام سیکھنے میں تو چھ سات ماہ لگ جائیں گے۔''

''پیارے! پورا ایک سال بھی لگ جائے تو پروا نہیں۔ ہم اصلی نوٹ بنائیں گے، نقلی
نہیں، ایسے نوٹ چھاپیں گے کہ خود ریزرو بینک کا گورنر بھی پہچان نہیں پائے گا کہ نوٹ جعلی ہیں
اور یہ تبھی ممکن ہے جب تم اپنے باپ کے فن میں ماہر بن جاؤ۔'' سنیل مکرجی نے مسکراتے
ہوئے کہا۔

''ایسا نوٹ بھلا کیسے تیار ہو سکتا ہے۔ کلر مکسنگ اور بلاک میکنگ کے علاوہ بھی بہت
سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً نوٹ کے لئے تیار کیا گیا خاص کاغذ۔''

''اسکیم بنانے والے نے ہر پہلو پر غور کر لیا ہے۔ تم ان باتوں پر دماغ نہ
لڑاؤ۔ صرف اپنے اپنے کاموں میں مہارت حاصل کرو۔ ماہر بنتے ہی تمھیں تمام چیزیں فراہم
کر دی جائیں گی۔''

''کیا یہ منصوبہ تمھارا بنایا ہوا نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں!'' سنیل مکرجی نے جواب دیا۔

''پھر کس نے بنایا ہے؟''

''پرنٹنگ پریس کی پوری معلومات رکھنے والے ایک ایسے آدمی نے جسے ڈھیر ساری
دولت چاہیے تاکہ اس پچھڑے ہوئے صوبے کے غریب عوام کی خدمت کر سکے۔''

''ایسا فرشتہ صفت کون ہے؟''

''وقت آنے پر اس سے مل لینا۔ اسی نے تمھاری نشاندہی کی ہے۔''

میں اس دن سے اپنے والد کی نظروں میں مقام حاصل کرنے کے لیے محنت کرنے

لگا۔آٹھ ماہ میں مَیں نے اپنے فن میں مہارت حاصل کر لی۔اس کی خبر میں نے سنیل کو دی۔اس نے جواب میں کہلوایا کہ اگلے ہفتے کاکس بازار میں میٹنگ ہوگی جس میں پورے گروپ کا تعارف کرایا جائے گا۔اس وقت تک ہر ایک اپنا اپنا کام سیکھنے میں لگا ہوا تھا۔اب وہ سب ماہر بن چکے ہیں اس لیے پورے گروپ کو ایک پلیٹ فارم پر لانا ضروری ہوگیا ہے۔

ایک ہفتے بعد میں چٹا گانگ پہنچ گیا۔ایک دن شہر میں گزار کر کاکس بازار پہنچا۔میٹنگ ڈاک بنگلے میں منعقد کی گئی تھی۔ہال میں صرف پانچ آدمی تھے ان میں ایک بارعب شخص بھی تھا۔اسے سب باس کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔اس نے کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا۔’’تقریباً گیارہ ماہ سے ہم سب جس اسکیم پر کام کر رہے تھے،اس کے ارکان ایک دوسرے سے متعارف تک نہ تھے۔یہ بھی اس منصوبے کا ایک حصہ تھا۔میں نے جان بوجھ کر وقت سے پہلے کسی کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیا،لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ سب ایک دوسرے کو پہچان لیں۔یاد رکھیے،آپ سب مل کر ایک اکائی ہیں۔کوئی کسی سے الگ نہیں ہے اس لیے حاصل شدہ رقم مساوی تقسیم ہوگی۔جس پراجیکٹ پر ہم سب الگ الگ کام کر رہے تھے،اسی پر اب ہم سب مل کر کام کریں گے اس لیے میں آپ سے پہلے میں اپنا تعارف کرا دینا بہتر سمجھتا ہوں۔میرا نام کنائی سنیال ہے میں ایک کالج میں پروفیسر تھا لیکن ہمارے صوبے کی غربت نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنے آپ کو اپنے بھائیوں کی خدمت کے لیے وقف کر دوں۔یہ منصوبہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ہم غیر قانونی کام نہیں کر رہے۔اپنے حق کے لیے وہ کر رہے ہیں جو دنیا والوں کی نظروں میں برا ہے،ہم یہ کام عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی خاطر کر رہے ہیں،مغربی پاکستانیوں کی لوٹ مار سے ہمارا صوبہ کنگال ہو چکا ہے۔اس سونا اگلتی دھرتی کو پھر سے خوابوں کی سرزمین بنانے کے لیے ہم سب جہاد میں کود پڑے ہیں۔وطن کی حفاظت میں جب دشمن کو گولی ماری جاتی ہے تو وہ جرم نہیں ہوتا اسی طرح سے ہمارا کام بھی جرم نہیں ہے۔میری راہ پر چلنے والے دوسرے ساتھی کا نام ہے کالو میاں جو شہر کے جانے پہچانے رنگ باز ہیں۔ان کے نام سے پورا شہر کانپتا ہے۔تیسرے ساتھی ہیں۔اکرام جو بلاک بنانے میں ماہر ہیں اور چوتھے ہیں شفیق جو کلر مکسنگ کے فن میں طاق ہیں۔[illegible] ہیں طارق محمود!سیدھے سادے سرکاری ملازم۔معمہ کھیلنے کے شوقین ہیں۔ڈرائیونگ میں ان کا ثانی نہیں ہے۔بہت ہی دلچسپ آدمی ہیں۔بات بات میں ایسی پہیلیاں پوچھ بیٹھتے ہیں کہ سننے والا چکرا جاتا ہے جب کہ جواب بہت معمولی ہوتا ہے۔مثلاً ان



کی میری بیوی کا نام سیتا ہے۔سیتا کے بھائی کا نام رام ہے اور ان دونوں کے باپ کا نام لکشمن ہے۔اسے تم سے میرے بارے میں پوچھنا ہے۔تو وہ اس طرح سے نہیں پوچھے گا کہ یہ آدمی جو سامنے کھڑا ہے،اس کا کیا نام ہے۔گھما پھرا کر اچھی خاصی پہیلی بنا دے گا۔پوچھے گا کہ لکشمن کے بیٹے کی بہن کے شوہر کا نام بتاؤ۔اس عجیب عادت کی وجہ سے طارق ایک دلچسپ آدمی ہے۔اگر اب بھی نہیں سمجھے تو ایک پہیلی طارق سے ہی پوچھ لو۔‘‘

’’میں پوچھوں گا۔‘‘ کھڑے ہو کر میں نے کہا۔

میرے تجسس کو بھانپ کر کنائی سنیال کے کچھ بولنے سے پہلے ہی طارق نے سوال کر دیا۔’’مانا کہ تم ایک پائلٹ ہو۔ایک ہوائی جہاز لے کر چٹا گانگ سے وایا جیسور ڈھاکا راج شاہی کے لیے چلتے ہو۔جب ہوائی جہاز چٹا گانگ سے چلتا ہے تو اس میں ایک سو پچیس مسافر ہیں۔جیسور پہنچنے پر چونسٹھ مسافر اتر جاتے ہیں اور بتیس دوسرے سوار ہو جاتے ہیں۔اسی طرح ہوائی جہاز میں اب جو تعداد ہے اس میں سے راج شاہی میں بیس مسافر اتر جاتے ہیں اور چونسٹھ سوار ہو جاتے ہیں۔یاد رکھیے حساب میں گڑبڑ نہ ہو اس لیے پھر دہراتا ہوں کہ راج شاہی میں بتیس مسافر اترے اور چونسٹھ چڑھتے ہیں۔سمجھ گئے۔‘‘

’’جی!‘‘ میں نے دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے کہا۔

’’اب تم حساب لگا کر بتاؤ اس پائلٹ کی عمر کیا ہے؟‘‘

طارق نے کہا تو میرا دماغ گھوم گیا۔ابھی تک میں سوچ رہا تھا کہ وہ شاید مجھ سے ڈھاکا پہنچنے والے مسافروں کی تعداد پوچھے گا مگر اس نے عجیب سا سوال کر دیا۔میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔’’مسافروں کی تعداد سے پائلٹ کی عمر کا کیا تعلق ہے؟‘‘

’’بھئی میرا سیدھا سا سوال تھا۔میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا تم ایک پائلٹ ہو۔یعنی میں نے تمھاری عمر پوچھی تھی۔‘‘

پہلی ملاقات میں ہی میں نے اسے اپنا دوست بنا لیا۔وہ تھا بھی بہت عقل مند۔اس سے متعارف کرانے کے بعد کنائی سنیال نے کہا۔’’اور اب میں اس گروپ کی جان سے آپ کا تعارف کراتا ہوں۔ان کا نام آرتی ہے۔جیسے بھگوان کی آرتی اتاری جاتی ہے،پوجا کی جاتی ہے ویسے ہی ان کی پوجا کی جا سکتی ہے۔یہ دیکھنے میں جتنی حسین ہیں،اتنی ہی عقل کی تیز ہیں۔ناچ ان کا شوق ہے۔ناچتے وقت جیسے ان کا انگ انگ تھرکتا ہے اور ناظرین کا دل تھرکتا ہے اسی طرح سے یہ اپنی عقل کے بل پر اچھے اچھوں کو تگنی کا ناچ نچا دیتی ہیں۔‘‘

تعارف کے بعد ہم سب نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ چائے کا دور چلا او
سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ کنائی سنیال نے کھڑے ہو کر کہا۔ ''اب آپ کو منصوبے کی پہلی
کے بارے میں طارق صاحب بتائیں گے لیکن پہیلیوں میں نہیں صاف صاف الفاظ میں۔''
کنائی سنیال کے بیٹھتے ہی طارق محمود کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''جیسا کہ آپ کو معلوم
ہے' میں ڈرائیوار ہوں غیر ممالک سے تیار ہو کر آنے والے خاص کاغذ کو بھی ایئر پورٹ
پہنچانا میری ذمے داری ہے۔ جس وین میں وہ خاص کاغذ لے جاتا ہوں' وہ سوزوکی جتنی چھ
ہے فرق اتنا ہے کہ وین کی باڈی ایک انچ موٹی اسٹیل کی ہے۔ شیشے بلٹ پروف ہیں۔ و
اندر سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ ڈرائیور کی سیٹ اور اس حصے کے درمیان جس میں نو
چھاپنے کا کاغذ رکھا جاتا ہے اسٹیل کا پارٹیشن ہے۔ اس پارٹیشن میں چھ انچ کی چوکور کھڑکی
جس سے ڈرائیور پیچھے بیٹھے ساتھیوں سے بات کر سکتا ہے۔ پچھلا حصہ اگلے حصے سے تین گنا
ہے۔ اسی حصے میں کاغذ رکھا جاتا ہے اور دو بندوق بردار بھی بیٹھتے ہیں۔ وین میں صرف
دروازے ہیں۔ ایک ڈرائیور کے لیے اس کے داہنی طرف اور دوسرا پچھلے حصے میں کاغذ لاد
کے لیے پیچھے کی طرف۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وین کے پیچھے والی دیوار دراصل اسٹیل
دو بڑے کواڑوں سے مل کر بنتی ہے۔ دونوں ہی دروازوں میں آٹو میٹک تالا ہے۔ اس خود
تالے کو صرف اندر سے بند کیا جا سکتا ہے اور جب وہ بند ہو جاتا ہے تو باہر سے کسی بھی حال
میں نہیں کھل سکتا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے طارق سے پوچھا۔

''ایئر پورٹ سے کاغذ لے کر جب وین گودام کے لیے چلتی ہے، تب اس
ساتھ صرف دو آدمی ہوتے ہیں۔ ایک ڈرائیور دوسرا پچھلے حصے میں کاغذ کی حفاظت کے
متعین بندوق بردار۔ دونوں کے لیے سختی سے حکم ہے کہ ایئر پورٹ سے چلنے سے قبل دروازو
کے سوئچ اندر سے بند کر کے چیک کر لیں اور کسی بھی حالت میں نہ کھولیں۔'' طارق نے تھوڑا
توقف کرنے کے بعد پھر سے کہنا شروع کیا۔ ''ڈرائیور کے لیے سختی سے حکم ہے کہ وہ ہوا
مستقر اور گودام کے درمیان کسی بھی حالت میں گاڑی نہ روکے۔''

''اگر فائرنگ کر کے ٹائر پھاڑ دیا جائے تو؟'' آرتی نے سوال کیا۔

''ونڈ اسکرین کی طرح ٹائر بھی بلٹ پروف ہیں۔ انہیں ایک امریکی
نے خاص طور پر بنایا ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔



''وین میں کھڑکی وغیرہ تو ہوگی۔ سانس لینے کے لیے ہوا کی ضرورت تو ہوتی ہے
نا؟''

''ہوا کے لیے آسانی سے نظر نہ آنے والے سوراخ ہیں۔ اس کے علاوہ چار انچ
کے دو سوراخ اور بھی ہیں لیکن ان پر ڈھکن لگا رہتا ہے اور وہ تبھی کھل سکتا ہے جب گارڈ چاہے۔
انہیں اس وقت کھولتا ہے جب فائرنگ کی ضرورت پڑے۔ سب سے اہم چیز ڈرائیونگ
والے حصے میں لگا وائرلیس ہے۔ جسے آن کرتے ہی پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم ہو جاتا
ہے۔ کسی بھی قسم کا خطرہ محسوس ہوتے ہی اسے آن کر دینے کا حکم ہے۔ تاکہ مدد کیلئے پولیس کی
موبائل گاڑیاں فوراً دوڑ پڑیں۔''

''میری سمجھ میں تو بالکل نہیں آ رہا ہے کہ اس وین کو کیسے لوٹا جائے۔ وہ تو ناقابل تسخیر
قلعے کا نمونہ ہے۔'' اکرام نے کہا۔

''یاد رکھیے کہ دنیا میں ایسا کوئی بھی مسئلہ نہیں جو سلجھ نہ پائے۔ ہر مسئلے کا حل ممکن
ہے۔ صرف دماغ لڑانے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویگن انسان نے بنائی ہے خدا نے
نہیں۔ اس لیے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کمی یا خامی ضرور ہوگی اسی کو تلاش کرنا ہمارا کام ہے اور
یہ تلاش کر لیا جائے گا۔ اب بتاؤ تمہاری وین کا ٹائم ٹیبل کیا ہے؟'' کنائی سنیال نے پوچھا۔

''جس طیارے سے کاغذ آ رہا ہے، اس کے لینڈ کرنے سے پانچ منٹ قبل وین
ہوائی مستقر پر پہنچے گی۔ پندرہ منٹ کے قلیل وقفے میں کاغذ لادا جائے گا اور سولہویں منٹ پر
وین چل پڑے گی۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ چالیس منٹ کی رفتار سے ڈرائیو کروں۔ اس طرح
آدھے گھنٹے میں گودام پہنچ جاؤں گا۔ دس منٹ گزرنے سے پہلے مجھے فارم گیٹ کراس کرنا
ہوگا۔ وہاں اسپیشل اسکواڈ کھڑی ہوگی۔ وہ پاک موٹر پر کھڑی اسکواڈ کو خبر دے گی۔ پاک
موٹر چورنگی پر مجھے بیسویں منٹ پر پہنچنا ہے۔ وہاں سے نگ بازار کی طرف مڑنا ہے اور آدھے
گھنٹے میں موتی جھیل۔''

طارق کی باتوں کو آرتی بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس نے یکایک سوال کے لیے
ہاتھ اٹھا دیا۔ طارق نے رک کر پوچھا۔ ''کوئی سوال ہے کیا؟''

''ہاں۔'' آرتی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت تیج گاؤں والی سڑک پر
رش ہوتا ہوگا۔''

طارق نے کہا۔ ''بے شک۔''

"یعنی سڑک پر ہم کوئی واردات نہیں کر سکتے ؟"

"میرے خیال میں نہیں ۔ کیوں کہ سیکورٹی بڑی سخت ہوتی ہے ۔ پھر ملٹری وا
گشت کرتے رہتے ہیں ۔"

"یعنی ایئر پورٹ پر واردات ناممکن ہے ۔"

"جی ہاں ۔"

"فلائٹ کب آ رہی ہے ؟" کالومیاں نے پوچھا۔

طارق نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر پہیلیوں والے انداز میں بولا ۔"ایک
ہے اس سمندر میں چار سو اسّی گھنٹے نیچے سونے سے بھری ایک وین ہے ۔ کیا آپ میں
دن کی لمبائی ناپ سکتا ہے ۔"

"دن کوئی کپڑے کا تھان ہے جسے گز لے کر ناپنا شروع کر دیں ۔" کالومیا
جھنجلا کر کہا۔

"دن بھی تھان ایسی چیز ہے پیارے چار سو اسّی گھنٹے کا مطلب ہے بیس دن"

"یعنی بیس دن بعد کا غذ آ رہا ہے ۔" آرتی نے کہا۔

"ہاں!" طارق نے جواب دیا۔

"کتنا کا غذ آ رہا ہے ۔" میں نے پوچھا۔

چار کروڑ اسّی لاکھ روپے چھاپنے کے لئے ۔"

"یعنی ہم سب کے حصے میں اسّی اسّی لاکھ روپے آ سکتے ہیں ۔"

"ہاں ۔" طارق نے جواب دیا۔

کنائی سنیال نے کہا ۔" دوستو! اس اسّی لاکھ حاصل کرنے کے لیے ہم سب ک
شروع کر دینا چاہیے ۔ میرا پلان یہ ہے کہ طارق کی وین ایسی ایک اور وین ایئر پورٹ ۔
کھڑی ہوگی ۔ دیکھنے میں بالکل اصلی وین لگے گی لیکن معمولی چادروں سے بنی ہوگی ۔ اس
کو ڈرائیو کریں گی مس آرتی ۔ ایئر پورٹ کے احاطے سے طارق کی وین نکلے گی اور اس
چل دے گی یعنی کرمی ٹولہ کی سمت ۔"

"ٹھہریے ۔" آرتی نے اس کی بات کاٹی ۔" کرمی ٹولہ میں ملٹری چھاؤنی
ملٹری پولیس ہر گاڑی کو روک کر چیک کرتی ہے ۔"

"نو بے بی!" سنیال بولا ۔" طارق چھاؤنی سے پہلے بچوکھیت کی جانب مڑ جا



اور کچی سڑک سے ہوتا ہوا پائیک پاڑا نکلے گا ۔ وہاں سے میر پور کی جانب مڑ جائے گا ۔ ایوب
خان کے حکم سے بہاریوں کے لیے جو کالونی تیار کی جا رہی ہے ، اس کے آگے میرے دوست کا
فارم ہاؤس ہے وہاں جا کر وہ وین کو چھپا دے گا اور آرتی اسپیشل اسکواڈ کو دھوکا دینے کے لیے
مسلسل نقلی وین دوڑاتی ہوئی گمگ بازار تک جائے گی اور موتی جھیل کی طرف مڑنے کی بجائے
کملا پور کا راستہ پکڑ لے گی ۔ وہاں میرے ایک شناسا کا موٹر گیراج ہے وہ اس گیراج میں وین کو
کھڑا کر دے گی ۔ پولس والے جب تلاش میں نکلیں گے تو ان کا دائرہ گمگ بازار سے موتی
جھیل تک محدود رہے گا ۔"

"منصوبہ ہر طرح سے مکمل ہے ۔ بھگوان نے چاہا تو کامیابی ہمارے قدم چومے
گی ۔" سنیل نے کہا۔

"ایک بات رہ گئی ۔" آرتی بولی۔

"کیا ؟" کنائی سنیال نے پوچھا۔

"کیا کسٹم کے افسران گارڈ اور ڈرائیور کو پہچانتے ہیں ؟"

"کسٹم والوں کو ادھر جانے کی ممانعت ہے ۔ پی آئی اے کا کیپٹن بکس مجھے سونپتا
ہے ۔ میں دستخط کر کے اسے وصول کرتا ہوں اور گارڈ کے ساتھ مل کر وین تک خود اٹھا کر لاتا
ہوں" ۔ طارق نے بتایا۔

"آپ لوگ مطمئن ہو گئے ہیں تو اپنی اپنی ڈیوٹی سمجھ لیں ۔ آرتی نقلی وین میں
رہے گی ، کالومیاں اور میں ایک نمبر گیٹ پر ، سنیل لاؤنج میں طارق کے پیچھے رہے گا ۔ اب آپ
لوگ اسائنمنٹ ڈیٹ پر اپنی اپنی جگہ پر ملیں گے ۔ آج کی میٹنگ ختم کی جاتی ہے ۔"

میٹنگ کے بعد ہم سب مختلف راستوں سے ڈھاکا لوٹ آئے ۔ ایک ایک کر کے
بیس دن گزر گئے اور اسائنمنٹ والا دن آ گیا۔

میں نے بس پکڑی اور تیج گاؤں ایئر پورٹ جا پہنچا ۔ منصوبے کے مطابق آرتی
سنیل ، کالو اور کنائی سنیال اپنی اپنی جگہ موجود تھے لیکن اجنبیوں کی طرح دور دور ۔ ہماری نظریں
ایک دوسرے سے ملیں ضرور لیکن کسی نے بھی احساس نہ ہونے دیا کہ ہم آپس میں واقف کار
ہیں ۔ میرا دل دھڑک رہا تھا شاید اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ کچھ دیر بعد یہاں ایک بڑی
واردات ہونے والی ہے جسے خون خرابے کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور اس خون خرابے میں ہم
سب کو برابر کا حصہ لینا ہے ۔

لاؤنج میں موجود لوگوں کی تعداد کو زیادہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن کم بھی نہیں پچاس کے قریب لوگ وہاں موجود تھے میں سوچ رہا تھا کہ کیا اتنا بڑا معرکہ اتنی آسانی سر ہو جائے گا جیسا سنیال نے سوچا ہے؟ یہ سوچ تار عنکبوت کی طرح میرے ذہن پر چھ تھی۔ ایک ایک پل صدیوں کی طرح گزر رہا تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چ اسٹیل کی بنی ایک چھوٹی سی وین ایک نمبر گیٹ کے سامنے آ کر رکی تھی۔ اس وین کے پولیس کی جیپ بھی تھی اسی جیپ کو دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ طارق نے یہ نہیں بتایا تھا اس کی وین کو پولیس والے اسکواڈ کر کے لے جاتے ہیں۔ یہ ایک نئی الجھن تھی۔ میں نے کی طرف دیکھا اس کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو گیا تھا۔ پلان مٹی میں ملتا ہوا نظر آ رہا میرے دل کی دھڑکنیں اس طرح بڑھتی جا رہی تھیں جیسے بھاپ کا انجن آہستہ آہستہ رفتار سے اور پھر چھک چھک چھک کرتا ہوا دوڑنے لگتا ہے۔ میں نے کالومیاں اور سنیل ڈالی تو ان کے چہرے بھی اندرونی تغیر کی گواہی دے رہے تھے۔

وین ''یو'' ٹرن لے کر رک چکی تھی۔ پچھلا اور ڈرائیور والا دروازہ کھل رہا تھا۔ د اور گارڈ ایک ساتھ ہی اترے تھے۔ گارڈ تندرست و توانا تھا۔ طارق کے جسم پر سفید ورد اور گارڈ خاکی وردی میں تھا۔ اس نے کندھے سے بندوق لٹکا رکھی تھی۔ وہ دونوں ایک دو کے پیچھے چلتے ہوئے رن وے کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ گیٹ پار کرتے کرتے گارڈ ن تھا اور اس نے طارق سے کچھ کہا تھا۔ دونوں واپس مڑے تھے۔ اس پر سے ہوتی ہوئی نظر کالومیاں پر پڑی تو میرا دل کانپ اٹھا۔ اس کمبخت کا چہرہ خونخوار درندے جیسا نظر آ ر میں نے اس پر سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے پولیس کے جوانوں اور ائیرپورٹ سیکورٹی گارڈز کا جائزہ لیا۔ سب چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ میرا جسم سن پڑنے لگا۔ میر ارق کی جانب دیکھا۔ وہ گارڈ کے ساتھ باتھ روم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انہیں گیلری کی ج بڑھتے دیکھ کر میں نے بھی اسی جانب قدم بڑھا دیے۔ گیلری سنسان پڑی تھی طارق باتھ کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے آنکھوں سے باتھ روم کی جانب اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ گارڈ ہے۔ دروازے سے لگ کر کھڑے ہوتے ہوئے میں نے گیلری کی جانب دیکھا۔ کالو چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے سنیل تھا۔ نزدیک پہنچتے ہی ان دونوں نے چاقو نکال لیا۔ میں لرز اسی وقت دروازہ کھول کر گارڈ باہر نکلا تو اس کے منہ پر کالومیاں کی ہتھیلی ڈھکن بن گئی۔ سا ساتھ سنیل کا گھونسا اس کی کنپٹی سے ٹکرایا اور گارڈ لہرا کر کالومیاں کے بازو پر جھول گیا۔



کھینچتے ہوئے وہ دونوں باتھ روم میں گھس گئے۔ میں چھوٹی موٹی چوریاں ضرور کرتا ہوں لیکن لڑائی بھڑائی سے دور رہتا ہوں۔ کسی زندہ انسان کو موت کے منہ میں جاتے دیکھ کر میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ میں نے برابر والے باتھ روم کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اس نئی مصیبت نے مجھے حواس باختہ کر دیا۔ دروازہ بند ہونے کا یہ مطلب تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔ ٹھیک اسی وقت ایک دبی دبی سی چیخ گلیارے میں گونج گئی۔ وہ چیخ اس باتھ روم سے ابھری تھی جس میں کالو اور سنیل گارڈ کو لے کر گھسے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ چیخ کس کی ہے میری آنکھوں کے سامنے خون ہی خون لہرا گیا تھا۔ گارڈ کے جسم سے نکلتا خون اور اس خون سے سنا سنیل کا چاقو۔

بمشکل ایک منٹ بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا اور سنیل چاقو بند کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کے پیچھے کالو تھا اس نے مجھے حکم دیا۔ جلدی وقت کم ہے۔ اپنا اوورکوٹ اتار کر مجھے دو۔ میں نے کوٹ اتار دیا۔ میرے جسم پر گارڈ کی وردی تھی۔ گارڈ کی پی کیپ سر پر رکھی اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ اب میرے کندھے پر گارڈ کی بندوق تھی اور ساتھ میں طارق تھا۔ کالومیاں باتھ روم کو اندر سے بند کر کے دیوار پر چڑھ کر باہر آ چکا تھا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے آنے لگا۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں طارق سے پوچھا۔ ''پولیس کی جیپ کیا ہر بار ساتھ رہتی ہے؟''

''نہیں، وہ جیپ فارم گیٹ سے ساتھ ہوئی ہے۔ شاید کسی کو لینے آئی ہے۔'' طارق نے جواب دیا۔

ہم دونوں تیز قدم اٹھاتے ہوئے رن وے پر پہنچے کاغذ کا بکس تیار تھا۔ دو قلیوں کی مدد سے اسے اٹھا کر اوپر رکھا اور اسے ڈرائیو کرتے ہوئے باہر لے آئے۔ ویگن میں بکس رکھتے وقت میں نے پولیس جیپ پر نظر ڈالی۔ وہ لوگ بھی جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جیپ میں سوٹ کیس رکھا نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ طارق کا اندازہ صحیح تھا۔ جیپ کے باہر نکلتے ہی طارق نے ویگن اسٹارٹ کر دی۔ میں پچھلے حصے میں بیٹھا تھا اور وین سپاٹ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اتنی دیر بعد میری جان میں جان آ گئی تھی۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں اسی لاکھ روپے کا مالک بن چکا ہوں لیکن قسمت کے لکھے کو کون ٹالے۔ مجھے مطلق خبر نہیں تھی کہ ایک بہت بڑی الجھن منہ پھاڑے کھڑی ہے۔ ایسی الجھن جس سے فرار ممکن نہیں ہے اور سارا منصوبہ خاک میں ملنے والا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' طارق نے درمیانی پارٹیشن کی کھڑکی کی جانب منہ کر کے مجھ

سے پوچھا اور پھر پھرتی سے سر گھما کر ونڈ اسکرین سے باہر دیکھنے لگا۔

''کچھ نہیں ہم کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کرمی ٹولہ روڈ پر، اب میں کچوکھیت کی طرف مڑ رہا ہوں۔'' اس نے اسٹیئ
گھمایا تو وین ہچکولے کھانے لگی۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے بریک دبا دیا اور بولا۔ ''تم
اتر جانا چاہیے۔ پیچھے ٹرک پر وہ لوگ آ رہے ہوں گے ان کی مدد کرنے کے لیے تمہیں
کھڑے رہنا ہے۔''

میں نے سوئچ آن کیا۔ دروازے پر لگا لاک کھل گیا۔ دروازہ کھول کر میں نے
قدم رکھا تو دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ طارق وین کو آہستہ آہستہ ترچھا کرنے لگا۔ شام
دھندلکے میں وین کی ہیڈ لائٹ دور تک پھیلے کھیت کو روشن کرتی چلی گئی۔ کھیت میں یہاں
وہاں تک لوہے کی چادریں بچھی تھیں۔ چادریں دس فٹ چوڑی اور بیس فٹ لمبی تھیں۔
دوسرے سے ملی وہ دور تک پھیلی نظر آ رہی تھیں۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ کھیت
دس فٹ چوڑی اور تین سو فٹ لمبی لوہے کی پوری ایک سڑک بنی ہوئی تھی۔ جو منصوبے
مطابق ایک گھنٹا پیشتر سنیال نے سنیل کالو اور آرتی کی مدد سے تیار کی تھی۔ پندرہ چادر
تھیں۔ جنھیں ایک دوسرے سے ملا کر بچھایا گیا تھا تا کہ کچی سڑک کو دوسری جانب کی پکی سڑ
سے ملا دیا جائے۔ یہ سارا انتظام اس لیے کیا گیا تھا کہ وین کے غائب ہو جانے کی خبر پا کر
ادھر بھی تلاش کرنے کوئی جیپ وغیرہ آئے تو اسے وین کے ٹائروں کا نشان نہ ملے۔ اس
سڑک کی جانب کسی کا دھیان جا ہی نہیں سکتا کیوں کہ وہ سڑک سیدھی تھی اور راستے میں
سے ملتی ہوئی کوئی سڑک نہیں تھی۔

وین اس سڑک پر جانے کے لیے چادروں کی سڑک پر آہستہ آہستہ سرکنے لگی
کھیت کو پار کر کے دوسری سڑک پر اتر گئی پھر اس کی پچھلی لال روشنی دور ہوتے ہوئے غائ
ہوگئی۔

میں نے رخ موڑ لیا اور ادھر دیکھنے لگا جدھر سے ہم آئے تھے۔ کچھ دیر بعد دور۔
روشنی کے دو نقطے نظر آئے۔ وہ روشنی نزدیک آتی جا رہی تھی۔ پھر ٹرک کے انجن کی گڑگڑاہ
سنائی دی اور چند لمحوں بعد ایک ٹرک میرے نزدیک رک گیا۔ اس میں سے سنیال، سنیل اور ک
کودے۔

''کیا رہا؟'' سنیال نے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔



''کامیابی، وین لوہے کی سڑک پار کر کے اپنی منزل کی جانب چلی گئی۔''

''گڈ۔ اب ہمیں لوہے کی یہ سڑک ہمیشہ کے لیے ختم کر دینی ہے۔'' یہ کہنے کے
ساتھ ہی سنیال پھر ٹرک ڈرائیونگ سیٹ کی طرف لپکا اور اگلے ہی پل ٹرک کا انجن جاگ اٹھا۔
ٹرک نے ٹرن لیا اور پھر وہ بھی وین کی طرح لوہے کی سڑک پر آ گیا۔ سنیل اور کالو
کھیت میں کود گئے۔ ان کی مدد کے لیے مجھے بھی کھیت میں اتر جانا پڑا۔ دھان کی بوائی کے لیے
کھیت میں پانی بھر دیا گیا تھا۔ میں ٹخنے تک کیچڑ میں دھنسا۔ چھپڑ چھپڑ کرتا ہوا پہلی چادر تک پہنچ
گیا۔ ٹرک تیسری چادر پر کھڑا تھا۔ پہلی چادر کو ہم تینوں نے مل کر اٹھا لیا اور اسے ٹرک پر لوڈ کر دیا
ٹرک چوتھی چادر پر گیا تو دوسری کو اٹھا لیا۔ اسی طرح تمام چادروں کو ٹرک پر لاد دیا۔

کام پورا ہوتے ہی سنیال نے کہا۔ ''وقت کم ہے۔ فوراً ٹرک پر سوار ہو جاؤ۔''

ہم سب خوشی سے سرشار بھاگتے ٹرک پر سوار خیالوں میں کرارے کرارے نوٹ
گن رہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم سب بہاریوں کے لیے زیر تعمیر کالونی کو پار کرتے
ہوئے میرپور کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ ہمیں سنیال کے دوست کا کولڈ اسٹوریج دور سے نظر
آ رہا تھا۔ اسی کولڈ اسٹوریج میں ٹرک رکھنا تھا تا کہ کوئی ڈھونڈ نہ سکے۔ فارم ہاؤس کے احاطے
میں پہنچتے ہی سنیال تقریباً چیخ اٹھا۔ ''یہ کیا؟'' ہم سب بھی چونک گئے تھے۔ دروازے پر تالا لگا
ہوا تھا۔

منصوبے کے مطابق تالا کھلا ملنا چاہیے تھا۔ تالا کھولنے کی ذمے داری طارق کی تھی
لیکن قفل بند ہونے کی وجہ سے ہم سمجھ گئے کہ وہ پہنچا نہیں ہے۔ ایک چابی سنیال کے پاس بھی
تھی۔ اسی سے تالا کھولا گیا اور پھر ٹرک کو اندر لے جا کر گیٹ بند کر دیا گیا۔ اندر چاروں طرف
آلو کے بورے رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی بوروں کو ٹرک پر لاد دیا گیا تا کہ چادریں بھی
چھپ جائیں اور دیکھنے والا سمجھے کہ ٹرک مال لے کر آیا ہے۔

ٹرک پر بورے لادنے کے بعد سنیال ہم سب کو ساتھ لے کر پچھلے حصے میں پہنچا۔
اس چھوٹے سے کمرے میں پرنٹنگ پریس لگا ہوا تھا۔ پرنٹنگ کا سارا سامان وہاں موجود تھا۔
انک، کلے اور چپس وغیرہ ٹیبل پر رکھے نظر آ رہے تھے۔ طارق کو کاغذ یہیں لانا تھا۔

''آخر وہ گیا کہاں؟'' کالو میاں نے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آتا۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا؟'' میں نے کہا۔

''کہیں وہ بے ایمانی پر تو نہیں اتر آیا۔'' سنیل نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں، وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ پرنٹنگ پریس اور بلاکوں کے بغیر وہ نوٹ کیسے چھاپے گا؟" سنیال نے جواب دیا۔

رات ایک بجے تک ہم سب اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے کہ آرتی پہنچ گئی۔ اس نے ہمارے ہوش اڑا دیئے۔ اس کی وین کو پولیس نے پاک موٹر میں روک لیا تھا۔ پولیس والوں کو واردات کی اطلاع بروقت مل گئی تھی۔ جس دروازے کو ہم نے بند دیکھ کر نظرانداز کر دیا تھا اس میں کوریر مین تھا۔ اس نے واردات کے وقت دم سادھ رکھی۔ پولیس ہیڈ کوارٹر سے وائرلیس پر وین سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور اس کی تلاش میں پولیس کی کئی پارٹیاں بھی نکل پڑی تھیں، ان کے پاس طارق کے فوٹوگراف بھی تھے۔ پولیس والوں کو طارق کی تصویر اسی محکمے سے ملی تھی۔ باتھ روم میں بند ہو جانے والے نے پولیس کو ڈاکو کا جو حلیہ بتایا تھا، ان میں سرفہرست طارق کا حلیہ تھا، جسے طارق کے باس نے نوٹ کر لیا تھا، یوں بھی وہاں صرف گارڈ کی لاش تھی جو خاموش زبان سے چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ میں اکیلی اس لیے ہوں کہ طارق ڈاکوؤں سے مل گیا ہے۔ پولیس پارٹی نے طارق کے گھر پر بھی تلاشی لی تھی۔ وہاں اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ جاتے وقت کہہ گئے تھے کہ رات میں نہیں آئیں گے لیکن اس کے بیان پر پولیس والوں کو یقین نہ آیا اور وہ مکان سے کچھ دور گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔

رات کو ساڑھے بارہ بجے طارق وہاں آیا۔ وہ دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا کہ پولیس والوں نے اسے گھیر لیا۔ وقت سے پہلے خطرے کو بھانپ کر طارق وہاں سے بھاگا۔ پولیس والے اس کے پیچھے لپکے۔ اسے رک جانے کا حکم دیا لیکن وہ نہ رکا تو پولیس نے گولی چلا دی۔ وہ تڑپ کر زمین پر گرا اور مر گیا۔ گولی اس کے سینے کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔"

آرتی کی خبر نے ہمارے ہوش اڑا دیئے تھے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ طارق اتنی دیر تک کہاں رہا۔ وین گودام میں نہیں پہنچی تھی۔ اسے اس نے کہاں چھپایا ہے؟ آرتی کے مطابق وین پولیس والوں کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی پھر وہ گئی کہاں؟

اسی سوال کا جواب تلاش کرنے ہم سب واپس شہر آ گئے۔

اگلے دن کا اخبار ہم لوگوں نے چھان مارا لیکن وین کی کوئی خبر نہیں تھی۔ صرف ایک کالم کی مختصر سی خبر تھی کہ نیل کھیت میں ایک جرائم پیشہ پولیس کی گولی سے مارا گیا ہے۔ ڈاکے کی خبر کو حکومت نے دبا دیا تھا۔

ہم لوگوں نے اپنے اپنے ذرائع سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ پولیس سرگرمی سے وین



تلاش کر رہی ہے۔ ہم لوگوں نے وین پر فاتحہ پڑھ لی تھی ہر ایک کا دل ٹوٹ گیا تھا کہ سنیل نے کہا۔ "وین کا پتا لگانے کا ایک طریقہ ہے؟"

"کون سا؟" آرتی نے پوچھا۔

"سارے ارکان کو جمع کرو تو میں بتاتا ہوں۔"

اسی دن تمام ارکان جمع ہو گئے۔

سنیل نے سب کے سامنے ایک نیا منصوبہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ وہ روح کو پلان شیڈ بورڈ پر بلا سکتا ہے۔

انگریزی کتابوں میں، میں نے بھی پلان شیڈ بورڈ کے بارے میں پڑھا تھا لیکن اسے شعبدہ سمجھا تھا جب کہ سنیل کا دعویٰ تھا کہ وہ اس علم سے واقف ہے۔

"تمہارا کیا خیال ہے طارق کی روح پلان شیڈ بورڈ پر آ جائے گی اور تمہارے سوال کا جواب دے گی؟" آرتی نے سوال کیا۔

"نہیں، میں صرف اسے بلا سکتا ہوں لیکن جواب دینا یا نہ دینا اس کی مرضی پر ہے۔ وہ اگر جواب دینا چاہے گی تو معمول کے ذریعے جواب دے گی۔"

"تم۔ تمہارا ستارہ میزان ہے۔ یہی سب سے ہلکا ستارہ ہوتا ہے۔ تولا رشی والوں کو ہر قسم کے عمل میں معمول بنایا جا سکتا ہے۔"

سنیل کی بات پر سب نے آرتی سے التجا کرنا شروع کر دی کہ وہ راضی ہو جائے۔

"جب سب کی یہی خواہش ہے تو میں تیار ہوں۔" آرتی نے کہا۔

"آدھی رات کا انتظار کرو۔ تب تک میں تیاری کر لوں۔" سنیل نے کہا تو ہم سب سنیل کے گھر میں ہی ٹھہر گئے۔

رات کے بارہ بجے سنیل نے سب کو دائرے کی شکل میں زمین پر بٹھا دیا اور آرتی کو درمیان میں۔ کچھ دیر تک پتا نہیں کیا کیا بدبداتا رہا پھر بولا۔ "اب لائٹ آف کر دو۔" سنیل نے لائٹ آف کر دی۔ آرتی کے سامنے روشن شمع اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام تھی ملگجے اندھیرے نے ماحول کو پراسرار بنا دیا تھا۔ عجیب سا بوجھل پن پھیل گیا تھا اور پھر وہ بوجھل پن بڑھتا گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسا لگا گویا کمرے میں ہم پانچ افراد کے علاوہ بھی کوئی ہے لیکن شمع کی زرد روشنی میں صرف پانچ سائے نظر آ رہے تھے۔ یکایک میری نظر آرتی کے سامنے رکھے پیڈ پر پڑی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ قلم بغیر کسی سہارے کے خود بخود لیٹر پیڈ پر

رواں تھا۔

سنیل نے سوال کیا۔ ''کیا تم آ گئے ہو؟''

قلم پھر چلنے لگا۔

کچھ توقف کے بعد سنیل نے پھر سوال کیا۔ ''اپنا نام بتاؤ۔''

قلم پھر حرکت میں آ گیا۔

جواب پڑھتے سنیل کے لبوں پر مسکراہٹ تھرک اٹھی میں سمجھ گیا کہ مطلوبہ جواب گیا ہے۔

سنیل نے ہم سب پر نظر ڈالی اور پھر کھرکھراتی آواز میں بولا۔ ''کیا تم ہمیں وین پتا بتا سکتے ہو؟''

قلم پھر کاغذ پر دوڑنے لگا۔ کاغذ پر نب گھسنے کی کھرکھراہٹ میری سماعت دھماکے جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ قلم کے رکتے ہی سنیل نے تحریر کو پڑھا اور پھر بولا۔ ''اب کچھ کے لیے تم جا سکتے ہو۔ ضرورت پڑی تو پھر بلا لیں گے۔''

قلم فوراً پیڈ پر گر گیا۔ ایسا لگا تھا جیسے نادیدہ ہاتھ نے اسے چھوڑ دیا ہو پھر سنیل اپنی جگہ سے اٹھا تھا اور چٹ کی آواز کے ساتھ کمرا روشن ہو گیا۔

ہم سب پیڈ پر لکھے جملوں کو پڑھنے کے لیے آگے بڑھ آئے تھے۔ پہلے سوال کے جواب میں ہاں لکھا تھا۔ دوسرے سوال کے جواب میں طارق تیسرے سوال کے جوب میں لکھا تھا کچھ شرطوں پر۔

ان جوابات نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کی لکھائی پہچانتے تھے وہ صد فیصد طارق کی لکھائی تھی۔ اس نے آخر میں لکھا تھا۔ ''میں آرتی کے ذریعے اپنے جوابات تم تک پہنچا سکتا ہوں۔ تم آرتی کو راضی کر لو مجھے بھی آسانی ہو گی اور تمہیں بھی۔''

آخری جملہ پڑھ کر آرتی کا چہرا زرد ہو گیا تھا۔ طارق کے سب سے قریب وہی تھی اسی نے طارق کو تلاش کیا تھا۔ اسے قابو میں کرنے کے لیے آرتی نے بہت بڑی قربانی دی تھی۔ سنیال کے اشارے پر اسے رشوت میں اپنے آپ کو دینا پڑا تھا۔ کئی راتیں ایک ساتھ گزارنے والی اب اس سے ڈر رہی تھی۔

انسان موت سے کتنا ڈرتا ہے اور محبوب مرتے ہی دشمن نظر آنے لگتا ہے۔ اس کا نمونہ میں نے اس رات دیکھا تھا۔



آرتی نے لرزیدہ لہجے میں کہا تھا۔ ''پلیز سنیل، مجھے مجبور مت کرو۔''

لیکن ہم سب کو اسی لاکھ کی للک تھی۔ ہر ایک نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

سنیل نے اسے دلاسا دیا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ طارق کی بھٹکتی ہوئی روح تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گی۔ وہ جب زندہ تھا، تمہیں دل و جان سے چاہتا تھا۔ یہ چاہے جانے والا عمل روح کے تابع ہوتا ہے۔ اس کی روح تم پر مرتی تھی۔ مرنے کے بعد بھی وہ تمہاری پرستش کرتی ہو گی۔ آج تک تم نے کبھی سنا ہے کہ مرنے والے کی روح نے جو بد روح بن گئی ہو اپنے کسی پیارے کو پریشان کیا ہو۔ بد روح ستاتی ہے تو صرف اپنے دشمنوں کو۔''

آرتی نے جواب دیا۔ ''لیکن اب تو اس پر عیاں ہو گیا ہو گا کہ میں اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ صرف اپنا کام نکالنے کے لیے ڈرامہ کرتی تھی۔''

سنیل نے کہا۔ ''پھر بھی وہ تم سے پیار کرتا تھا۔ اسی لیے اس نے تمہیں معمول بننے کو کہا ہے۔ پلیز انکار مت کرو اور تیار ہو جاؤ۔''

سب کے دباؤ نے اسے راضی ہونے پر مجبور کر دیا۔

''آنکھیں بند کر کے ذہن کو پُرسکون رکھو۔'' سنیل نے آرتی سے کہا۔

ہم سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے، ہر ایک کا دل دھڑک رہا تھا۔ سنیل اس کے سامنے بیٹھا زیرلب کچھ پڑھتا جا رہا تھا۔ ہماری نگاہیں کبھی سنیل کے چہرے کا طواف کرتیں اور کبھی آرتی کے چہرے کا۔

کچھ دیر بعد مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی محسوس ہوئی۔ ہر موئے تن میں خوف کی لہر دوڑنے لگی۔ آرتی کا چہرا سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون چہرے پر جمع ہو رہا ہو یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں جو کسی ہیٹر کے وائر کی طرح دہک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں خون کی سرخی جھلک رہی تھی۔ جیسے تازہ تازہ خون ہلکورے لے رہا ہو۔ وہ ایک ٹک سنیل کو گھور رہی تھی۔ اس نے سنیل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔''

ہم سب کانپ کر رہ گئے۔ وہ آواز آرتی کی نہیں تھی۔ وہ طارق کی آواز تھی۔ ویسی ہی بھاری بھرکم اور گرجدار آواز لیکن سنیل پر کوئی اثر نہ ہوا اس نے پوچھا۔ ''وین لے کر کہاں چلے گئے تھے طارق؟''

''یہ تمہیں اتنی آسانی سے نہیں بتاؤں گا۔'' آرتی کی زبان سے طارق کی آواز نکلی۔

سنیل نے اس کے الفاظ کی چبھن برداشت کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بتا سکتے کیوں چلے گئے تھے۔''

''ضرور''۔

''بتاؤ۔''

''وین پہنچاتے ہی میری ضرورت ختم ہو جاتی۔ باقی کام تم سب کرتے' مجھے ہو چکا تھا کہ تم سب اسّی لاکھ بچانے کے لیے میرا قتل کر دو گے۔ اس لیے میں نے اپ منصوبہ بنایا تھا۔''

''کیسا منصوبہ؟''

''میں نے سوچا لوہے والی سڑک پار کرنے کے بعد وین میرے قبضے میں ہو میں اسے لے کر گودام کی بجائے کسی ایسے خفیہ مقام پر پہنچ جاؤں گا جس کے بارے میں تم نہیں جانتے ہو اور میں نے کیا بھی وہی۔''

''مگر اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچتا۔ تم اکیلے تو نوٹ چھاپ نہیں سکتے تھے۔''

''میرا منصوبہ تھا کہ تمہیں بلیک میل کر کے اپنا حصہ پہلے ہی لے لوں۔''

''تمہارے وہم نے ہم سب کو پریشانی میں ڈال دیا ہے۔''

''جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں وین کا پتا بتا دوں گا۔''

''جلدی بتاؤ؟''

''میری دو شرطیں پوری کر دو۔''

''کون سی؟''

''پہلی شرط ہے کہ میرا حصہ میری بیوی تک پہنچا دو۔''

''یقین کرو نوٹ تیار ہوتے ہی تمہارا حصہ تمہاری بیوی کو دے آئیں گے۔''

''اگر میں نے ایک بار تمہیں وین کا پتا بتا دیا تو سارا کاغذ تمہارے ہاتھ لگ جا۔ اور پھر ضروری نہیں ہے کہ تم میرا حصہ میری بیوی تک پہنچا دو۔''

''ہم ایسا نہیں کریں گے''۔

''بھلے ہی نہ کرو مگر میں رسک نہیں لے سکتا۔ میرا حصہ تمہیں پہلے میری بیوی تک پہنچانا ہو گا۔''

''یہ ممکن ہے۔''



''پھر وین کو بھول جاؤ۔''

''اچھا، کسی طرح ہم اسّی لاکھ روپے کا انتظام کر کے تمہاری بیوی کو دے دیتے ہیں تو؟''

''تو دوسری شرط کو پورا کرنا ہو گا۔''

''دوسری شرط کیا ہے۔''

''قتل ایک سہاگن کا۔ میری اس شرط کو پورا کرتے ہی تمہیں وین مل جائے گی۔''

سنیل نے کہا۔ ''ہم تمہاری پہلی شرط کی وجہ تو سمجھ رہے ہیں لیکن سہاگن کے قتل سے تمہارا کیا بھلا ہو گا؟''

''یہ بات میں بعد میں بتا دوں گا۔''

ہم سب حیران تھے۔ ہمیں خاموش دیکھ کر آرتی کے حلق سے پھر وہی کھرکھراتی آواز ابھری۔ ''کیوں، سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا تم سب تو کسی کو بھی پلک جھپکتے اوپر پہنچا سکتے ہو پھر خوف زدہ کیوں ہو؟''

کالو میاں نے کہا۔ ''ہم خوف زدہ نہیں ہیں۔ بس الجھ گئے ہیں۔ آخر تمہاری کسی سہاگن سے دشمنی کیا ہے؟''

''سہاگن کا قتل وین کے گارڈ کو مار دینے جتنا آسان نہیں ہے دانتوں پسینا آ جائے گا۔''

سنیال نے کہا۔ ''قتل کے ساتھ لفظ سہاگن اس لیے تم نے جوڑا ہے کہ کہیں ہم تمہاری بیوی کو ہی اوپر نہ پہنچا دیں۔ اسے قتل کر دینے سے بھی تمہاری شرط پوری نہیں ہو گی کیوں کہ وہ سہاگن نہیں بیوہ ہے۔''

''یہ سوچنا تمھارا کام ہے میری شرط ہے صرف سہاگن کا قتل۔ کیسے کرنا ہے، یہ تم جانو۔ اب میں چلتا ہوں۔''

''اس دن سے ہم سب اسی الجھن میں ہیں کہ کس سہاگن کو قتل کریں۔ اسی خیال سے کنائی سنیال نے ایک عورت کو اغوا بھی کیا تھا لیکن وہ بارود کا ڈھیر ثابت ہوئی کسی بھی طرح قابو میں آنا ہی نہیں چاہتی تھی مجبوراً اسے قابو میں رکھنے کے لیے کنائی نے تشدد سے کام لیا اور اسے زخمی کر بیٹھا۔ زخمی جانور ہو یا انسان، اس کی بلی (بھینٹ والی قربانی) بھگوان قبول نہیں کرتا۔ یہ بات سنیال نے بتائی تھی۔ اسی لیے وہ اسے سب دشمنوں سے چھپانے کی چھ

کاؤں تو کبھی ڈھاکا کا چکر لگا رہا تھا۔ اسی درمیان اس حرافہ کو موقع مل گیا اور اس نے کنائی سنیال کو زخمی کر دیا۔ سونو میاں نے جب اسے روکنا چاہا تو اسے بھی گولی مار دی۔ اتفاقاً گولی اس کے سر میں لگی اور وہ موقع پر ہی مرگیا۔ بے چارے کی اپنی غلطی اسے لے ڈوبی تھی۔ اگر وہ اپنا پستول کھڑکی پر رکھ کر بھول نہ جاتا تو نہ وہ مرتا اور نہ کنائی سنیال زخمی ہوتا۔ بے چارہ اس بری طرح زخمی ہوا ہے کہ پتا نہیں کب صحت یاب ہوگا۔ ایسے برے وقت میں جو بھی ساتھ دے گا۔ وہ سب کی آنکھ کا تارا بنے گا۔ میری بات مانو اور کسی سہاگن کو پھانس لو۔ ایسی سہاگن کو جو آخر دم تک خوش وخرم رہے۔ روتی بسورتی عورت نا قابل قبول ہے۔'' شفیق نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنی داستان ختم کی اور مدعا بھی بیان کر دیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے نادانستگی میں ایک بہت بڑی سازش پر سے پردہ ہٹا دیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ سنیال ملک کی معیشت کو تباہ کرنے کے لیے جعلی نوٹ چھاپنا چاہتا ہے۔ اسمگلنگ کے پھاوڑے سے بنیاد کو تو کھوکھلا کر ہی رہا تھا اب ریڑھ کی ہڈی پر بھی وار کرنا چاہتا ہے۔ اس سے وہ چھین لینا ضروری تھا اور یہ میرے لیے ممکن تھا کیوں کہ میں نے طارق کی پہیلی کا حل تلاش کر لیا تھا۔ طارق کسی عورت کا دشمن نہیں تھا۔ اپنی جبلت سے مجبور ہو کر اس نے سیدھی سادی بات کو الٹا کر کہا تھا۔

''کیوں خان تم میری مدد کر سکتے ہو؟ کسی سہاگن کو قتل کرانے کے لیے لا سکتے ہو؟'' شفیق نے پوچھا تھا۔

میں نے جواب دینا چاہا تھا کہ ابوالبشر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے کہا۔

''بھیا، بات تو سنیں۔'' اس کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' میں نے گودام کے دروازے سے سر باہر نکال کر پوچھا۔

''فریدہ آئی ہے۔'' بشر نے جواب دیا۔

''ایک منٹ انتظار کرو۔ میں ابھی آیا۔'' شفیق کو بیٹھنے کا کہہ کر میں گودام سے باہر آ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شفیق فریدہ کو دیکھے۔ اسی لیے میں نے فریدہ سے کہا۔ ''تم کیوں چلی آئیں؟ تمہارا یوں گھر سے نکلنا خطرناک ہے۔''

''غصہ کیوں ہوتے ہو۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''یہ تار لے کر آئی ہوں۔''

[illegible] کھول کر دیکھا۔ چچا نے فوراً آنے کا لکھا تھا۔ آٹھ سال کے اندر یہ پہلا موقع تھا کہ چچا نے تار دیا تھا۔ وہ تو خط لکھنے میں بھی بخالت سے کام لیتے تھے۔ صرف



سرخاب خان یعنی دادا خان ہر ماہ خط لکھتے تھے وہ بھی نصیحتوں بھرا۔ ایسی کون سی بات ہو گئی جس کی وجہ سے انہوں نے تار بھیجا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں چبھنے لگی تھی۔ میرا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ میں نے ابوالبشر سے کہا۔ ''تم جا کر پی آئی اے کی سیٹ ریزرو کرا لو دو سیٹ بک کرانا۔ فریدہ بھی میرے ساتھ جائے گی۔ یہاں پر ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ وہاں رہے گی تو میں اطمینان سے دشمنوں سے لڑ سکوں گا۔''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' ابوالبشر نے کہا۔

''اگر تم چاہو تو اپنے لیے بھی سیٹ ریزرو کر لینا۔''

''نہیں، میں یہ کام نہیں کروں گا۔ آپ کو خطرے میں چھوڑ کر میں تو ایک پل بھی وہاں رہ نہیں پاؤں گا۔ پھر آپ اپنے لیے تو لڑ نہیں رہے۔ وطن کی حفاظت کی جنگ میں مجھے بھی اپنے ساتھ رکھیں۔ میں لڑائی بھڑائی بھلے ہی نہ کروں لیکن دکان تو سنبھال سکتا ہوں، تاکہ آپ کی معاشی حیثیت مضبوط رہے۔ جنگ دو ملکوں کے درمیان ہو یا دو فریقوں کے درمیان، معاشی حیثیت کا مضبوط رہنا ضروری ہے۔'' بشر کی بات مجھے بھا گئی۔ میں نے پانچ سو روپے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''تم جتنی جلدی ممکن ہو ایئر پورٹ چلے جاؤ۔''

وہ بے بی ٹیکسی (آٹو رکشا) پر سوار ہو کر چلا گیا۔ فریدہ بھی تیاری کرنے کے لیے گھر کی طرف چل پڑی تو میں نے کیش بکس کھول کر دیکھتے ہوئے شفیق کو آواز دی۔ ''شفیق میاں! باہر آ جاؤ۔''

وہ باہر نکل آیا۔

''شفیق میاں! تم جا کر اپنے ساتھیوں کو تیار کرو۔ میں ایک ہفتے میں کراچی سے لوٹ کر آ جاؤں گا اور طارق کی روح کو سہاگن کا قتل بطور نذرانہ پیش کر دوں گا لیکن یاد رکھو، وقت سے پہلے کسی کو میرا نام مت بتانا۔ کنائی سنیال کو بھی نہیں۔''

''جو حکم۔'' کہتے ہوئے وہ چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

دکانداری میں دل مطلق نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی پریشانی نے گھیر لیا تھا۔ دماغ میں تفکرات نے جالے بُن دیے تھے۔ میں تار کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ابوالبشر لوٹ

آیا۔ اس نے اسی دن کی فلائٹ میں دو سیٹیں ریزرو کرالی تھیں۔ رات نو بجے کی پرواز ت
تھا۔ تیاری کرنے کے لیے میں باہر نکل گیا۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ میر
پیچھے کنائی سنیال بشر کو ہراساں کر سکتا ہے۔ اس سیدھے سادے بندے کو خطرے سے دور ر
ضروری تھا۔ اس کے گرد حفاظتی حصار قائم کرنے کے لیے میں نے ہکا غنڈے سے رابطہ ک
ضروری سمجھا اور اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ دکان کی حفاظت کرے گا
اس کا ایک آدمی رات میں بھی بونوگرام میں پہرا دے گا۔ اس کی زبان پر مجھے بھروسا تھا۔
غنڈہ تھا لیکن وطن فروش نہیں تھا۔ وہ روٹی کے لیے غنڈہ گردی کر رہا تھا۔ اگر اسے بھی عزت
روٹی ملنے لگتی تو وہ شاید غنڈہ گردی سے تائب ہو جاتا۔ پھر بڑے موذی کو شکست دینے کے
چھوٹے موذی سے سمجھوتا کر لینا ہی دانش مندی ہے اسی لیے میں نے بھی ہکا پر بھروسا کرلیا
بونوگرام لوٹ آیا۔

فریدہ نے سامان پیک کرلیا تھا۔ آٹھ بجے رات میں اسے ساتھ لے کر ائیرپور
پہنچا۔ پرواز کا اعلان ہو رہا تھا۔ رش کی وجہ سے راستے میں ہی کافی دیر ہوگئی تھی۔ بھاگم بھاگ
جہاز پر سوار ہوئے ہمارے بیٹھتے ہی دروازہ بند ہوگیا گویا ہم دونوں آخری مسافر تھے۔ ہم
نے کر پی آئی اے کا دیو پیکر جہاز ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا کراچی کے ہوائی مستقر پر پہنچ گیا۔ ا
پورٹ سے باہر آتے آتے بارہ بج گئے۔ حالاں کہ سامان کچھ بھی نہیں تھا صرف ایک چھوٹا
ہینڈ بیگ تھا جس میں فریدہ کے کپڑے تھے۔ میں نے اپنے کپڑے لیے نہیں تھے۔ پارے م
کسی کا بھی جوڑا لے کر پہن سکتا تھا اور پھر فوراً ہی لوٹنا بھی تھا۔ ہینڈ بیگ کو میں نے اپنے ہاتھو
میں لے رکھا تھا اور فریدہ کی گود میں ننھا ابوالحیات تھا۔ اس کا بیٹا۔

لاؤنج سے باہر نکل کر میں نے ٹیکسی لی اور اسٹیشن پہنچ گیا لیکن وہاں پہنچ کر مایوسی۔
گھیر لیا۔ آخری ٹرین آدھا گھنٹہ پہلے نکل گئی تھی۔ اگلی گاڑی صبح سے پہلے نہیں جاتی تھی اس ل
میں نے ہوٹل میں ٹھہر جانا مناسب سمجھا اور اسٹیشن کے نزدیک ایک عالیشان ہوٹل میں پہنچ گیا
میں نے سوچا تھا کہ دو سنگل روم لے لوں گا لیکن صرف ایک ڈبل بیڈ روم خالی تھا۔ مجبوراً ا
بک کرالیا۔ کھانا بیرے نے کمرے میں ہی پہنچا دیا تھا۔ ہلکا پھلکا کھانا ڈھاکا سے کھا کر چلا
اس لیے میں نے ایک روٹی کھائی اور لیٹ گیا۔ فریدہ بھی تھک کر چور تھی وہ بھی کھانا کھا
سوگئی۔ میں بے خبر سویا ہوا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ فریدہ کا بیٹا ابوالحیات کنمنایا تھا۔ اس کی آواز
بھی میری نیند میں خلل ڈالا تھا۔ میں نے کروٹ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ کمرے م



نائٹ بلب کی روشنی پھیلی تھی۔ ہلکی روشنی میں فریدہ نہائی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے کئی جگہ سے
ہٹ گئے تھے۔ مجھے اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔ کئی ماہ سے فردوس مجھ
سے دور تھی۔ اس کی دوری نے میرے چور جذبوں کو بے چین کر دیا تھا ایسے وقت میں فریدہ کا یہ
روپ میرے جذبات میں ہلچل مچانے لگا۔ میری عقل پر پردہ پڑنے لگا۔ میں بھول گیا تھا کہ
میرا بڑھتا ہوا ہر قدم مجھے تباہی کی عمیق کھائی میں لے جا رہا ہے۔ میری لغزش زندگی بھر کے لیے
مجھے فردوس سے محروم کر سکتی ہے۔ میں اسلام کے احکام کو بھول چکا تھا کہ دو بہنوں کو جمع مت کرو
ورنہ نکاح ٹوٹ جائے گا۔ شیطان میرے دماغ پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ میں صوفے
سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ بیڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ میں بیڈ تک پہنچ گیا مگر کانپتے پیروں نے جسم کا بوجھ
اٹھانے سے انکار کر دیا اور میں اس کے بیڈ پر گر سا گیا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں لاوا گردش کر رہا ہو۔ ایک عجیب سی آگ
جسم و جاں کو جلائے دے رہی تھی۔ رگیں کھنچتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ چور جذبے حوصلہ پست
کیے دے رہے تھے کہ بچے نے رونا شروع کر دیا اور فریدہ کی طرف بڑھتے ہوئے میرے ہاتھ کا
زاویہ بدل گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ بچہ فرشتہ ہوتا ہے۔ اس رات مجھے اس بات کا یقین ہوگیا، اس
فرشتے نے کھائی کے کنارے مجھے تھام لیا تھا۔ ایک بہت بڑے گناہ سے بچا لیا تھا۔ ورنہ فریدہ
کی نظروں سے تو گرتا ہی، فردوس سے بھی محروم ہو جاتا۔ اپنی جنت کھو دیتا۔ اپنے بیٹے سے دور
ہو جاتا اور جہنم میری منزل بن جاتی۔

میں نے ابوالحیات کو گود میں اٹھا لیا اور اسے تھپکی دیتے ہوئے پکارا۔ ''فریدہ!''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

''لو اسے سنبھالو۔ شاید اسے بھوک لگی ہے۔ تھرمس سے دودھ نکال کر پلا دو۔''

اس نے بچے کو میری گود سے لے لیا اور میں باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی
کے چھینٹے چہرے پر مارتے ہوئے خدا کے حضور گڑگڑانے لگا۔ ''اے میرے مالک! مجھے
معاف فرما۔ شیطان کے چنگل میں پھنس کر میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ مجھے بخش دے
میرے معبود!''

ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں نے رگوں میں دوڑتی آگ کو سرد کر دیا تو میں باہر نکل آیا
اور بستر پر لیٹنے کے بعد بھی خدا سے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ آہستہ آہستہ ذہن پرسکون ہوگیا
اور نیند نے بانہوں میں بھر لیا۔

صبح اٹھتے ہی میں نے نماز ادا کی اور سفر کی تیاری کرنے لگا، اتنی دیر میں فرید
نماز سے فارغ ہوگئی تھی۔ ہم نے اسی وقت اسٹیشن جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ سیٹ حاصل ک
میں دشواری نہ ہو۔

دوسرے دن ہم لاہور پہنچے پھر وہاں سے دوسری گاڑی پکڑ کر پنڈی آئے۔
قسمت کہ پنڈی سے پاراچنار جانے والی بس نہ مل سکی لہٰذا ہنگو تک ویگن میں آئے۔
میل کے اس سفر نے جوڑ جوڑ میں درد بھر دیا تھا۔ وہاں سے بس کے ذریعہ کوہاٹ پہنچے ا
دوسری بس پکڑی۔ پاراچنار پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی تھی اور پاڑے کا سفر مخدوش تھا اس لئے
کی نند کے گھر پیواڑ میں ٹھہر گئے۔ یوں بھی ان کا گھر جنکشن جیسا تھا۔ زیڑان سے آنے
انھی کے گھر رک کر بس وغیرہ پکڑتے تھے۔ انھوں نے ہمیں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔

فریدہ نے اتنا لمبا سفر پہلی بار کیا تھا اس لئے تھک کر چور ہو رہی تھی۔ وہ تو جا
سوگئی۔ اس کے کہنے پر میں ایک دن اور ٹھہر گیا۔ تیسرے دن ہم پاڑے کے لئے نکلے
کے لئے پہاڑوں کا سفر کرنے کا بالکل نیا تجربہ تھا۔ چنانچہ اس کی حالت دیدنی تھی۔ شا
پہنچتے پہنچتے اس کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ وہ تھک کر بیٹھ گئی۔

"خدا کے لئے فریدہ ہمت سے کام لو۔ وہ اوپر جو بستی نظر آرہی ہے وہی
ہے۔"

"اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ اگر میں جانتی کہ پاڑے کا راستہ اتنا دشوار گزا
کبھی نہ آتی۔" فریدہ نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

خوش قسمتی سے اسی وقت مجھے دور سے ایک خچر سوار آتا دکھائی دیا۔ میں نے ا
نزدیک پہنچ کر کہا "بھیا، اپنا خچر کرائے پر دوگے؟

اس نے جواب دیا۔ "تم پردیسی لگتے ہو، کہاں جانا ہے۔"

"پاڑے۔"

"لے جاؤ میں پاڑے پہنچ کر لے لوں گا۔" اس نے کہا۔

"کرایہ؟" میں نے پوچھا

"او اللہ کا بندہ! ایسی بات نہ کر۔ پھر کہے گا تو قسم خدا کی بہت برا ہوگا۔ ہم
دل پیش کرتے ہیں۔ سودا نہیں کرتے۔ یہ خچر کیا ہے۔ تم پر جان قربان کرسکتا ہوں۔"
تیز لہجے میں کہا اور خچر کی رسی مجھے تھمادی۔



فریدہ کو خچر پر سوار کر کے میں نے پھر سفر شروع کردیا۔ خچر سوار وہیں بیٹھ کر ستانے
لگا۔ میرے ساتھ زنانی سواری تھی اسی لئے وہ رک گیا تھا۔

دوپہر کو ہم لوگ پاڑے پہنچے۔ میرے آنے کی خبر سنتے ہی پورا گھر جمع ہوگیا۔

"بھئی پہلے میری پریشانی دور کرو۔ چچا نے تار کیوں دیا تھا؟" میں نے فردوس سے
پوچھا۔

میرا سوال سنتے ہی گل وہاں سے کھسک گئی۔

"آپ ہی نے کہا تھا۔ افروز اور گل کی شادی کرادو۔ میں نے چچا کو راضی کرالیا۔
آئندہ جمعہ کو شادی ہوگی۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔" کہتے ہوئے گل کو چھیڑنے کے لئے اس کے کمرے میں
پہنچ گیا۔ وہ پہلے سے کافی بدل گئی تھی اور لجاتے شرماتے ہوئے بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ میں
نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا "بھئی یہ بتادو مجھے ہر ماہ کتنی بار یہاں آنا پڑے گا؟"

"جب جب آپ کا دل کہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تم دونوں شادی سے پہلے اتنا لڑا کرتے ہو تو
شادی کے بعد کیا ہوگا۔ یہ گھر تو میدان جنگ بنا رہے گا۔" اس نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے
چہرہ چھپالیا۔

"بھئی جلدی بتاؤ افروز سے بھی پوچھنا ہے۔"

"آپ ان سے ہی پوچھ لیں" کہتے ہوئے وہ بھاگ گئی۔

اس کے جاتے ہی کمرہ ویران ہوگیا۔ اکیلے کمرے میں کس سے باتیں کرتا اس
لئے میرے قدم چچی کے کمرے کی جانب اٹھنے لگے۔ ان کے کمرے میں پہنچ کر میں ٹھٹک گیا۔
وہاں چچا بیٹھے تھے مجھے رکتے دیکھ کر انھوں نے آواز دی۔ "آؤ بیٹا، آجاؤ بیٹھو اگر کل پہنچ جاتے
تو نیئر کبریٰ سے بھی ملاقات ہوجاتی۔"

"وہ کب آئی تھیں؟"

"ایک ہفتے سے وہ یہیں تھی۔ کل اس کا دیور اسے زیڑان لے گیا۔"

"اگر اجازت دیں تو میں آج ہی زیڑان سے ہوآؤں؟"

"اتنے دور کا سفر کرکے آئے ہو، ایک دو دن بعد چلے جانا۔"

"پتا نہیں باجی زیڑان میں رکیں گی یا نہیں۔"

"ہاں، وہ کہہ رہی تھی کہ جلدی واپس جانا ہے۔ ایک دو دن میں ابوتراب آ کر لے
جائے گا۔"

"تب مجھے اجازت دیجئے، ورنہ باجی غصہ ہو جائیں گی۔"

"اچھا جاؤ۔" انھوں نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن زیادہ دن رکنا نہیں۔"

"جی اچھا۔" کہہ کر میں فردوس کے پاس لوٹ آیا۔ اسے بتا کر میں اسی وقت زیڑان جانے کے لئے نکل پڑا۔ باجی کے گھر تک پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ اس علاقے میں رات کو سفر کرنا ہم جیسے لوگوں کے لئے ناممکن سا تھا پھر بھی میں بلا خوف بڑھتا رہا۔ گاؤں میں داخل ہوتے کے بعد مجھے لوگوں نے گھیر لیا۔ ہر شخص، ڈھاکا کے بارے میں جاننے کو بے چین تھا۔ وہاں تک خبر پہنچنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ اسی لئے وہ سب کئی سال پرانی خبروں کے بارے میں صداقت جاننا چاہتے تھے۔ اے کے فضل الحق نے مسلم لیگ سے الگ ہو کر اپنی پارٹی بنالی تھی اور اس پارٹی نے اردو کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ "ماتری بھاشا بنگلہ چای" تحریک نے سینکڑوں گھر اجاڑ دیئے تھے اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار مہاجروں کو اندرون بنگال سے دوبارہ ہجرت کر کے شہر آنا پڑا تھا۔ 21 فروری کو مشتعل طلبا کے جلوس پر پولیس کو فائرنگ کرنا پڑی تھی جس میں برکت اللہ کے ساتھ دو اور طلبا مارے گئے تھے۔ اسی فائرنگ اور لسانی فساد کے بارے میں سب پوچھ رہے تھے۔

میں نے جب انھیں بتایا کہ وہ تو کافی پرانی بات ہے اور اس وقت بنگالی اور غیر بنگالی دونوں شیر وشکر ہیں تو انھیں حیرت ہوئی کیوں کہ وہ اس واقعہ کو تازہ سمجھ رہے تھے۔ انھیں حقیقت بتا کر باجی کے دروازے پر پہنچا تو دیکھا کہ ان کا دیور لمبے لمبے ڈگ بھرتا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ میرے قریب آ کر اس نے کہا۔ "ابھی ابھی متقی شیرازی نے بتایا کہ آپ آ رہے ہیں بھابی نے آپ کو لینے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔"

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور اپنا بیگ اس کی جانب بڑھا دیا۔

ہم دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ اس کے والد نے مجھے دیکھتے ہی سینے سے لگا لیا۔ ان سے دو چار باتیں کرنے کے بعد میں باجی کے کمرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا بھی میں نے انھی کے ساتھ کھایا اور مہمان خانے میں جا کر لیٹ گیا تھکن تو پہلے سے تھی۔ فوراً نیند آ گئی۔



نماز کے وقت علی نقی صاحب نے بیدار کیا تھا۔ اٹھ کر وضو کیا اور مسجد کی طرف چل پڑا۔ نماز پڑھ کر لوٹتے ہی میں نے باجی سے کہا۔ "میرے آنے کا مقصد آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی۔ چچا کا خط مل گیا ہوگا۔"

"خط تو نہیں ملا لیکن چچا نے بتا دیا ہے۔ اگر شرجیل کے ابو آ گئے تو میں چلی جاؤں گی۔"

"تو میں چلا، آپ پرسوں آ جائیے گا۔" کہتے ہوئے میں نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ سب نے روکنے کی کوشش کی لیکن میں رکا نہیں اور پاڑے لوٹ آیا۔

زیڑان سے لوٹتے ہی شادی کے ہنگاموں نے گھیر لیا۔ ہر جانب اپنی اپنی کہنے والے تھے۔ کافی دنوں بعد سب ایک جگہ جمع ہوئے تھے اس لئے کوئی بھی لگام میں نہیں تھا۔ نوشہ بھائی اور باجی بھی آ گئی تھیں۔ منت اور اس کا شوہر بھی آیا ہوا تھا۔ شہباز آفریدی سے فردوس کی خوب چھن رہی تھی۔ وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ فردوس بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔ چھ ماہ میں اس نے روانی سے پشتو بولنا سیکھ لیا تھا۔ منت بھی وقتاً فوقتاً فردوس کا ساتھ دینے کیلئے شوہر پر چوٹ کر دیتی تھی۔ پورا گھر گلزار بنا ہوا تھا۔ شادی والے دن تو بس دیکھنے کا سماں تھا۔ گل کو سرخ جوڑا پہنا کر آنسوؤں کی چھاؤں میں ساجن کے گھر بھیج دیا گیا، جو چند ہی فٹ دور تھا اور یہ دوری بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گئی تھی۔

دعوت ولیمہ کے بعد میں نے ڈھاکا لوٹنے کی تیاری شروع کر دی۔ جانتا تھا کہ فریدہ پہلی بار آئی ہے، اس لئے یہاں والے ایک دو ماہ سے پہلے چھوڑیں گے نہیں اور فردوس کے بغیر وہ ٹھہرے گی نہیں، اس لئے دونوں کو چچی نے روک لیا تھا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ اُس وقت ڈھاکا میرے لئے میدانِ کارزار تھا اور سپاہی خندقوں میں بیوی بچوں کو نہیں رکھتے۔ میں نے بھی انھیں وہیں چھوڑ دیا اور سب سے اجازت لے کر چل پڑا۔ کراچی پہنچ کر میں نے پی آئی اے کی سیٹ ریزرو کرائی ٹکٹ اگلے دن کا ملا تھا۔ تھکان مٹانے کے لئے میں نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا تھا۔ شام کے وقت ریگل سینما کے باہر کھڑا پوسٹر دیکھ رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر گردن گھمائی تو زبیدہ کا مسکراتا چہرا نظر آیا۔

لیکن مسکراہٹ کا پردہ بھی وقت کی چھاپ کو چھپا لینے سے قاصر تھا۔ ڈھائی سال پہلے جو چہرا دیکھا تھا، یہ وہ چہرا نہیں تھا۔ چہرے کی شگفتگی قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ابھر آئے تھے۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

''کیسے ہو ضیغم؟'' اس کے لہجے میں زمانے بھر کا درد سمویا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہوں، لیکن تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

''ناسور۔ دل میں ناسور بن گیا ہے۔'' اس نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے میں نے نگاہیں جھکا کر کہا۔ ''تم بھ
کیوں نہیں جاتی؟''

اس نے آہ بھر کے کہا ''کیسے بھول جاؤں۔ سرمایہ حیات کو بھلایا نہیں جاتا۔
بڑھاپے کی چھڑی ہے۔''

کہیں وہ بھری پُری سڑک پر رو نہ دے، اسی ڈر سے میں نے کہا۔ ''آؤ
ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں۔ اس بہانے کچھ کھا پی لیا جائے گا۔''

''چلو'' وہ میرے ساتھ چل دی۔

ایک صاف ستھرے ریستوران کے کیبن میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔ ''تم شا
کیوں نہیں کر لیتی ہو۔''

اس نے جواب دیا ''کر لی ہے۔''

''مبارک ہو، کب کی؟''

''دو سال ہو گئے۔''

''اور مجھے خبر تک نہیں دی۔ میرا پتا تو جانتی تھیں۔ میں نے انیر پورٹ پر لکھایا تھ
اس پتے پر خط لکھ دیتیں۔''

''اپنی موت کی خبر مُردے نشر نہیں کرتے۔ وہ شادی بھی میری موت تھی۔ زبیدہ ا
دن مر گئی تھی جس دن اس نے چار حرفی لفظ قبول کہا تھا۔''

''تم اتنی ٹوٹی ہوئی کیوں ہو؟ زندگی کو ماضی کی قبر میں دفن مت کرو۔ ہنسی خوشی جینے
کی کوشش کرو۔''

''یہ مشورہ تم دے رہے ہو؟ تم جس کے لئے میں نے خوشیاں تج دی ہیں۔ نہیں
ضیغم! اتنے سنگ دل نہ بنو۔ خوشیاں حاصل کرنے کی ترغیب نہ دو ورنہ میں مر جاؤں گی۔ غموں
کی سانسوں کے سہارے ہی جینے دو مجھے۔''

''تم بھی عجیب لڑکی ہو۔ خود ہی روگ لگا بیٹھی ہو۔ بخدا مجھے پتا ہوتا کہ علی گوٹھ کی ننھی
منی گڑیا مجھے دل میں چھپائے بیٹھی ہے تو میں کبھی شادی نہ کرتا۔''



''میں نے غلطی کی ہے اسی لئے تو اپنے آپ کو خود ہی سزا دے رہی ہوں۔''

''جو مل گیا، اسے مقدر سمجھ کر سمجھوتا کر لو۔ اپنے شوہر کو مایوس مت کرو۔''

''شوہر! ہنہ، تم نہیں جانتے ہو ہم سندھی سیّدوں میں پابندیوں کی کتنی بیڑیاں ہوتی ہیں۔ لڑکیاں بھیڑ بکریوں سے زیادہ مجبور ہیں۔ پتا نہیں کیسے بابا سائیں تمھارے نام پر راضی ہو گئے تھے۔ شاید وقتی جذبہ تھا وہ، ملک نیا نیا بنا تھا۔ سینکڑوں سال سے تارِ عنکبوت کی طرح پھیلی ہوئی بے ہودہ رسموں کی زنجیروں کو جذبہ حب الوطنی نے بکھیر دیا تھا اور وہ راضی ہو گئے تھے لیکن تم نہ ملے اور میں فرسودہ رسموں کی بھینٹ چڑھا دی گئی۔ جانتے ہو میرا شوہر کون ہے؟''

''کون ہے؟''

''میرے تایا حسن کا بیٹا۔ جب تم پہلی بار گوٹھ گئے تھے، اس وقت وہ ایک سال کا تھا۔ مجھ سے پورے بارہ سال چھوٹا۔ رخصتی کے لئے مجھے مزید دو سال انتظار کرنا ہو گا۔ کیا یہ غم کم ہے؟''

مجھے اس معصوم سی لڑکی پر ترس آنے لگا۔ اس کے غم کو کم کرنے کے لئے بولا۔

''زبیدہ! انسان کی زندگی دکھ سکھ کا مجموعہ ہے۔ دکھ نہ ہوں تو دنیا جنت نہ بن جائے! امتحان میں وہی کامیاب ہوتے ہیں جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ تم بھی زندگی کو امتحان سمجھ کر گزار لو۔''

''ہاں یہی تو کر رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہاتھ دھونے کے لئے بیسن کی جانب چلی گئی۔

واپس آنے کے بعد اس نے کہا ''ایک کام کرو گے؟''

''کیا؟''

''تم مجھ سے شادی کر لو۔ یہ شادی خفیہ ہو گی۔ نہ میں کسی سے کہوں گی اور نہ تم کبھی منہ کھولنا۔''

''بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔''

''جب بھوک جاگتی ہے تو لوگ چوریاں کرتے ہیں۔ ہم بھی چور رشتے استوار کریں گے۔''

''یہ گناہ ہے۔''

''میں فقیر بن کر آئی ہوں۔ اگر میرے کشکول میں تم نے بھیک نہ ڈالی تو کوئی اور ڈال دے گا۔ میری ضرورت پوری کر دو۔''

میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ''مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دو۔ کل کی فلائٹ سے میں ڈھاکا جا رہا ہوں واپسی کی جلد کوشش کروں گا۔''

''ٹھیک ہے لیکن یاد رکھنا۔ اگر میں اس درمیان بھٹک گئی تو اس کی ذمے داری تم پر ہوگی۔''

''مجھے اپنی زبیدہ پر بھروسا ہے۔'' کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔

ہم باہر آئے اور پھر اس سے اجازت لے کر میں اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

وہ رات مجھ پر بہت بھاری تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے تین چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ کبھی فردوس آ کر کھڑی ہو جاتی اور کبھی اسے دھکیل کر زبیدہ آ جاتی اور کبھی ذوالفقار آ کر کھڑا ہو جاتا۔ صبح کی اذان تک میں خود سے لڑتا رہا۔ جب مسجد سے آواز بلند ہوئی تو گھبرا کر میں خدا کے حضور پناہ کے لئے جھک گیا۔

نماز سے فارغ ہو کر ناشتا کیا اور ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہو گیا۔

ڈھاکہ پہنچ کر بھی دل و دماغ پر زبیدہ چھائی رہی۔ اسے جرعہ جرعہ موت پیتے دیکھ کر میں سہم اٹھا تھا۔ اسے بچا لینا چاہتا تھا اور بکھرنے سے بچانے کے لئے اسے پانا ضروری تھا۔ اسے اپنا لینا بھی مشکل نہیں تھا۔ اسلام چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے۔ میں بیک وقت دو بیویاں رکھ سکتا تھا لیکن زبیدہ بیک وقت دو شوہر نہیں رکھ سکتی تھی۔ بغیر طلاق لیے وہ مجھ سے نکاح نہیں کر سکتی تھی اور اسے طلاق ملنا مشکل تھا۔ میں کیا کروں کیسے اسے بکھرنے سے بچاؤں؟ میرا ذہن اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ مجھے الجھا الجھا سا دیکھ کر ابوالبشر سمجھا کہ شاید سنیال سے خوف زدہ ہوں۔ اسی لئے وہ مجھے دکان پر بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ اس دن بھی میں زبردستی دکان پر جا بیٹھا تھا۔ مجھے بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شفیق پہنچ گیا۔ اس نے دکان میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ''خان! میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ صرف میں ہی نہیں میرے سارے ساتھی بھی تمہارے منتظر ہیں۔ وہ اس پہیلی کا راز جاننا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کہیں تم نے میرا نام تو نہیں بتا دیا؟''

''نہیں، مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو میں اسی لاکھ روپے کھونا نہیں چاہتا۔ اتنی تگ و دو کے بعد کاغذ ہاتھ آیا اسے کھو دینا عقل مندی تو نہیں ہے۔''

''تم کل رات اسی گودام میں سب کو جمع کرو۔ صرف کالومیاں کو خبر نہ دینا۔''



''کالومیاں تو ہمارے گروپ کی جان ہے۔ گروپ کی بقا کے لئے نہ جانے اس نے کتنی جانیں لی ہیں۔ وہ کرائے کا قاتل نہیں ہے۔ ہمارے تحفظ کے لئے قتل کرتا ہے۔''

''اسے بعد میں بلا لینا یا پھر اسے اس کا حصہ پہنچا دینا لیکن یہ کام اس طرح خفیہ طریقے سے کرنا جیسی راز داری حکومت برت رہی ہے۔ اتنی بڑی رہزنی کی ہوا اخباروں کو لگنے نہیں دی ہے۔ تم بھی راز داری سے کام لینا۔''

''یہ بھی بتانا پڑے گا کہ تم پہلے شخص ہو جسے اس راز میں شریک کیا گیا ہے۔''

''تب ٹھیک ہے۔ کل شام میں وہاں پہنچ جاؤں گا لیکن میرے چہرے پر نقاب ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرا چہرا دیکھے اور بعد میں بلیک میل کرے۔''

''تمھاری مرضی۔'' کہتے ہوئے وہ چلا گیا۔

نقاب کی جدت میں نے اس لئے پیدا کی تھی کہ سنیال مجھے پہچان نہ سکے۔ میں سنیال کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا اور اسے پکڑنے کے لئے اپنے ہاتھ خون سے رنگنا ضروری تھا۔ کسی کو قتل کرنا گناہ عظیم ہے لیکن زندگی بچانے کے لئے ناکارہ عضو کو کاٹنا بھی ضروری ہے۔ ملک کی بقا کے لئے کیا گیا قتل، قتل نہیں ہوتا۔ جہاد ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں دشمن کو قتل کرنا ضروری ہے۔ اسی لئے میں بھی قتل کرنے نکل پڑا۔

بے بی ٹیکسی پر سوار ہو کر کملا پور پہنچا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے حکم سے وہاں نیا ریلوے اسٹیشن زیرِ تعمیر تھا۔ اس اسٹیشن کا ماڈل دیکھنے والے اش اش کر اٹھتے تھے۔ ایشیا کا سب سے خوبصورت اسٹیشن بن رہا تھا۔ ماڈل بنانے والے نے اپنا فن سمو دیا تھا۔ اس میں ڈھائی کلومیٹر کے رقبے میں کھلتے ہوئے کنول کے پھول جیسی عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ اس عمارت کے عقب میں جھگیوں میں ایک جھگی کالومیاں کی تھی۔ اس جھگی کے نزدیک پہنچ کر میں نے آس پاس کا جائزہ لیا صحیح مقام کی نشاندہی کولتار سے رنگے ہوئے بیڑے اور ٹین کے شیڈ نے کر دی تھی۔ جس جھگی کی نشاندہی ہکا کے آدمی نے کی تھی، میں ٹھیک اسی کے سامنے کھڑا تھا۔ جھگی کا دروازہ بند تھا۔ میں نے بند دروازے پر دستک دی۔ اندر ہلچل سی محسوس ہوئی اور پھر کسی عورت کی آواز سنائی دی ''کے؟'' (کون)

میں نے جواب میں کہا۔ ''کالومیاں باری اچھین؟'' (کالومیاں گھر میں ہیں)

اندر سے آواز آئی ''نہ۔ شے باہیرے گے چھے (نہیں وہ باہر گئے ہیں)

میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''درجا کھولین۔ آپنار شا تھے دوٹو کو تھا

آ پچھے۔'' (دروازہ کھولیں آپ سے دو باتیں کرنی ہیں)

''داڑان کوھل چھی۔'' (ٹھہریے، کھولتی ہوں)

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ ایک سانولی سلونی سی لڑکی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا آشون، بھیتورے آشون (آیئے اندر آجایئے)

میں نے جھگی میں قدم رکھتے ہی تاڑ لیا کہ اندر کوئی مرد بھی ہے۔ میں نے کبھی سگریٹ نہیں پی ہے۔ اس لئے سگریٹ کی بو فوراً محسوس ہوگئی تھی۔ لڑکی نے جھوٹ کیوں بولا، یہ جاننے کے لئے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ مٹی کے تیل کے دیے کی زرد روشنی میں اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ غور سے دیکھنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ لڑکی نہیں، عورت ہے۔ دبلے پن کی وجہ سے میں دھوکا کھا گیا تھا۔ اس دبلی پتلی عورت کا بھرپور نگاہوں سے جائزہ لیتے ہی میں جان گیا کہ اس نے جلد بازی میں جسم پر ساڑھی لپیٹی ہے۔

عام طور سے بنگالی عورتیں بلاؤز نہیں پہنتیں۔ صرف ساڑھی سے ستر پوشی کا کام لیتی ہیں پھر بھی اتنے خوب صورت ڈھنگ سے ساڑھی باندھتی ہیں کہ مکمل ستر پوشی ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساڑھی باندھنے کا انداز جلد بازی کا غماز تھا۔

''کالو میاں کہاں گیا ہے؟'' میں نے بنگلا میں سوال کیا۔

''مجھے نہیں پتا، لیکن جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ وہ رات کو نہیں آئے گا۔'' اس نے بھی بنگلا میں جواب دیا۔

''ابھی اس کمرے میں کون تھا؟''

میرے سوال پر اس کا چہرا بجھ گیا۔

''کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمھارا دشمن نہیں ہوں۔ تمھارے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اسے سامنے آنے کے لئے کہو۔''

''یقین کیجئے کوئی نہیں تھا۔''

''دیکھو بی بی، اس جھگی میں صرف ایک دروازہ ہے اور اس دروازے پر میں کھڑا ہوں۔ جب کہ اندر سگریٹ کی بو پھیلی ہے۔ تم سگریٹ پیتی ہو؟ نہیں۔ کیوں کہ اگر پیتی ہو تو جلا سگریٹ ہاتھ میں رہتا یا پھر یہیں کہیں پڑا ہوتا، لیکن ٹکڑا غائب ہے یعنی وہ اس کے ہاتھ میں ہے جو پی رہا تھا۔ بلکہ اب بھی بجھا نہیں ہے، ہلکی ہلکی بو اب بھی پھیل رہی ہے۔ کالو میاں کے علاوہ



کوئی اور ہے تو بھی فکر نہ کرو میں کالو کو بتاؤں گا نہیں۔''

''حشمت باہر آجاؤ۔'' اس نے چارپائی کے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔

چارپائی کے نیچے سے ایک منحنی سا آدمی نکل آیا۔ خوف سے اس کا چہرا زرد تھا۔ میں نے انھیں تسلی دینے کے لئے کہا۔ ''ڈرو نہیں، میں تم لوگوں کی مدد کروں گا۔ دراصل کالو میاں میرا دشمن ہے۔ میں اس سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔''

میں نے رک کر ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ مرجھایا ہوا چہرا کھل اٹھا تھا۔ میرا منصوبہ تکمیل کے مراحل میں داخل ہو رہا تھا۔ اس دن مجھے بزرگوں کی اس کہاوت پر یقین آ گیا تھا کہ جب ہوا چلتی ہے تو چھوٹے چھوٹے سوراخوں کے اندر بھی پہنچ جاتی ہے اسی طرح جس گھر پہ گناہ کا سایہ پڑ جائے وہاں پر سو گناہوں کے پودے لہلہا اٹھتے ہیں۔ میں نے ذہن کو دوسری جانب موڑتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ کون ہے؟''

''میرے گاؤں کا ہے۔ اسی سے میری شادی ہونے والی تھی لیکن کالو میاں نے میرے باپ کو ڈرا دھمکا کر مجھے حاصل کرلیا۔''

''تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''جی۔''

''اور تم؟ حشمت نام ہے نا تمھارا؟'' میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

''جی۔''

''تم بھی راضی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''تم اگر میرا ایک کام کردو تو میں تمہیں پانچ ہزار روپے دوں گا۔''

''پانچ ہزار؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیا کرنا ہوگا؟''

''اس میں تمھارا بھی فائدہ ہے۔'' میں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولا۔ ''کالو میاں جب تک زندہ ہے، تم اسی طرح چوری چھپے آتے رہو گے۔ اگر اسے ختم کردو تو یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمھاری ہو جائے گی اور پانچ ہزار روپے بھی ملیں گے۔''

اس نے عورت کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ہم اسے ماردیں گے۔ وہ مجھے بہت مارتا ہے۔'' عورت بولی۔

''لو، یہ ایک ہزار رکھو۔ کل شام پھر آؤں گا لیکن شام تک اسے ختم ہو جانا چاہیے۔''

''کام ہو جائے گا۔''

''اور ہاں تمھارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام زرینہ ہے۔'' عورت نے روپے لیتے ہوئے کہا۔

''تو میں چلتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

مجھے پورا یقین تھا کہ کالو میاں کا کام تمام ہو جائے گا اور ہوا بھی وہی۔ گیارہ بجے د
میں مجھے خبر مل گئی کہ کسی نے کالو میاں کو مار کر ریلوے لائن پر پھینک دیا ہے۔

شام میں جب میں زرینہ سے ملنے پہنچا تو وہ بہت خوش تھی۔ کسی بھی رخ سے
غمزدہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ چار گھنٹے قبل اسے بیوہ بنا دیا گیا ہے
حشمت بھی وہیں تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''خان صاحب! میں نے اسے ختم کر د
لا دے باقی کے پیسے''

''تم نے اکیلے قتل کیا ہے؟''

''ہاں، بہت بڑا اغنڈا بنتا تھا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر ایک داؤ (درا
جیسا ایک وزنی ہتھیار جس سے بانس کاٹتے ہیں) مارا اور اس کی گردن جھول گئی۔'' وہ یوں کہ
رہا تھا جیسے کوئی کارنامہ انجام دیا ہو۔

''کسی نے دیکھا تو نہیں؟''

''نہیں، دوپہر میں ادھر جاتا کون ہے۔ اسے تو موت کھینچ کر لے گئی تھی۔ جا رہا تھ
لوہا چوری کرنے مگر میں نے اسے جہنم کا رستہ دکھا دیا۔''

''یہ لو مزید پانچ ہزار روپے۔ ایک ہزار انعام کا ہے۔''

اسے روپے دے کر میں بونو گرام لوٹ آیا۔ گھر پہنچ کر سر پر چڑھانے کے لئے
چھوٹے تکیے کا غلاف لیا اور اس میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ کر لئے۔ قینچی سے ناک اور منہ کی
بھی جگہ بنالی اور گھر سے نکل پڑا۔ سیدھا اپنے تھانے دار دوست کے پاس پہنچا اور اسے اسکیم بتا
دی پھر وہاں سے گلستان پہنچا بے بی ٹیکسی لی اور میر پور کے لئے چل پڑا۔

اس وقت تک میر پور آباد نہیں ہوا تھا۔ دور دور تک کھیت کھلیان پھیلے ہوئے تھے۔
پھر مہاجروں کے لئے سو سو گز کے پلاٹوں پر چھوٹے چھوٹے ایک ایک کمرے کے مکان تعمیر
کیے جا رہے تھے۔ کالونی کو پار کرتا ہوا میں پلابی کے کولڈ اسٹوریج تک جا پہنچا۔ اسی کولڈ
اسٹوریج کو کنائی سنیال اڈے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ نزدیک پہنچتے ہی میں نے تکیے کے



غلاف کو نکالا اور اپنے سر پر منڈھ لیا پھر دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو گیا اس بڑے سے ہال
میں بچھی چٹائی پر کنائی سنیال، شفیق، آرتی اور سنیل بیٹھے تھے۔ ان میں سے کنائی اور سنیل کی
پٹائی کر ہی چکا تھا۔ آرتی سے خار تھی ہی اور شفیق کی بھی خبر لینا چاہتا تھا، مجھے یقین تھا کہ میں اکیلا
ان سب پر بھاری پڑوں گا۔

''آپ سب تیار ہیں۔''

''ہاں۔'' سنیل نے جواب دیا۔

میری تیز نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ کنائی میری آواز سنتے ہی چونک گیا ہے۔ اس
لئے میں نے کم سے کم بولنے کا سوچ لیا۔

''سنیل صاحب! اب آپ طارق کی روح کو بلائیں تاکہ اس کے سوالات حل کیے
جائیں؟''

''کیا نام ہے تمھارا؟'' کنائی سنیال نے پوچھا

''سنیال! میں ایک عزت دار تاجر ہوں۔ یہ میرا پہلا اور آخری جرم ہے اس لئے
مجھے پردے میں رہنے دو۔ اگر میری شرط منظور نہیں ہے تو بتا دو، میں واپس چلا جاتا ہوں۔'' میں
نے غرا کر کہا۔

''مسٹر! یہاں آنے کے کئی راستے ہیں لیکن جانے کا ایک بھی نہیں جب کہ تم ہمارا
راز بھی جان چکے ہو اور ہمارا اڈہ بھی دیکھ چکے ہو۔ میں کیسے تمہیں چھوڑ دوں۔ کل کو تم ہمارے
لئے خطرہ بھی بن سکتے ہو۔''

میں نے جواب دیا۔ ''خطرہ تو تمہیں مول لینا ہی ہوگا لیکن یقین رکھو، میں نے اس
کام میں تجسس کی وجہ سے ہاتھ ڈالا ہے۔ مجھے روحوں سے بات کرنے کا شوق ہے پھر اتنی بڑی
رقم بھی مل رہی ہے جسے لے کر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس ملک سے چلا جاؤں گا۔''

''بھئی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑنا عقلمندی نہیں جو کرنا ہے جلد کر ڈالو۔'' آرتی بول
اٹھی پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ تم اس کا صحیح جواب دے دو گے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پہیلی کی گہرائی کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد ہی تو میں
نے تم لوگوں کی مدد کرنے کی ٹھانی ہے۔''

میرے جواب پر آرتی نے مطمئن ہو کر سنیل سے کہا۔ ''پلان شیڈ بورڈ نکالو۔''

''ٹھہرو!'' میں نے کہا۔ ''شفیق کے ذریعے میں نے ایک پیغام بھیجا تھا کیا [illegible] تم

لوگوں نے پورا کر دیا؟''

آرتی نے جواب دیا۔''ہاں، آج صبح ہی ہم سب نے بیس بیس ہزار روپے طارق کی بیوی کو دے دیے ہیں۔''

میں نے سب پر نظر ڈالی اور پھر بولا۔''ایک بات اور رہ گئی ہے۔''

سنیل نے پوچھا۔''کون سی بات؟''

میں نے جواب میں کہا۔''نوٹ چھاپنے کے بعد ان کا بٹوارا۔''

''بٹوارا؟'' سنیال نے چونک کر پوچھا۔''بٹوارے کے بارے میں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔''

''پوری رقم میں سے ایک کروڑ لوں گا۔'' میں نے کہا

''ایک کروڑ؟'' سنیال نے کہا۔''یعنی ہم سب کے حصے میں ساٹھ ساٹھ لاکھ اور تم اکیلے ایک کروڑ؟''

''نوٹ اس وقت میرے گھر میں ہے۔ معاہدہ میری شرائط پر ہوگا۔''

''چلو ہمیں منظور ہے۔'' آرتی بولی۔

سنیل نے پلان شیڈ بورڈ بچھا کر کہا۔''اب آپ سب خاموش ہو کر بیٹھیں۔''

اور پھر اس نے آرتی کا ہاتھ پکڑ کر پلان شیڈ بورڈ پر رکھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا چہرا سرخ ہو گیا۔ گلے کی نسیں تن گئیں اور پھر اس کی زبان سے طارق کے الفاظ پھسلنے لگے۔''کیا تم لوگوں نے میری شرط پوری کر دی ہے''

''ہاں، تمھاری بیوی کو اسی ہزار روپے دے دیئے ہیں۔''سنیل نے کہا۔

''میں دوسری شرط کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''اس کے بارے میں ہمارا ساتھی بتائے گا۔''

سنیل کے خاموش ہوتے ہی میں نے کہا۔''میں نے تمھاری دوسری شرط بھی پوری کر دی ہے۔ آج صبح تک کالو میاں کی بیوی سہاگن تھی مگر اب بیوہ ہو گئی ہے مرڈر کالو میاں کا ہوا ہے مگر مری ہے سہاگن۔''

''بہت خوب۔ تو سنو۔ یہاں سے دو میل مشرق کی جانب چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں ایک سوکھا تالاب ملے گا۔ آدھا ہاتھ آگے جاؤ پانچ ہاتھ پیچھے آؤ تمہیں وین مل جائے گی۔''

''جو کہنا ہے سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں۔'' سنیال نے جھلا کر کہا۔



''رعب مت ڈالو۔ اب تم گینگ لیڈر نہیں ہو اور نہ میں تمھارا ماتحت۔ اسی لئے خاموش رہو۔''

میں نے جلدی سے کہا۔''اب اسے لوٹا دو سنیل۔ میں اس پہیلی کو بھی سمجھ گیا ہوں۔''

سنیل نے اسے چلے جانے کے لئے کہا۔ کچھ دیر میں آرتی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ طارق کی جانب سے اطمینان ہوتے ہی میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پولیس والی سیٹی نکال کر زور سے بجائی۔

''کوئی فائدہ نہیں خان! میں نے تمہیں دیکھنے سے پہلے ہی پہچان لیا تھا۔ اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کوئی عجیب سی شرط پیش کرے اور میں اس پر یقین کر لوں، کسی کو ساتھ لینے سے پہلے ہی میں اس کا بیک گراؤنڈ جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ تمھاری شرط سن کر میں نے تمھارے کوائف جمع کرنے کے لئے اپنے خاص آدمیوں کو لگا دیا تھا اور جب انھوں نے تمھارا نام لیا تو میں خوش ہو گیا۔ پرانا حساب چکانا ضروری تھا۔''

''تمھاری یہ حسرت دل میں ہی رہ جائے گی۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''اس دو پیسے کی سیٹی پر بھروسا کر رہے ہو؟ جنہیں تم بلانا چاہتے ہو، وہ تو کب کے جھک کر پاپ پاڑا پہنچ گئے ہوں گے۔ میرے آدمی اسی کام کے لئے باہر پھیلے ہوئے تھے۔ اب تم بھی تیار ہو جاؤ۔ میں تمھارا قیمہ بنانا چاہتا ہوں۔''

''سو بار لے چکا ہے تو امتحان ہمارا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''میں اکیلا بھی ان پر بھاری ہوں۔''

''تم سب پیچھے ہٹ جاؤ۔ بلکہ دیواروں کے ساتھ رکھی الماریوں پر چڑھ جاؤ۔ ابھی میں تم سب کو ایک کھیل دکھاؤں گا۔''

وہ سب الماریوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔

''آرتی! تم میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے ایک اونچی جگہ پر چڑھتے ہوئے کہا۔

آرتی اس کے ساتھ آلوؤں کے بوروں پر چڑھتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

''شیام! اندر آ جاؤ۔'' اس نے زور سے آواز لگائی۔

دروازہ کھلا اور ایک آدمی دو بلڈ ہاؤنڈ کتوں کی زنجیریں تھامے اندر داخل ہوا۔

''پٹے کھول کر اشارا کرو۔'' اس نے اسے حکم دیا۔

شیام نے کتوں کے گلے سے پٹے اتار کر میری طرف اشارا کیا۔ خونخوار کتے غراتے

ہوئے مجھ پر جھپٹے۔ میں پہلے سے ہی تیار تھا، ہوا میں قلابازی لگائی اور کتوں کے عقب
گیا۔ کتے اپنی رو میں آگے کی سمت دوڑتے چلے گئے لیکن فوراً ہی پلٹے۔ ان میں سے ایک
جست لگائی، اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو یقیناً اس کے جبڑے میں اپنا پیر پھنسا لیتا۔ میں نے
سے قلابازی کھائی اور ہوا میں اڑتا ہؤا دوبارہ اپنی جگہ پر پہنچ گیا ساتھ ہی اس کی پشت
لات بھی جما دی میری لات فولادی گرز جیسی تھی۔ اراکان کے جنگل میں چکما قبائل
زیادہ خطرناک قبیلے ''لوکوما'' کے حکیم نے مجھے جڑی بوٹیوں سے تیار کر کے عجیب وغریب
''سوم رس'' پلا کر ہرکولیس ایسا طاقتور بنا دیا تھا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ طاقتور بن چ
دیوار پر گھونسا مار کر عمارت کو گرا سکتا تھا۔ وہ تو معمولی ساہڈی گوشت کا مرکب کتا تھا۔ میری
کیسے سہہ لیتا۔ وہ چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا گر گیا۔ اس کا تڑپنا بتا رہا تھا کہ اس کی ریڑھ کی
ٹوٹ گئی ہے۔ اپنے ساتھی کی درگت دیکھ کر دوسرا کتا اٹھا اور لمبی چھلانگ مار کر مجھے بھنبھوڑ
لیکن اس کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ اسے جھپٹتے دیکھ کر میں نے داہنا پیر ہوا میں پھیلا
سے گردش دی۔ میری لات پوری قوت سے اس کی کمر سے ٹکرائی تو وہ بھد سے بھاری
طرح زمین پر گر پڑا۔ دونوں کتے زندہ تو تھے مگر مُردوں سے بدتر تھے۔ ان سے نپٹ کر میں
سنیال سے کہا ''کہو میرا کھیل پسند آیا۔''

''کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' سنیال نے پستول نکال لیا۔ اسے
دینا بے وقوفی تھی۔ جھپٹ کر میں نے تڑپتے ہوئے ایک کتے کی ٹانگ پکڑی اور گھما کر ا
طرف اچھال دیا۔

سنیال کی انگلی حرکت کر چکی تھی۔ فائر کی آواز سے گودام گونج اٹھا لیکن گولی مجھ
پہنچنے کی بجائے کتے کے جسم میں پیوست ہوگئی۔ وہ تو پہلے ہی لب دم تھا۔ قیں کی آواز نکا
دھم سے گر پڑا۔ اس نے دوسرا فائر کیا جسے میں نے قلابازی کی بدولت ناکام بنا دیا۔ اس
بعد تو اس پر جنون سا طاری ہوگیا۔ وہ پے درپے فائر کرتا چلا گیا۔ میری قسمت اچھی تھی ایک
بھی میرے قریب سے نہیں گزری۔ ہر بار بندر جیسی پھرتی سے اچھل کر میں دور چلا ج
پستول خالی ہوتے ہی اس نے چیخ کر کہا۔ ''بے وقوفو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ مقابلہ کرو۔''

میری طاقت کا مظاہرہ تو وہ دیکھ ہی چکے تھے۔ اس لئے کوئی بھی نزدیک نہیں آ
سب کے سب دور دور سے مجھ پر آلو پھینکنے لگے۔ پوری طاقت سے پھینکا ہوا ایک بھی آلو
میرے سر سے ٹکرا جاتا تو میرے لئے بم کی طرح خطرناک ثابت ہوتا۔ اس لئے میں ا



ہل کر آلوؤں کی زد سے بچ رہا تھا لیکن حملہ چاروں سمت سے ہو رہا تھا سب نے ایک ساتھ بلا
دیا تھا۔ ایک سے بچتا تو دوسرا جسم سے ٹکرا جاتا۔ میرا جسم تو فولاد بن چکا تھا مگر سر نہیں۔ وہ تو
آدمیوں جیسا تھا اس لئے میں بچنے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔

میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا کہ سنیال کو موقع مل گیا۔ وہ آرتی کو کھینچتا ہوا نکل
گا۔ میں نے اس کا تعاقب کرنا چاہا لیکن آلوؤں کی برسات نے راستہ روک لیا۔ جھلا کر میں
ایک الماری پر بیٹھے سنیل پر چھلانگ لگا دی۔ ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا اس تک پہنچا اور
کھینچ کر گرا دیا۔ اس کے اوپر میں بھی گرا تھا۔ اس نے نیچے سے میری کمر کو پکڑ لیا اور چلانے
''اے او شفیق! نیچے اتر۔ میں نے پکڑ رکھا ہے جم کر پٹائی کر اس کی۔''

اس نے مجھے حلوا سمجھا تھا لیکن کچھ ہی دیر میں اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔ میں نے
ستہ آہستہ گھٹنے کو موڑا اور پوری طاقت سے اسے اچھال دیا۔ مجھے اپنی قوت پر خود بھی حیرت
ہی تھی۔ وہ پلاسٹک کے گڈے کی طرح اچھل کر اونچی چھت سے ٹکرایا اور پھر مری ہوئی
لی کی طرح پٹ سے گر پڑا۔ اس کی درگت بنتے دیکھ کر شفیق نے عقلمندی سے کام لیا اور باہر کی
ے بھاگ نکلا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں نے اس کا تعاقب کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ
ل فرار ہو چکا تھا اور اس کی منزل کرنسی نوٹوں کے کاغذوں سے بھری وین تھی۔ اس وین کو
کے دشمنوں سے بچانا ضروری تھا۔ ملک کی معیشت بگاڑنے کی خاطر وہ نقلی نوٹ چھاپنے
لئے کاغذ کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور میں اس کا پلان سبوتاژ کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ فرض کی
گی میں اگر جان بھی چلی جاتی تو مجھے پروا نہیں تھی۔ اسے سبق سکھانے کے لئے میں نے
ن جانب دوڑ لگا دی۔ اتفاق کہئے یا قسمت کی خرابی کہ باہر کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ایک گاڑی پر
ل فرار ہوا ہوگا اور دوسری گاڑی پر شفیق۔ کوئی ٹیکسی یا رکشہ ملنے کی امید بھی نہیں تھی اس لئے
پوری قوت سے مشرق کی جانب دوڑنے لگا۔ دومیل کا فیصلہ طے کرنا تھا جو میں نے
رلیا طارق کی روح نے پلان شیڈ بورڈ پر آکر یہی تو بتایا تھا دومیل مشرق میں پہنچ کر آدھا
گے جاؤ پانچ ہاتھ پیچھے آؤ۔

میں نے سوکھے ہوئے تالاب کے پاس پہنچ کر دیکھا، سنیال اور آرتی ادھر ادھر
یوں میں کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ ان کی بدعقلی پر مجھے ہنسی آگئی اور میں نے کہا: ''سنیال
ہے سوئی نہیں جو جھاڑیوں میں تلاش کر رہے ہو۔''

میری آواز سنتے ہی وہ دونوں یوں اچھل پڑے جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔

"تو تم یہاں بھی پہنچ گئے!" سنیال نے کہا۔

"کیوں مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟"

اس نے جواب نہیں دیا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔"سنیال مجھ سے تمہیں موت ہی نجات دلائے گی"

اس نے جواباً کہا۔"ہاں تمھاری موت۔"

آرتی نے مجھے غافل سمجھا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر میری جانب
دیا۔

وہ نہیں جانتی تھی، کہ میرے تمام مسام آنکھوں کا کام کرتے ہیں۔ رات کی
میں بھی وہ پتھر مجھے نظر آ گیا اور میں پھرتی سے داہنی جانب سرک گیا۔

پُرشور آواز کے ساتھ وہ پتھر سوکھے تالاب میں لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ میں نے
گنوانے کی بجائے، اس پر چھلانگ لگا دی، عام حالات میں میری حمیت گوارا نہیں کرتی
کسی عورت پر ہاتھ اٹھاؤں لیکن موقع نازک تھا۔ پھر وہ وطن دشمن تھی۔ اس وطن کی
خاطر ان گنت بہنوں نے آبرو، لاتعداد لوگوں نے اپنی جانیں دی تھیں۔ لاکھوں کے گھر
ہمیں ایک گھر ملا تھا پھر اس گھر سے محبت کیوں نہ ہوتی؟ مشرقی پنجاب کی ہزاروں شہید
وجہ کنواں تھیں کہ اس ملک کی خاطر ہماری بے حرمتی ہوئی ہے اس کی طرف اٹھنے والی آنکھ
پھوڑ دو۔ میں نے آرتی کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کے سر کو زمین پر دے مارا۔ اس
جیسے بالوں سے بھرا نازک سر جس میں شیطان کا ڈیرا تھا، پھٹ گیا۔

اس سے نپٹنے کے بعد میں نے سنیال پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اپنی قوم کی ر
نبھاتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی آپ یقین
اس وقت پتہ نہیں میرے جسم میں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ بھاری تن و توش کے
اٹھا کر میں نے دور اچھال دیا۔ وہ کم سے کم بیس گز دور جا کر گرا۔ اس کے حلق سے تیز چیخ
رات کے سناٹے میں گونج گئی لیکن چیخ کے ساتھ میری سماعت سے ایک اور آواز ٹکرائی
سنتے ہی میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ آواز تھی لوہے کی چادر سے کنائی کا جسم ٹکرانے کی
وہ وین کی باڈی سے ٹکرایا تھا اور مجھے طارق کی پہیلی یاد آ گئی۔ اس نے آدھا ہاتھ آگے
ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں آدھا ہاتھ یعنی ڈھائی انگلیاں یعنی ڈھائی گز اور پانچ
پیچھے یعنی پچیس گز پیچھے۔ جہاں سنیال گرا تھا۔ میں نے اسی جانب دوڑ لگا دی۔ سنیال



بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اگنیشن میں لگی چابی کو گھما کر
کھائی سے اسے نکال لے گیا۔ سڑک پر پہنچنے کے بعد میں نے وین کا رخ پولیس ہیڈ کوارٹر کی
جانب موڑ دیا۔ آندھی طوفان کی طرح وین کو دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔

وین دیکھتے ہی پولیس والوں نے مجھے گھیر لیا انہیں مطمئن کر کے میں نے پولیس کمشنر
سے ملاقات کی۔ انھوں نے ساری روداد سن کر محکمہ خفیہ کے افسران کو بلا لیا۔

ان کے سامنے میں نے پھر سے کہانی سنائی۔ وہ سب ہنس پڑے۔ انہیں ہنستے دیکھ
کر میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں نے سخت جملہ کہنا چاہا تھا کہ ایک افسر نے کہا۔"مجھے فخر ہے کہ ایک
وطن دوست میرے سامنے بیٹھا ہے لیکن آپ مایوس نہ ہوں آپ کی تگ و دو رائیگاں نہیں گئی
ہے میرے فیلڈ ورکرز نے پہلے ہی خبر دے دی تھی کہ کچھ لوگ کاغذ لوٹنا چاہتے ہیں اس لئے ہم
نے باہر سے دو بنڈل منگوائے تھے پہلی کھیپ میں ردی کاغذ تھے اور دوسری میں اصلی۔ آپ جو
وین لائے ہیں وہ عام کاغذوں سے بھری ہے مگر اس طرح سنیال اور اس کے گرگے ہماری
نظروں میں آ گئے ہیں۔ یہ صرف آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ آپ کو جب بھی ہماری
ضرورت پڑے، ان نمبروں پر فون کر لیں۔" اس نے کئی نمبر لکھ کر دے دیئے۔

"جب آپ نے اسے پہچان لیا ہے تو اسے گرفتار کر لیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں میرے بھائی! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ بغیر ٹھوس ثبوت کے اس پر ہاتھ
ڈالنے کا مطلب ہے وبال مول لینا۔"

"وبال؟ کیسا وبال؟ وہ وطن کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے اور آپ اس پر ہاتھ نہیں ڈال
رہے ہیں۔"

"میرے بھائی! ہم جتنے قوی نظر آتے ہیں، اندر سے اتنے ہی کمزور ہیں۔ ایک ذرا
سی لغزش ہمارے لئے الٹی آنت ثابت ہو سکتی ہے۔ اے کے فضل الحق کی پارٹی یوں بھی
حکومت کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ وہ لوگ اسے بھی سیاسی رنگ دے دیں گے۔"
افسر نے کہا۔

"میں ٹھہرا سیدھا سادہ آدمی۔ سیاست وغیرہ میرے پلے پڑنے سے رہی۔ اس
لئے پہلے ہی کہہ دیتا ہوں کہ وہ اگر وین کی چھت سے گرنے کے بعد بھی زندہ رہ گیا ہوگا تو میں

اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کی بات جدا ہے۔ پھر بھی یہی کہوں گا کہ قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کریں۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور اجازت لے باہر نکل آیا۔

☆======☆=====☆



شاہ باغ سے بے بی ٹیکسی پر سوار ہو کر بونو گرام پہنچا۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ ابوالبشر بے خبر سو رہا تھا۔ کئی بار کی دستک کے بعد اس نے دروازہ کھولا۔ میرا جسم تھکن سے چُور تھا اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں نے لمبی تان لی اگلی صبح اٹھنے کے بعد میں نے بشر سے کہا۔ ''تم جا کر دکان کھولو میں بازار سے ایک چکر لگا آتا ہوں۔''

''سیٹھ حشمت کے ہاں جا رہے ہیں؟''

''ہاں، پتا کرنا ہے کہ انھوں نے اب تک چچا کا بقایا ادا کیوں نہیں کیا؟''

''جایئے لیکن دوپہر تک لوٹ آیئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے میں باہر نکل آیا۔ بونو گرام کی گلیاں پار کرتے ہوئے جیریا ٹولی پہنچا اور وہاں سے شارٹ کٹ والی گلی سے ہوتا ہوا نواب پور پوسٹ آفس کے پاس نکلا۔ نشاط سینما کے سامنے سائیکل رکشا قطار میں کھڑے تھے۔ میں نے ایک رکشا والے سے کرایہ طے کیا اور چوک بازار کی طرف چل پڑا۔ بیگم بازار پہنچا تھا کہ ایک جگہ مجمع سا لگا دیکھا۔ تجسس نے سر ابھارا تو میں نے رکشا رکوا دیا۔ بھیڑ میں کھڑے ایک شخص سے پوچھا۔ ''کیا ہو گیا ہے''

اس نے جواب دیا۔ ''ابھی ابھی غنڈوں نے ایک لڑکی کو اغوا کر لیا ہے۔''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''دن دھاڑے؟ مصروف ترین سڑک پر ایسی واردات؟''

اس نے کہا۔ ''جب پولیس والے مجرموں سے بھتہ لیں گے تو اور کیا ہو گا۔''

ایک مولوی صاحب کانوں پر ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ''جب گناہ بڑھتا ہے تو خدالبطور سزا جلاد کو مسلط کر دیتا ہے۔''

دوسرے نے لقمہ دیا۔ ''ہاں بھائی میاں! یہ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔''

تیسرے نے کہا۔ ''نہیں میاں! بات کچھ اور ہے یہ مملکت خداداد ہے نا اسے بدنام کرنے کے لئے منصوبے سازنت نئی چالیں چل رہے ہیں۔ عوام میں خوف و ہراس پھیلانے

کے لئے اغوا اور ڈاکا زنی کا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔''

مجھے اس شخص کی بات سو فیصد سچ لگی، لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا اس لئے خاموش
سے رکشا کی جانب لوٹ آیا۔

دل پر ایک بوجھ سا آ پڑا تھا۔ میں بجھے بجھے دل کے ساتھ چوک بازار پہنچا۔ سیٹھ
حشمت کی دکان بند پڑی تھی۔ برابر والی دکان تراب فاروق کی تھی۔ وہ مجھ سے میوہ نہیں خرید
تھا۔ خود مغربی پاکستان سے لاتا تھا اس لئے اس سے بس رسمی ملاقات تھی۔ حشمت صاحب کے
بارے میں وہی بتا سکتا تھا اس لئے میں ان کی دکان میں داخل ہو گیا مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

''آؤ آؤ ضیغم میاں، بڑے دن بعد نظر آئے ہو۔''

''بس بھئی موقع ہی نہیں ملتا ہے۔'' میں نے بہانا بنایا۔

''بیٹھو چائے پیو۔'' اس نے نوکر کو آواز دے کر چائے کے لئے کہا۔

''آج حشمت چچا کی دکان کیوں بند ہے؟''

''ہم نے جتنی قربانیاں دی ہیں، لوگ انھیں ٹھوکروں میں اڑا رہے ہیں۔ خدا کی
نعمت کو جھٹلا رہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے کہا۔

''سوہنی دھرتی کے دشمن ملک کو جرائم سے بھر دینا چاہتے ہیں۔''

''یعنی؟''

''یعنی ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے جرائم کے سہارے عوام کو خوفزدہ کرن
چاہتے ہیں۔ کل حشمت صاحب کی بیٹی کا اغوا ہو گیا ہے۔ ہم نے اپنی عزت کی حفاظت کے
لئے پاکستان نامی قلعہ بنایا تھا اور آج اسی قلعہ میں ہماری عزت محفوظ نہیں ہے۔''

''اغوا کرنے والوں کی شناخت ہوئی؟''

''ایک ہفتے میں یہ چھٹی واردات ہے اور مجرم شناخت نہیں ہو پایا ہے۔ بھری پُری
سڑک پر کار رکتی ہے۔ دو تین آدمی اترتے ہیں اور راہ چلتی لڑکی کو کھینچ کر لے بھاگتے ہیں۔''

''حیرت ہے۔ اب تک یہ بات میرے کانوں تک نہیں پہنچی!''

''پہلی دوسری واردات کو لوگوں نے محبت کا شاخسانہ سمجھا لیکن پے در پے ہونے
والی وارداتوں نے بتا دیا کہ یہ کسی گروہ کی حرکت ہے جو خوبصورت لڑکیوں کو نشانہ بنا رہا ہے۔''

''شہر میں دو تین ہی گروہ ہیں لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ ایسی وارداتیں



ریں۔''

''میری سمجھ میں ایک ہی بات آ رہی ہے کہ یہ ایک سازش ہے حکومت کو کمزور کرنے
،عوام کو سڑکوں پر لانے کی تاکہ ملک کی معیشت کو دھچکا پہنچے۔ کاش وہ درندے مجھے نظر
ئیں اگر وہ مجھے مل گئے تو میں انھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا خواہ مجھے پھانسی لگ جائے۔''

ب فاروق کچھ دیر کے لئے رکا اور پھر دیوار پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجہ
ں بولا۔ ''میں اس منظر کو بھول نہیں سکتا ہوں میں بزدل تھا نا اس لئے اس دن خاموش رہ گیا
، اپنی جان بچانے کے لئے اس درندگی کو دیکھ کر بھی کچھ نہیں کر سکا تھا۔ تم نے مشہور صحافی
راہیم جلیس کی کتاب ''ترنگے کی چھاؤں میں'' اور مشہور ہندوستانی فلم ساز و ہدایت کار رامانند
اگر کی کتاب ''اور انسان مر گیا'' میں جس منظر کو پڑھا ہو گا، میں نے اسے اپنی آنکھوں سے
یکھا ہے۔ میں ترن تارن کا رہنے والا ہوں میرے گھر کے ایک ایک فرد کو ہندوؤں نے زندہ
ا دیا۔ اکسٹھ گھروں کی آبادی میں مَیں واحد خوش نصیب ہوں جو زندہ بچ گیا۔ میری مدد کی تھی
رے ایک سکھ نوکر نے، اس نے میرے سر پر سکھوں والی پگڑی باندھ کر ریل میں بٹھا دیا تھا۔
ں اس بہروپ میں امرت سر پہنچا۔ وہاں تو پہلے سے ہی قیامت کا سماں تھا۔ گلیوں میں لاشیں
ی تھیں۔ مسلمانوں کے مکانات جل رہے تھے مسلم عورتوں کو مساجد میں قید کر کے رکھا گیا تھا
ران کی اجتماعی آبروریزی کے لئے لوگوں کو جبریہ مسجدوں میں بھیجا جا رہا تھا۔ میں نے ان
نکھوں سے وہ منظر بھی دیکھا ہے جب امرت سر کے بازاروں میں مسلمانوں کی عفت مآب
ٹیوں کو عریاں کر کے جلوس کی شکل میں گھمایا جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنی جان پیاری لگی تھی۔
ں لئے قیامت صغریٰ کا وہ منظر دیکھ کر بھی کچھ نہ کر سکا لیکن آج اپنے اس پاک وطن میں تقدس
مال ہوتے دیکھ نہیں سکوں گا۔ یا تو خود مر جاؤں گا یا اسے مار دوں گا۔''

''فکر نہ کرو دوست، مجھے اپنے شانہ بشانہ پاؤ گے۔'' میں نے اس کے کندھے پر
تھ رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے پورا یقین تھا کہ تم یہی کہو گے۔ آؤ، ہم تم مل کر عہد کریں کہ اپنے معاشرے کو
رائم سے پاک کریں گے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ابتدا سیٹھ حشمت کے گھر سے کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چلو'' کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''تمھارا نوکر دکان سنبھال لے گا، تراب خان؟''

"پہلے تو یہ سن لو کہ میں خان نہیں ہوں۔ یہ تو بنگالیوں کی ذرہ نوازی ہے کہ انھو
خان مشہور کر دیا۔ میں شیخ ہوں۔ میرا پورا نام شیخ تراب فاروقی ہے۔ میرا سلسلہ نسب خلی
حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے اس لئے کم از کم تم تو خان نہ کہو۔"

"اب نہیں کہوں گا۔"

"رہا تمھارا دوسرا سوال تو میرے نوکر بھروسہ مند ہیں۔ بے ایمانی انھیں چھو
نہیں گئی ہے۔"

"تو چلو حشمت کے گھر چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

ہم دونوں ان کے گھر پہنچے تو حشمت صاحب سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ
بولے۔ "خان ہم لٹ گئے برباد ہو گئے۔"

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ ہوا، اس سے مجھے بھی دکھ پہنچا ہے۔
یقین کریں میں ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ آپ مجھے حالات سے آگاہ کرتے
کڑیوں سے کڑیاں ملانا میرا کام ہے۔"

"خان! بس قسمت کی خرابی تھی کہ اسے ایڈن گرلز کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ وہیں
کی ملاقات حسن آرا سے ہوئی۔ وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی لیکن پتا نہیں، اس نے صبی
کیسا جادو کر دیا تھا۔ کہ جب دیکھو، اس کے گھر پہنچی ہوئی ہے۔ منع کرتا تو آئندہ نہ ملنے کا
کر لیتی لیکن پھر وہی چکر۔ مجھے تو پورا شک ہے اس گھناؤنی حرکت میں اس کا ہاتھ ہے۔ و
گھر سے غائب ہے۔"

"اس کا پتہ تو جانتے ہوں گے؟"

"وہ آلو بازار میں رہتی تھی۔ سہروردی صاحب کا گھر ہے ناں فردوس منزل اسی
پاس۔"

"مجھے اجازت دیجئے میں اس کے گھر والوں کو ٹٹولتا ہوں۔"

وہاں سے تراب فاروق کے ساتھ آلو بازار پہنچا۔ حسن آرا کے گھر میں بھی صف
بچھی تھی۔ ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب صبیحہ کا کیا دھرا ہے۔ اسی نے میری بیٹ
ورغلایا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "صبیحہ کے علاوہ بھی کسی سے اس کی دوستی تھی؟"

"ہاں جمیلہ سے بھی تعلقات تھے۔"



"اس کا گھر کہاں ہے؟"

"وہ انگلش روڈ پر ناگر محل سینما کے پچھواڑے رہتی ہے۔"

"چلو بھائی اسے بھی دیکھ آئیں۔" میں نے تراب فاروق کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور
ہر نکل آیا۔ ہم دونوں باہر آئے اور سائیکل رکشا پر سوار ہو کر انگلش روڈ پہنچے۔ جمیلہ کا گھر تلاش
رنے میں مجھے پریشانی نہیں ہوئی۔ دستک دیتے ہی درمیانی عمر کی ایک عورت نے دروازہ
کھولا۔

"جمیلہ گھر پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی وہ تو نہیں لیکن شکیلہ، بنو اور رانی خالی ہیں۔ کہیے تو انھیں بک کر دوں؟"

اِس کے اندازِ تخاطب نے میرے ذہن کو جھٹکا دیا۔ بک کرا دوں کا مطلب سمجھنے میں
ر نہیں لگی۔

میں نے پلٹ کر تراب فاروق کی طرف دیکھا اور پھر اندر داخل ہو گیا۔ ہم دونوں کو
س نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی تو اس کے ساتھ تین نوعمر
ڑکیاں تھیں۔ میں نے سرسری نظر سے ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "بھئی جمیلہ کی تو بات ہی
کچھ اور ہے وہ کالج گرل ہے نا۔"

وہ بولی۔ "صاحب جی! یہ سب بھی پڑھتی ہیں۔ شکیلہ قائداعظم کالج میں اور بنو
ھاکہ کالج میں اور گڑیا رانی بنگلہ بازار ہائی اسکول میں۔ تینوں کو اپنے فن میں ملکہ حاصل ہے۔
پ لے کر تو جائیں۔"

میں نے تینوں کو پھر سے دیکھا۔ رانی مجھے کام کی نظر آئی۔ میں نے اس کی جانب
شارہ کر دیا۔

"جناب جی! اس کی فیس زیادہ ہے۔ ابھی بچی ہے ناں۔" بڑھیا بولی

"کتنی فیس ہے؟" میں نے پوچھا

"پچاس روپے۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہے؟"

"عمر بھی تو کم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ لیجئے۔" میں نے دس دس کے پانچ نوٹ بڑھائے۔

"آپ دو ہیں کیا؟" اس نے پوچھا

میں جواب دینا چاہتا تھا کہ اس نے مڑ کر رانی سے پوچھا۔ ''جاؤ گی؟'' را
بالوں کو جھٹکے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا ''ہاں!''

بڑھیا نے مجھے کہا۔ ''صاحب جی پچیس روپے اور دیں۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ دو ہیں ناں۔'' اس نے کہا۔

میں نے مزید پچیس روپے دے دیئے۔

وہ ہم دونوں کے ساتھ باہر آ گئی۔ ایک رکشے میں اتنی سواریاں نہیں جاسکتی
اس لئے میں نے دو سائیکل رکشا رو کے ایک پر خود سوار ہو گیا اور دوسرے پر تراب کے
رانی کو بٹھا دیا۔ میرا رکشا آگے تھا۔ میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ بونو گرام چلنا ہے۔ بونو گر
کر میں نے گھر کا تالا کھولا اور رانی کو اندر بلا لیا۔ اس نے میرے کمرے کا جائزہ لیتے
کہا۔ ''تم تو کافی پیسے والے نظر آتے ہو۔''

''اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔''

''کچھ پینے پلانے کے لئے نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' مجھے کامیابی کی امید نظر آئی تو میں نے سو کا نوٹ ن
تراب کو دیتے ہوئے کہا۔ ''ہکا کے اڈے پر چلے جاؤ کہنا ضیغم نے بھیجا ہے۔ وائٹ ہارس
بوتل منگوا دے۔''

''اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے بھی پتا ہے انگلش شراب کہا
ہے۔'' تراب نے کہا اور باہر نکل گیا۔

''وہ بڑھیا کون تھی رانی؟''

''جی وہ میری امی ہیں۔''

''تمہیں اس گناہ آلود زندگی سے نفرت نہیں ہوتی؟''

''نفرت؟ کیسی نفرت؟ کسی اور کام میں اتنے پیسے ملتے ہیں؟ اگر میں تم
روپے مانگتی تو کیا تم دے دیتے؟ نہیں، کبھی نہیں لیکن مجھے حاصل کرنے کے لئے چکر
دے آئے۔''

مجھ سے جواب نہ بن پڑا تو میں نے سر جھکا لیا۔

''کیوں خاموش کیوں ہو گئے؟''



''مجھے تمہارے جواب نے نہیں بلکہ ہماری کوتاہی نے خاموش کر دیا ہے۔ اسلام
نے بے سہارا اور غریبوں کی امداد پر زور دیا ہے لیکن ہم ایسا نہیں کرتے۔ ہم مجرم ہیں۔ ہماری
سزا تم جیسی عورتیں ہیں۔''

رانی نے مسکرا کر کہا۔ ''تو آؤ سزا پالو۔''

میں اس کی اس غیر متوقع بات پر ٹپٹا گیا لیکن بات بناتے ہوئے بولا۔ ''ایسی بھی کیا
جلدی ہے۔ پہلے تم پی لو۔''

کچھ دیر بعد تراب آ گیا۔ میں نے بوتل لے کر رانی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لو پیو۔''

اس نے پوچھا۔ ''تم نہیں پیو گے؟''

''نہیں میں یہ حرام شے نہیں پیتا۔''

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''واہ بہت خوب! گڑ کھاتے ہو اور گلگلوں سے پرہیز؟''

میں نے بھی ہنس کر کہا۔ ''مجبوری کیا نہیں کراتی۔''

اس نے کہا۔ ''تو پھر اس لئے پیو کہ مجبوری یاد نہ آئے۔ میں بھی اسی لئے پیتی ہوں
کہ مجھے کچھ یاد نہ رہے۔''

اس نے گلاس میں شراب ڈالی اور پھر پانی ملا کر حلق میں انڈیلنے لگی۔ دوسرے گلاس
کے بعد اس کی آنکھوں میں سرخی دوڑنے لگی۔ اپنی جگہ چھوڑ کر میرے برابر آ کر بیٹھی تو میں کھڑا
ہو گیا۔

''ارے..... تو م بھاگتے ہو؟'' اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔

''ایک سگریٹ تو سلگا لوں۔'' میں نے بہانہ بنایا

''ایک سگریٹ مجھے بھی دو۔'' اس نے کہا۔

''ہاں ہاں لو...... ارے یہ بھی کھاؤ نا یہ سب تمہارے لئے ہے۔'' میں نے اسے
اپنے جال میں آتے دیکھا تو نمکین پستے کی پلیٹ بڑھائی۔

اس نے چوتھا گلاس ختم کیا تو نشہ اس پر پوری طرح چھانے لگا تھا۔ مجھے کام بنتا نظر
آ رہا تھا۔ جب اس کی آنکھیں بند ہوتی نظر آئیں تو میں نے پہلا سوال کیا۔ ''تم حسن آرا کو
جانتی ہو؟''

''کون حسن آرا؟''

''وہی جو آلو بازار میں رہتی ہے؟''

''وہ...... اسے...... جمیلہ نے پھانسا...... ہائے...... میں نے نہیں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''وہیں...... جہاں اسے ہونا چاہئے۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں۔''

''یہ تو میں نہیں جانتی...... میرا کام پھانسنا ہے۔ بش۔'' اس نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''تم کیسے پھانس لیتی ہو؟''

''ہاہاہا۔ یہ تو راز...... کی بات ہائے۔ میں کیوں بتاؤں؟''

''لو اور پیو۔'' میں نے گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت اچھی لڑکی ہو اور اچھی لڑکیاں سوال کا جواب فوراً دیتی ہیں۔''

''نائیں میں بوہت خراب ہوں۔ بوہت خراب...... بوہت لڑکیوں کو خراب کیا۔'' وہ نشے کی رو میں رونے لگی۔

اسے بہکتے دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کہیں میرے روپے برباد نہ ہو جائیں اس خیال سے میں نے پھر سوال دھرایا۔

''وہ جو بڑھیا تھی ناں 'ہچ' وہ میری کوئی نہیں تھی۔ 'ہچ' ہم سب اس کی نوکرانی ہیں۔ کیا سمجھے؟ نوکرانی مجھے تو یہ بھی پتا نہیں میرے ماں باپ کون ہیں 'ہچ'۔''

اس کی ہچکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ''اور پیو۔''

''نائی ہم اب اور نائی پیئے گا۔''

''تب باتیں کرو۔''

''تم پوچھا! ہچ' ہم کیسے پھانستے ہیں۔ 'ہچ' ہم اسکول کالج میں خوبصورت لڑکیوں سے دوستی کرتے ہیں۔ 'ہچ' انہیں ہندوستان سے منگوائی ہوئی گندی کتابیں پڑھواتے ہیں۔ 'ہچ' اور پھر انہیں گھر لانا شروع کر دیتے ہیں۔ 'ہچ' دو چار بار کے بعد ایک دن پریکٹیکل منظر بھی چھپ کر دکھا دیتے ہیں 'ہچ'۔ اس طرح وہ خود بہکنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ 'ہچ''۔

میں نے پوچھا۔ ''پریکٹیکل کا انتظام کون کرتا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''یہ تو روز کا معمول ہے۔ ہچ''



''بعد میں لڑکیوں کا کیا ہوتا ہے؟''

''ان کی تصویریں کھینچ کر ہم بلیک میل کرتے ہیں۔ 'ہچ' پھر انھیں گھر سے بھاگنے پر بور کر دیتے ہیں۔ 'ہچ'۔''

''وہ بھاگ کر کہاں جاتی ہیں۔''

''انھیں کسی دوسرے شہر پہنچا دیا جاتا ہے۔ 'ہچ'۔''

''حسن آرا کو کہاں پہنچایا گیا ہے؟''

''وہ...... وہ...... راج۔ پدما......'' کہتے کہتے وہ بے خبر ہو گئی۔ مجھے جو معلوم کرنا تھا ملوم کر لیا تھا۔ حسن آرا کو راج شاہی پہنچایا گیا ہے تو اس کے ساتھ صبیحہ بھی ہو گی۔ اسے تلاش رنے کے لئے فوراً نکلنا ضروری تھا اس لئے میں نے صدیقی سے کہا۔ ''یہ لڑکی تو انٹا غفیل ہو ئی۔ اسے پہنچایا کیسے جائے؟''

''میں پہنچا آتا ہوں۔ آپ بے بی ٹیکسی لے آئیں۔'' تراب نے کہا۔

میں بے بی ٹیکسی لے کر فوراً لوٹ آیا۔ اس نے ٹیکسی والے کو بتایا کہ لڑکی بیمار ہے اور سے فوراً پہنچانا ہے۔ وہ بے چارا اس کی بات پر یقین کر کے آندھی طوفان کی طرح ٹیکسی دوڑا نا الے گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس نے بتایا کہ لڑکی کے گھر میں کوئی نہیں تھا مجبوراً اسے آمدے میں چھوڑ کر آنا پڑا۔

''میاں! اب تیار...... ہم میدانِ جنگ میں کودنے والے ہیں۔ راج شاہی سے کی کو واپس لانا ہے۔''

''حسن آرا کو؟ چلو میں تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ایسا کرو، دو ٹکٹ لے آؤ۔''

''اماں واپس آنے کی کیا ضرورت ہے۔ گاڑی کا وقت ہو چکا ہے۔ وہیں سے بیٹھ ں گے۔''

''ہاں تم کہتے تو ٹھیک ہو۔ چلو، مجھے کون سا مال اسباب ساتھ لینا ہے۔''

ہم دونوں کملا پور اسٹیشن پہنچے۔ نیا نیا اسٹیشن بنا تھا۔ دکانداروں کی چاندی تھی۔ سافروں کو جی بھر کے لوٹا جا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بھی تین گنا پیسے ادا کر کے ایک روپے میں دو پ چائے پی اور ٹرین پر سوار ہو گئے۔ میمن سنگھ، جمال پور، احمد نگر سے ہوتے ہوئے صبح چھ بجے جگنا تھ گنج گھاٹ پہنچے۔ ناشتا کیا اور پدما ندی پار کرنے کے لئے اسٹیمر پر سوار ہو گئے۔

ساڑھے چھ بجے سراج گنج گھاٹ پر اترے۔ وہاں سے راج شاہی کے لئے ٹرین
ہوئے اور شام کے وقت راج شاہی پہنچ گئے۔ وہاں پدما بورڈنگ میں ایک کمرا لیا اور ٹھہر

''ضیغم! مجھے نہیں لگتا کہ اس بورڈنگ میں ان لڑکیوں کو رکھا گیا ہوگا۔'' تراب
بستر پر پیر پھیلا کر لیٹتے ہوئے کہا۔

''اتنی سی بات میں بھی سمجھ سکتا ہوں۔ ان لوگوں نے لڑکیوں کو پبلک پلیس پر نہیں
ہوگا لیکن سرا یہیں کہیں ہوگا ورنہ لڑکی پدما نہیں کہتی۔ راج شاہی میں پدما نام پر یہی
بورڈنگ ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''ہوسکتا ہے پدما کسی عمارت کا نام ہو۔ مثلاً پدما بلڈنگ، پدما ہاؤس، پدما وغیرہ

''ہاں یہ بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے تائید کی۔

''یہاں میرا ایک دوست ہے کہو تو اسے بھی شریک راز کرلوں۔'' تراب نے کہا

''وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کس قماش کا ہے؟'' میں نے ایک ہی سانس میں
سوال کردیئے۔

''اس کا نام حمید ابڑو ہے۔ وہ سندھ کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور یہاں
ڈبلیوڈی میں کلرک ہے۔'' تراب نے جواب دیا۔

''چلو چل کر مل لیتے ہیں۔ اگر ہمارے پیمانے پر پورا اترے تو اسے بھی ساتھ
لیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

ہم دونوں پیدل ہی انگلش بازار پہنچے۔ تراب نے ایک پان والے سے حمید
بارے میں پوچھا۔ اس نے تیسری گلی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں جا کر کسی
بھی پوچھ لیجئے۔ وہ آپ کو بتادے گا۔

ہم لوگ اسی گلی میں پہنچے لیکن کسی سے پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ تہ
بنیان پہنے ایک گھر کے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھتے ہی صدیقی نے نعرہ لگایا۔ ''حمید ابڑو!''

وہ شخص پہلے تو چونکا پھر تیزی سے ہماری جانب لپکا۔ اس نے اتنے جارحانہ
میں تراب صدیقی کو اپنے سینے سے بھینچا کہ وہ چیخ اٹھا۔ میں نے سوچا کہیں یہ مجھے بھی اپنا نشا
بنالے۔ میری سوچ غلط نہیں تھی۔ اس کے بعد وہ میری ہڈیاں کڑکڑانے کے لئے لپکا۔ بخدا
کے بازوؤں میں غضب کی طاقت تھی۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کی ایک دو پسلیاں ضر
کھسک جاتیں۔ معانقے کے بعد اس نے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''سائیں، بیوی



تو ہیں نہیں اکیلا آدمی ہوں جو روکھی سوکھی ہے۔ کھالیں۔''

میں نے کہا۔ ''بھائی ہم دعوتیں کھانے نہیں آئے ہیں۔ ایک ضروری کام ہے۔ اگر
ہوسکے تو ہماری مدد کردو۔''

اس نے آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''سائیں ایسا مت بولو۔ حکم کرو لیکن روٹی
کھانے کے بعد۔''

اس کے محبت بھرے انداز نے مجھے علی گوٹھ کی یاد دلادی۔ وہی انداز، وہی جذبہ،
باتوں میں وہی مٹھاس، میری آنکھیں بھرآئیں۔

''سائیں، آپ کی آنکھ میں آنسو؟'' حمید تڑپ اٹھا۔ ''مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی
ہے؟''

''نہیں میرے یار! تیرے انداز نے مجھے علی گوٹھ کی یاد دلادی۔''

''علی گوٹھ؟ آپ علی گوٹھ گئے ہیں؟'' حمید نے پوچھا۔

''ہاں، وہاں علی صاحب میرے کرم فرماؤں میں ہیں۔''

''سائیں تب تو آپ میرے رشتے دار ہیں۔ میں بھی اسی گوٹھ کا ہوں اور علی
صاحب میرے پھوپھا ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پھر مجھ سے لپٹ گیا۔

اس امربیل سے میں نے اپنے آپ کو الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''یار تو پہلے یہ بتا اور
کتنی بار لپٹے گا؟''

''سائیں، تمہیں تو اپنے سینے میں چھپا لینے کو دل کرنے لگا ہے۔''

''صبر، صبر آج نہیں کل میں زرہ بکتر پہن کر آؤں گا تب لپٹانا۔''

میری بات پر حمید اور تراب صدیقی دونوں قہقہہ لگانے پر مجبور ہوگئے۔

حمید نے روٹی اور گوشت کا سالن سامنے رکھ دیا۔ ''سائیں میں ٹھہرا اکیلا آدمی، اس
لئے ایک ماسی کو رکھ لیا ہے۔ وہی کھانا بنا دیتی ہے۔ اپنے ادھر کا ذائقہ کہاں سے ملے گا پھر بھی
رزق ہے اللہ سائیں کا شکر ادا کرو۔''

ہم دونوں بھوکے تھے روٹیوں پر ٹوٹ پڑے۔ سیر ہونے کے بعد میں نے کہا
''حمید بھائی......''

''اوے بھائی ہوگا تو، مجھے بھائی کہہ کر مت پکارنا۔ میرا نام لے میں تجھے بھائی
کہوں گا۔ تو میرا بڑا ہے۔''

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ باغ و بہار شخصیت کا حامل ہے اور ایسے شخص کے سا
وقت اچھا گزرے گا۔ میں نے اسے منانے کے لئے کہا۔ ''اچھا میرے چھوٹے بھائی! اب
بتاؤ راج شاہی میں ایسی کتنی عمارتیں ہیں جن پر پدما لکھا ہوا ہے؟''

''صرف دو، ایک پدما بورڈنگ اور دوسرا پدما نیواس۔''

''یہ پدما نیواس ہے کس کا؟'' فاروق نے پوچھا۔

''کسی ہندو راجہ کا راج محل ہے۔ اب تو اس میں اُلو بولتا ہے۔''

''یہ ہے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں سے تین میل پر ہے۔ ریل سے آتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ بہت شاند
عمارت ہے۔ اسی کے سامنے راج شاہی یونیورسٹی کا سٹاف کوارٹر ہے۔''

''اسٹاف کوارٹر؟''

''ہاں پروفیسرز رہتے ہیں۔''

''مجھے لے چلو گے؟''

''ضرور، کوئی خاص کام ہے؟''

''تم ٹھہرے سرکاری ملازم، تمہیں کسی پھڈے میں ڈالنا نہیں چاہتا اس لئے کام
نوعیت بتا نہیں پاؤں گا۔''

''بھئی اگر غیر قانونی ہے تو مت بتاؤ لیکن......''

صدیقی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اوئے تو ہمیں مجرم سمجھتا ہے۔ مار مار
تیرا سر توڑ دوں گا۔''

''تب بتانا کیا بات ہے، اتنی رازداری کیوں ہے؟''

''سن! اس سرزمین پر آ کر تجھ میں کتنی تبدیلی آئی، پتا ہے؟ زبان بدلی، اندا
نشست و برخاست بدلا۔ مزاج بدلا، اب تجھے دیکھ کر کون کہے گا کہ تُو سندھی ہے۔''

''بھئی یہ تو ماحول کا اثر ہے۔''

''نہیں۔ تیرا جذبہ ہے۔ تُو نے یہاں والوں کو اپنا بھائی سمجھا۔ ان کے دل کو جیتنے
کے لئے خود کو ان کے رنگ میں رنگ لیا اور یہ بات کچھ لوگوں کو پسند نہیں آئی۔ وہ اسے غلط رنگ
میں پیش کر کے یہاں والوں کو بھڑکا رہے ہیں۔''

''میں ان کا خون پی جاؤں گا۔'' حمید کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔



''ہاں، ہاں تو ویمپائر ہے لیکن پوری بات تو سن لے۔'' صدیقی نے کہا۔

''بولو!''

''ایسے ہی کچھ شرپسند ہندو تخریب کاری پر اتر آئے ہیں۔ وہ کچھ لڑکیوں کو اغوا کر
کے لے آئے ہیں۔''

''چلو، ہم ابھی چلتے ہیں۔''

''چلو۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

باہر آ کر سائیکل رکشا پر سوار ہو گئے۔ ڈھاکہ اور راج شاہی کے رکشے میں نمایاں
فرق محسوس کیا۔ وہاں کے رکشے گول باڈی کے اور چھوٹے ہوتے ہیں لیکن راج شاہی کے
چوڑے باڈی والے تھے جس میں تین آدمی آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ ہم تینوں آدھے گھنٹے
میں یونیورسٹی پہنچ گئے۔

''اسی عمارت کا نام پدما نیواس ہے۔'' حمید نے ایک محل نما عمارت کی جانب اشارہ
کیا۔

میں نے اس تین منزلہ عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے تو بتایا تھا کہ اس میں
اُلو بولتا ہے لیکن یہ تو آباد ہے۔''

''کافی دنوں سے ادھر آیا نہیں ہوں۔ ایک ڈیڑھ ماہ پہلے تک غیر آباد تھی۔'' حمید
نے بتایا۔

ہم لوگ بات کر ہی رہے تھے کہ پروفیسرز کوارٹرز سے ایک نوجوان نکلا اور ہمارے
پاس آ کر بولا۔ ''آپ لوگوں کو سر بلا رہے ہیں۔''

''ہمیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''مجھے بلا رہا ہوگا۔ میرے واقف کار یہاں بہت ہیں۔ یہ بلڈنگ میں نے بنوائی
ہے۔'' حمید نے کہا۔

''ہاں بھائی انھی کی حکومت ہے۔'' صدیقی نے چوٹ کی۔

''حکومت تو ہم سب کی ہے لیکن تم ٹھہرے عوام اور میں ہوں کارندہ۔'' حمید نے
سیڑھی چڑھتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں باتیں کرتے ہوئے پانچویں منزل پر پہنچ گئے۔ ہمیں بلانے والے
نوجوانوں نے اوپر پہنچ کر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا

لگا۔ میرے سامنے کمر پر ہاتھ رکھے کلو کھڑا تھا۔

کلو سے میری ملاقات چٹا گانگ میں ہو چکی تھی۔ میری مار کی یادگار اس کی پیشانی ثبت تھی۔

''میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ تم لوگ پدما نیواس کو دیکھ رہے ہو میں سمجھ گیا مجھ سے ملنا چاہتے ہو اس لئے بلالیا۔'' کلو نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

''ہاں، میں وطن کے غداروں کو ہی ڈھونڈ رہا تھا، اتفاق ہے کہ تم ہی ملے۔ نئی شکل دکھائی نہیں دی۔'' میں نے جواب دیا۔

''نئی شکل دیکھنا چاہتے ہو؟'' کلو نے مجھ سے کہا اور پھر اندر والے دروازے کی جانب مڑ کر بولا۔ ''دوستو! باہر آ جاؤ یہ تم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔''

کمرے سے یکے بعد دیگرے آٹھ نوجوان آ کر کھڑے ہو گئے۔

''بئی ان سے ملو یہ ہیں محبِ وطن، خان بہادر خان، اعظم پتا نہیں کیا، کیا۔'' کلو نے اپنے مخصوص لہجے کو برقرار رکھا۔

''مسٹر کلو! یہ مت سمجھو کہ میں تمہاری افرادی قوت سے ڈر جاؤں گا۔''

''نہیں بھائی تم رستم زماں ہو۔ تم کیوں ڈرنے لگے۔''

''میں نے تمھارے پورے گروہ کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔''

''واہ! تم ہمارے گروہ کو ختم کر دو گے لیکن ہمارا جرم؟''

''تمھارا جرم یہ ہے کہ تم ملک میں نفاق کا بیج بو رہے ہو۔''

''نفاق کا بیج تو تم لوگوں نے بویا ہے۔ صدیوں سے بنگالی، بنگالی ایک تھے۔ تم لوگوں نے آ کر پھوٹ ڈالی۔ ہمارے ''شونار دیش'' (سونے کے ملک) کو تم لوگ لوٹ رہے ہو۔ ہم لوگوں کے پٹ سن، چائے، چاول کا زرمبادلہ ہضم کر رہے ہو۔ ہم بھوکے ہیں اور تم لوگ پچھمی پاکستان کو تعمیر کر رہے ہو۔ ہم نوکری کے لئے ترس رہے ہیں اور تم کراچی میں بڑی بڑی عمارتیں بنوار ہے ہو۔'' ایک ساتھ کئی آدمیوں نے کہا۔

''واہ! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ملک کی آزادی سے پہلے یہاں کیا تھا؟ کتنے ہنرمند تھے؟ کتنے کارخانے اور ملیں تھیں؟ کتنی سڑکیں اور پل تھے؟ کپتائی ڈیم، چندر گونا پیپر ملز، کرنا فلی پیپر ملز، چٹا گاؤں کی بندرگاہ، فینچو گنج فرٹیلائزر کمپلیکس کس نے بنوایا؟ پورے ملک میں سڑکوں کا جال کس نے بچھایا؟ کیا ڈھاکا اور چٹا گاؤں 47ء سے پہلے اتنے ہی ترقی یافتہ



؟ کیا مغربی پاکستان میں اتنا بڑا اور اتنا خوبصورت اسٹیشن بنا جتنا بڑا کملا پور اسٹیشن ہے؟ کیا
ربی پاکستان میں اتنا بڑا آئل ریفائنری پلانٹ بنایا جا رہا ہے جتنا بڑا چٹا گاؤں میں بن رہا
؟ کیا جاذب پور کے برابر آرڈیننس فیکٹری کسی اور حصے میں بن رہی ہے؟ بولو جواب دو۔''
نے تقریر کے انداز میں کہا۔

''اسلام آباد میں کیا آسمان سے عمارتیں اتر رہی ہیں؟'' کلو نے کہا

''وہ دارالحکومت ہے۔ دنیا بھر سے آنے والے پہلے اسی شہر کو دیکھیں گے پھر کسی شہر کو۔ اگر اسلام آباد کی تعمیر ہو رہی ہے تو ڈھاکا میں بھی ایوب نگر بن رہا ہے۔ کیا جاپانی طرز اتنا خوبصورت ذیلی شہر مغربی پاکستان میں کہیں بسایا جا رہا ہے۔ کیا مغربی پاکستان میں میمن ہ کے برابر ایگری کلچر یونیورسٹی بنی؟ ایشیا کی سب سے بڑی اس یونیورسٹی کو کس نے بنایا؟ وانا شروع کروں گا تو رات گزر جائے گی۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ سب ہمارے پٹ سن کے پیسے سے بنا ہے۔'' کلو کے ایک ساتھی نے کہا۔

''پٹ سن 47ء سے پہلے بھی ہوتا تھا اور اس کا فائدہ کلکتہ والے اٹھاتے تھے لیکن ستان بنتے ہی آدم جی جوٹ مل، کریسنٹ جوٹ ملز اصفہانی جوٹ ملز کے علاوہ بھی دس ٹ ملز کھل گئے ہیں۔ یہ تیرہ ملیں پاکستان بننے کے بعد بنیں یا پہلے؟ اگر یہ ملیں نہ بنتیں تو جوٹ اکرنے کا فائدہ کیا ہوتا؟''

''استاد! زیادہ منہ ماری سے کوئی فائدہ نہیں۔ تینوں کو ختم کرو۔'' ایک نے کہا

''کیا تو ہمیں ختم کرے گا؟'' صدیقی اچھل پڑا۔

''نہیں جی اچار ڈالیں گے۔'' کلو بولا

''اوئے منہ سنبھال کے۔'' حمید بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''اتنی زور سے مت چیخ۔'' ایک نے حمید کی پسلی میں کھڑی انگلی مارتے ہوئے کہا
بے قابو ہو گیا۔ اس نے بھی ہاتھ چلا دیا۔ وہ سب بھی لپٹ پڑے۔ ان کی تعداد دس تھی اور تین پھر بھی ہم جی جان سے لڑ رہے تھے۔ میرا گھونسا جس کے چہرے سے ٹکراتا وہ ڈکراتا ہوا جاتا۔ جب کہ میں بہت ہی ہلکی چوٹ مار رہا تھا۔ اسی درمیان کسی نے پیچھے سے میرے سر ہے کی چھڑی سے وار کر دیا۔ لوہے کی چوٹ معمولی نہیں ہوتی۔ سیمسن کے بھی سر کے پچھلے پر وار کیا جاتا تو وہ بھی ڈلیلہ کو بھول کر لمبا لمبا لیٹ جاتا۔ میں بھی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو ا۔ کافی دیر بعد میری آنکھ کھلی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کمرے میں بلب کی زرد روشنی پھیلی

تھی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں ہم سے
ہوئی تھیں۔ یقیناً مجھے بے ہوشی کے عالم میں اس کمرے سے منتقل کیا گیا تھا۔ یکایک مجھے
کہ حمید اور صدیقی میرے ساتھ تھے۔ وہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑ
اور میں نے کمرے کے بند دروازے کو پیٹ ڈالا لیکن کسی قسم کی آہٹ سنائی نہ دی۔ میر
کہ وہ لوگ مجھے قید کر کے کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کے آنے سے پہلے مجھے نکل بھاگنا
لیکن راستہ؟ راستے کی تلاش میں، میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ شیشم کی لکڑی سے
دروازے کی دوسری جانب کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ اس لئے میں نے دروازے کا خیال ترک
اور کھڑکی کی جانب چلا آیا۔ کھڑکی بھی پرانی طرز کی تھی۔ لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی ہوئی تھ
ان سلاخوں کے پار دیکھا۔ نیچے سڑک پر دوڑتے ہوئے رکشوں کی گھنٹیوں کی اور راہ گیر
مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے سلاخوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ کچھ دیر کی زور آز
خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور دونوں سلاخیں اکھڑ گئیں۔ سلاخوں کے درمیان اتنی جگہ بن گئی
میں آسانی سے سر باہر نکال سکتا تھا۔ میں نے تیسری سلاخ کو بھی اکھاڑ دیا اور اپنا سر باہر نک
دیکھا۔ کھڑکی سے تین فٹ نیچے آرائشی چھجا تھا۔ جو دور تک چلا گیا تھا۔ یقیناً عمارت کے آ
سرے تک ہوگا۔ میں نے ایک فٹ چوڑے اس چھجے کو فرار کے لئے استعمال کرنے کی ٹھ
نیچے دیکھا۔ یا اللہ مدد! میں نے دل ہی دل میں کہا اور کھڑکی کی چوکھٹ پر ایک ٹانگ رکھ
ایک گز نیچے پاؤں سے چھجے کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ کھڑکی کے فریم کو مضبوطی سے پکڑ
ہوئے میں نے آہستہ سے اپنا سر کھڑکی سے باہر کی طرف سرکایا۔ کمرے کی گرم فضا کی بج
اب میرا چہرہ باہر کی سردی میں تھا۔ نہایت ہی احتیاط سے میں نے اپنا دوسرا پاؤں بھی باہر ن
جسم میں تناؤ سا آ گیا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ جسم کو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔ پورا جسم ک
سے باہر آ چکا تھا۔ پیروں کے دباؤ سے کچھ کنکر نیچے کی جانب گرے۔ میں نے چونک کر
دیکھا۔ میں بزدل نہیں ہوں، لیکن پانچویں منزل سے نیچے دیکھتے ہی میرا دل اچھل کر حلق
آ گیا۔ میں نے دیوار کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور توازن صحیح رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پوس
مہینے کی ٹھنڈک ہڈیوں کے گودے میں اتر گئی دیوار کا پلستر ہاتھ لگتے ہی جھڑا اور میرا توازن
گیا لیکن میری انگلیاں دیوار کے آرائشی ابھاروں پر جم گئیں۔

اس ڈگمگاہٹ نے میرے دل کی دھڑکن بڑھا دی۔ میرا جسم کانپنے نہیں بلکہ لرز
لگا اور اس لرزش کو ختم کرنا میرے اختیار میں نہیں تھا۔ میری آنکھیں سختی سے بھنچی ہوئی تھیں



انتوں پر دانت سختی سے جمے ہوئے تھے۔ میری مشاقی ہوا ہو گئی تھی۔ دوسرے فلیٹ کی کھڑکی
رف ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی لیکن مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ میلوں دور ہو۔ میں
نے دل ہی دل میں وحدہ لاشریک کو مدد کے لئے پکارا اور پھر آگے کی جانب سرکنے لگا۔ ایک
نچ دو انچ۔ فاصلہ کم ہونے لگا۔ دوسری کھڑکی نزدیک آتی چلی گئی اور پھر وہ بند کھڑکی مژدہ
جت بن کر سامنے آ گئی۔ میں نے داہنے ہاتھ سے شیشم کی لکڑی سے بنے کھڑکی کے پلڑے کو
پکڑا اور زور لگانے کی کوشش کی لیکن فوراً دماغ نے سرزنش کی ''کیا کرتا ہے۔ جھٹکا لگا اور تو
نیچے۔'' میں نے گھبرا کر پلڑے کو چھوڑ دیا۔ کچھ پل ساکت کھڑا رہا پھر حواس مجتمع کر کے داہنے
تھ سے آرائشی ابھار کو مضبوطی سے پکڑا اور محسوس ہوئی۔ میں نے گردن موڑ کر روشن کمرے پر
لوداعی نگاہ ڈالی اور پھر کھڑکی سے آگے کی جانب کھسکنا شروع کر دیا۔ جب میں نے پہلا قدم
ٹھایا اور جسم کو آگے بڑھایا تو مجھے خوف سا محسوس ہوا لیکن میں نے اس کے بارے میں سوچنا ہی
ھوڑ دیا اور پھر اپنے سینے اور جسم کو دیوار کے ساتھ سختی سے دباتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ
وشن اور چمکدار کمرا ایک دم میری نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ باہر کافی اندھیرا تھا۔
برے اندازے سے بہت زیادہ اندھیرا۔ قدم چھجے سے اٹھے بغیر کھسکتے چلے جا رہے تھے اور
یری انگلیاں دیوار سے چمٹی ہوئی دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھیں۔ چھجا اتنا چوڑا نہیں تھا
تنا نظر آتا تھا لیکن ذرا دیوار کی طرف جھکے ہوئے اور اس سے پوری طرح چمٹے ہوئے اپنا
ازن برقرار رکھنا میرے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں شرٹ کے بٹنوں کی دیوار پر رگڑ سن
ہا تھا جو میرے جسم میں کپکپی پیدا کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نیچے دیکھوں لیکن اندرونی
ذبہ بار بار اکسا رہا تھا کہ کم از کم ایک بار نیچے دیکھ لوں لیکن پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے
ھٹک دیا اور مشینی انداز میں آگے بڑھتا رہا۔

آہستہ آہستہ کھڑکی سے فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یکایک بائیں ہاتھ کا گھونسا بند
ڑے پر دے مارا۔ سناٹے میں دھمک کی آواز دور تک گونجتی چلی گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے بم کا
ما کہ ہوا ہو لیکن نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔ پلڑا قبضے سے اکھڑ کر اندر دھنس گیا تھا۔ میں نے ٹوٹے
ئے قبضے میں پھنسے پلڑے کو باہر کھینچا اور پھر اسے کمرے میں گرا دیا۔ پلڑے کے بعد سلاخوں
نے راستہ روک لیا۔ میں نے ہاتھ کو تبدیل کیا یعنی بائیں ہاتھ سے ابھار کو تھاما اور داہنے ہاتھ
سے سلاخ کو اندر دھکیلنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش نے ایک سلاخ کو اندر جھکا دیا۔ ایک کے بعد
رف۔ میں نے تین سلاخوں کو موڑ کر اتنا راستہ بنا لیا کہ آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ میں نے

اس کامیابی پر جنگلی حکیم کو دل ہی دل میں ڈھیروں دعائیں دیں جس نے سوم رس جیسی لاثا
پلا کر میرے جسم میں توانائی کا خزانہ جمع کر دیا تھا۔ میں اپنی کامیابی پر سرشار اندر کود گیا۔
کودنے کے بعد پیروں پر کھڑا ہونا نصیب نہ ہوا۔ کئی لوگوں نے اپنے جسموں کے جال
مجھے پھانس لیا۔ سب مل کر میرے جسم سے ایسے چمٹ گئے تھے جیسے مصری کے ڈلے
چیونٹیاں چمٹ جاتی ہیں۔ وہ سب مجھے گرائے رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر تو میں
جیسے اس کھیل کا لطف لیتا رہا۔ پھر میں نے اپنے جسم کو ایسے جھٹکا جیسے گائے کے جسم پر کوا
وہ اسے پھریری لے کر جھٹک دیتی ہے۔ کوے کی طرح وہ بھی میرے جسم پر سے دور جا گر
پھر تو میرے ہاتھ اور پاؤں مشین بن گئے۔ میں پوری طرح فٹ بال کا کھلاڑی بن چکا تھا
سب فٹ بال۔ کچھ ہی دیر میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ سب اپنی ٹوٹ پھوٹ پر سسک رہے تھے
میں اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر ان کا جائزہ لے رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک نوعمر لڑکی کمرے
داخل ہوئی وہ جس تیزی سے اندر آئی تھی اسی تیزی سے جانے کے لئے پلٹی مگر میں
چھلانگ لگائی اور باہر نکلنے سے پہلے ہی اسے دبوچ لیا۔ وہ میرے نیچے دبی کسمسا رہی تھی
اس کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔

''خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہیں آزاد کر رہا ہوں۔'' کہتے ہو
میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اسی طرح پڑی ٹکر ٹکر مجھے دیکھتی رہی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ساوتری۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم یہاں کی بنگالی تو نہیں لگتی ہو؟''

''نہیں میں انڈین ہوں۔''

''انڈین؟'' میں اچھل پڑا

''میرا تعلق وہاں کی ''امار بنگالی۔'' تنظیم سے ہے جو مغربی اور مشرقی بنگال کو ملا
ایک نیا ملک بنانا چاہتی ہے۔''

''اس تنظیم پر تو وہاں کی حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے۔''

''ہاں، لیکن صوبائی اور مرکزی حکومت کے کئی عہدیدار اس کی مدد کر رہے ہیں
دراصل ان کا اصل ہدف مشرقی پاکستان ہے۔''



''تمھارے ذمے کیا کام ہے؟''

''رابطے کا۔''

''اتنا اہم شعبہ تمہارے پاس ہے اور تم اتنی کمزور؟''

''میں کمزور نہیں ہوں۔ اندر سے فولاد ہوں۔ مجھے خصوصی تربیت دی گئی ہے
لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے بےصبری سے پوچھا۔

''لیکن وہ مجھے فولاد بنا نہیں پائے۔ میرے اندر کا حساس دل ابھی زندہ ہے اپنی
نیت کو ابھی تک پھانسی دے نہیں پائی ہوں۔ اس لئے میں نے سب کچھ بتا دیا۔''

''پھر تم ان کا ساتھ کیوں نہیں چھوڑ دیتی ہو؟''

''مجبوری، پیٹ کی آگ نے مجبور کر دیا ہے۔ تم ایک خوشحال ملک میں رہ رہے ہو۔
س لئے ہماری مجبوری کو سمجھ نہیں سکو گے۔ ہمارے پتا جی کا دیہانت ہو گیا ہے۔''

''اوہ! تمہارے ابا مر گئے ہیں۔''

''ہاں، اور میرے پانچ بھائی بہن ہیں۔ ان کی خاطر میں ان لوگوں کا ساتھ دے
رہی ہوں۔''

''کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کر لیتی ہو۔''

''شاید تم اخبارات نہیں پڑھتے۔ مغربی بنگال میں صرف اور صرف غربت ہے۔
وگ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔ باپ اپنی بیٹیوں کا سودا ایک سیر چاول پر کر رہے
ہیں۔ میرے گاؤں میں میرا گھر سب سے خوشحال ہے۔ تینوں وقت انہیں کھانا مل رہا ہے۔
ورنہ دوسرے گھروں میں آدھا سیر چاول پکتا ہے اور اس سے دس آدمی پیٹ بھرتے ہیں۔
آدھے آدمی آدھا پیٹ کھاتے ہیں اور آدھے آدمی چاول کا ماڑ (چاول کی پیچ) پی کر پیٹ
بھرتے ہیں۔'' اس نے درد میں ڈوبے لہجے میں کہا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ یہ سب اخباری باتیں ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔''

''خدا نہ کرے میں کفرستان میں قدم رکھوں۔''

''کیوں، اپنے ساتھیوں کو چھڑانا نہیں چاہتے۔''

''میرے ساتھی کہاں ہیں؟''

''انہیں ہیڈ کوارٹر میں رکھا گیا ہے۔''

''تمہارا ہیڈ کوارٹر ہے کہاں؟''

''آپریشن راج شاہی کے لئے ہیڈ کوارٹر مرشد آباد میں بنایا گیا ہے۔''

''کیا تم مجھے وہاں تک پہنچاؤ گی؟''

''ہاں!''

''کہیں تم مجھے اپنے پھندے میں پھنسا تو نہیں رہی ہو؟''

''اگر یقین نہیں ہے تو میں تانبا تلسی لے کر سوگند کھا سکتی ہوں۔ بلا خوف میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کی مدد کروں گی۔''

''کیوں؟ آخر تمہیں اپنی تنظیم سے غداری کر کے کیا ملے گا؟''

''میرے پاس ہی نہیں، ہمارے ہیڈ کوارٹر میں بھی تمہارے پورے کوائف م[وجود] ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ تم ایک نہ ایک دن ہمارے راج شاہی ہیڈ کوارٹر میں ضرور آؤ گے او[ر] تم سے سودا کروں گی۔''

''کیسا سودا؟''

''تم مجھے پاکستانی کرنسی میں ایک لاکھ روپے دو گے۔''

''یعنی انڈین کرنسی میں سوا لاکھ۔''

''ہاں بولو سودا منظور ہے۔ ویسے سوچ لو۔ اگر تم نے میرا مطالبہ پورا کر دیا تو تمہیں یہاں کے تمام ایجنٹوں کا نام پتا بھی بتا دوں گی۔ تمہارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔

''لیکن اس وقت تو میرے پاس اتنے روپے ہیں نہیں۔''

''تم مجھے اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دے دو کہ میں نے بونو گرام ڈھاکہ کے دونوں م[کان] اور دکان میرے ہاتھ فروخت کر دیے ہیں۔ جب روپے دو گے تو میں کاغذ لوٹا دوں گی۔''

''میں راضی ہوں۔ جاؤ عدالتی اسٹامپ پیپر لے آؤ۔''

''تم یہیں ٹھہرو میں آدھے گھنٹے میں وکیل اور اسٹامپ پیپر لے آتی ہوں۔''

اس کے جاتے ہی میں نے اپنا ادھورا کام پورا کرنا شروع کر دیا۔ لکڑی میں دیمک لگنے لگتی ہے تو دوا چھڑک کر دیمک کو ختم کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ زخموں سے کرا[ہتے] ہوئے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والی دیمکوں کو ختم کرنا بھی ضروری تھا اس لئے میرے با[ری] کے بعد دیگرے سب کا گلا دبانے لگے۔ ان کی تڑپ دیکھ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ میر[ے]



بتے ہوئے جذبوں کو تسکین مل رہی تھی۔ ان سب کو موت کی نیند سلانے کے بعد میں نے کئی گلاس ٹھنڈا پانی پیا تا کہ میرے اندر بھڑکتے ہوئے شعلے سرد اور اعصاب مکمل طور پر قابو میں آجائیں۔ پانی پینے کے بعد میں نے دیوار سے ٹیک لگا کے پیر سیدھے کر لئے اس طرح جسم کو آرام مل رہا تھا۔ زمین پر بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ غداری نہ کر رہی ہو۔ فرار حاصل کرنے کے لئے اس نے میرا اعتماد حاصل کیا ہو۔ کہیں وہ بڑی کمک لے کر نہ پہنچ جائے۔ اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔ نیا شہر تھا۔ پہلی بار یہاں آیا تھا میرے سامنے لاشیں پڑی تھیں ایسے وقت میں اگر پولیس آجائے تو؟ میں بری طرح پریشان ہو اٹھا۔ اس پریشانی میں کوئی راستہ بھی سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں کافی سوچ بچار کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لاش کو کندھے پر اٹھایا اور باتھ روم میں جا کر پٹخ دیا۔ پھر دوسری لاشوں کو بھی باتھ روم میں ڈھیر کرنے کے بعد میں نے باتھ روم کے دروازے کی کنڈی باہر سے لگا دی اور باہر والے کمرے میں آگیا۔ وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے جا کر دروازہ کھول دیا۔

''کنڈی کیوں لگا دی تھی؟'' ساوتری نے پوچھا۔

''بس یوں ہی۔'' میں نے جواب دیا۔

''وکیل صاحب کو لے آئی ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ مڑی اور بولی۔ ''وکیل صاحب آجایئے۔''

ایک نوجوان سا وکیل اندر آگیا جو اگر کالا کوٹ پہنے ہوئے نہ ہوتا تو کسی طور پر اسے وکیل نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی بھی تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ گواہ ہیں۔ وکیل نے ٹائپ کیا ہوا کاغذ بیگ سے نکال کر مجھے تھمایا۔ سرسری نظر سے پڑھ کر میں نے دستخط کر دیئے۔ وکیل کی فیس بھی میں نے ادا کی۔ اپنا کام ختم کر کے وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ساوتری نے کہا۔ ''زخمیوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا؟''

''وہ سب مر چکے ہیں۔'' میں نے کہا

ساوتری کے چہرے پر عجیب سی تاریکی چھا گئی۔

''کیوں، تمہیں دکھ ہوا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''اتنے دنوں تک ساتھ کام کیا۔ ان کے مرنے پر دل روئے گا ہی۔''

''خیر، آگے بولو کیا کرنا ہے؟''

''کرنا کیا ہے۔ انڈیا چلنے کی تیاری کرو۔''

''کس راستے سے بارڈر کراس کرو گی؟''

''یہاں سے ریل کے ذریعے بھیڑامارا جائیں گے اور پھر وہاں سے بس کے ذر
لوگ مارا اور پھر وہاں سے پیدل بارڈر تک۔ دوسری جانب سکدار پاڑا ہے۔ وہاں سے
کے ذریعے مرشد آباد۔''

''لیکن ایک بات میری بھی سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے ساتھیوں کو ہیڈ کوارٹر بھیج دیا گیا لیکن مجھے کیوں نہیں بھیجا؟''

''تمہیں ختم کردینے کا حکم ہے۔''

''اوہ یہ بات ہے۔'' کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا پھر بولا۔ ''تو چلو۔''

وہ کھڑی ہو گئی۔

ٹرین، بس اور پیدل، ہمارا سفر بخیر وخوبی طے ہو گیا۔ بارڈر پر اس کے آدمی موج
تھے جنہوں نے ہمیں ایسٹ پاکستان رائفلز کی نگاہوں سے بچا کر بارڈر کراس کرادیا
ہندوستان کی سرزمین پر پہنچ کر میرے حوصلے پست ہونے لگے۔ اپنی زمین پھر اپنی ہوتی ہے
وہ دشمن ملک کی سرزمین تھی۔ وہاں کسی دوست کا ملنا خواب تھا۔ پھر بھی میں نے اسے ہمت
ہارنے کا احساس نہ ہونے دیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کریم گنج پہنچی۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ
تھا۔ اس قصبے کے چھوٹے سے بازار کو پار کرتے ہوئے ہم لوگ کاک پورہ گاؤں پہنچے۔ اس
گاؤں میں ساوتری کا گھر تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے بتا دیا کہ اس کی ما
مسلمانوں سے سخت نفرت کرتی ہے، اس لئے مجھے اپنا نام ونود بتانا ہوگا۔

اس انجان قصبے میں سب پرائے تھے کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ہامی
بھرلی۔ ساوتری کی ماں کے سامنے اپنے آپ کو ہندو کہہ کر پیش کیا اور ہندوانہ طریقے سے پیر
چھو کر پرنام کیا۔

اس گھر میں کل سات افراد تھے۔ ساوتری کی ماں دو چھوٹے بھائی تین بہن اور ایک
وہ خود۔ ان میں اس کا چھوٹا بھائی مجھے بہت پیارا لگا۔ اس کا نام مہادیو تھا۔ بڑا باتونی تھا۔
ساوتری نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کچھ دیر آرام کرلیں تب تک میں ہیڈ کوارٹر کا ایک چکر لگا آتی
ہوں۔ شاید آپ کے دوستوں کا کچھ پتا چل جائے۔''

لیکن میں سو نہیں پایا تھا۔ سوتا تب جب مجھے مہادیو چھٹی دیتا۔ وہ تو جونک کی طرح



گیا تھا۔ سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔ جب کہ میں تھکا ہوا تھا اور سونا چاہتا تھا۔ مجھے کوفت
ہی تھی اچانک میں چونک گیا۔

ہر آدمی کے اندر ایک گھنٹی ہوتی ہے، مخفی گھنٹی، جو اسے خطروں سے آگاہ کرتی ہے
عرف عام میں چھٹی حس کہتے ہیں۔ وہ گھنٹی میرے اندر تواتر سے بجنے لگی۔ میرے اندر سویا
ا درندہ جاگ اٹھا اور مجھے کھڑکی تک کھینچ کر لے گیا۔ میں نے پردے کی اوٹ سے باہر کی
ف جھانکا تو میرے منہ سے غراہٹ نکل گئی۔ غدار بنت غدار سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ
گئی تھی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ ساوتری مجھے اپنے ساتھ لا کر دلدل میں دھکیل دے گی لیکن اس
اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں تھا صدیوں سے اس قوم کی تاریخ یہی رہی ہے رام کو لنکا کا
ستا دکھا کر راون کو بھی بھبھیشن نے مروایا۔ میر جعفر کو انگریزوں تک مرن چاند لے گیا، سراج
ولہ کی شکست کا پہلا باب کھولنے کے لئے رانی جھانسی کو اس کے وزیر نے شکست سے دوچار
رایا۔ ٹیپو سلطان کے پیٹ میں نانا اہلکر نے خنجر گھونپا۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان کے دام
ں بار بار آجاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں ہماری سادہ لوحی بھی ان کے دام میں گرفتار کروا دیتی ہے
یسا کہ تحریک پاکستان کے وقت مولانا ابوالکلام، گاندھی جی جیسے شاطروں کے دام میں آگئے
ے۔ اس طرح میں بھی ساوتری کے دام میں آ گیا تھا۔ بھاگنے کا راستہ بند ہو چکا تھا پولیس نے
روں جانب سے مکان کو گھیر لیا تھا۔ میں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا کہ دھڑاک سے دروازہ
لا۔

پستول ہاتھ میں اٹھائے ایک افسر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ساوتری بھی تھی اور
وتی کرتے میں ملبوس ایک شخص بھی۔ ساوتری نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا
آفیسر، یہی وہ خطرناک جاسوس ہے۔ پاکستان کی حکومت نے کسی خاص مشن پر اسے بھیجا
ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں قہقہہ لگایا۔ ''واہ اب میں پاکستانی جاسوس بھی بن گیا۔'' مگر
ا نہیں۔

''کیوں بے، تُو کس مقصد سے ہمارے ملک میں آیا ہے؟'' دھوتی والے نے سوال
یا۔

''نیتاجی، آپ کچھ نہ بولیں۔ تھانے میں لے جا کر ہم خود پوچھ لیں گے۔''
لیس آفیسر نے کہا۔

''گھوش جی، اسے اچھی طرح باندھ کر لے جائیں۔ بہت بڑا شاطر ہے یہ
ساوتری نے کہا۔

''ہم سے بڑا شاطر اس دھرتی پر کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔'' کہتے ہوئے پولیس
آفیسر نے سپاہیوں کی جانب مڑ کر حکم دیا۔ ''ہتھکڑی پہنا دو۔''

چاروں طرف سے بندوقوں کی نالیں اٹھی ہوئی تھیں۔ میری ساری چوکڑی ہوا ہو گ
تھی۔ میں ایک لفظ بھی بولتا تو بندوقیں گرج اٹھتیں۔ لاچار ہو کر میں نے اپنے دونوں ہاتھ بڑ
دیے۔ ہتھکڑی پہنانے کے عزم سے گھربار کو داؤ پر لگانے والے کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہ
دی گئی۔

پاگل کتے کو جس طرح رسی ڈال کر کھینچا جاتا ہے اسی طرح مجھے وہ لوگ کھینچ کر
چلے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور کمر میں رسا۔ ایک سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر کو اپ
بیلٹ سے منسلک کر لیا تھا اور دوسرے نے میری کمر کے رسے کو پکڑ رکھا تھا کیوں کہ ان کی
نگاہوں میں میَں بھی پاگل کتا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ میں بپھرا ہوا سانڈ ہوں، بارود کا ڈھیر
ہوں۔ مجھے نہ کوئی قید رکھ سکتا ہے اور نہ مجھے سلگ اٹھنے سے روک سکتا ہے۔

وہ سب مجھے ٹرک پر لاد کر کریم گنج تھانے میں لائے۔ تھانے میں پہنچتے ہی مجھے ایک
درخت سے باندھ دیا گیا۔ اپنی زندگی میں میَں نے ایسا پہلا تھانہ دیکھا تھا جہاں حوالات نہیں
تھی۔ مجرموں کو درخت سے باندھ کر دھوپ اور شبنم میں رکھا جاتا تھا۔

ایک مجرم کے لئے اس سے بڑی سزا کیا ہوگی کہ وہ نہ بیٹھ سکے اور نہ سو سکے۔ مجھے
بھی اسی سزا سے گزارنے کے لئے ان لوگوں نے باندھ کر کھڑا کر دیا تھا۔ میرے دونوں پیروں
میں بھی رسی بندھی ہوئی تھی اور ہاتھوں میں بھی۔ کمر بھی جکڑی ہوئی تھی۔ میری طرح کچھ اور
مجرم بھی دوسرے پیڑوں سے بندھے ہوئے تھے۔

اذیت بھرے لمحے طویل تر ہوتے جا رہے تھے۔ کسی انسان کے لئے یہ سب سے
بڑی سزا ہے کہ اسے رفع حاجت کے لئے بھی نہ کھولا جائے۔ میرے سامنے والے پیڑ سے
بندھا قیدی مجبور ہو کر اپنے کپڑوں کو تر بتر کر بیٹھا تھا۔ کراہت اور انسانی مجبوری کے اس منظر
نے مجھے منہ پھیر لینے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اپنا چہرا دوسری جانب کر لیا لیکن ادھر بھی وہی منظر
تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ افسر جلد سے جلد آ جائے تاکہ سوالات کے وقفے میں
مجھے ہاتھ پیر سیدھے کرنے کا موقع مل سکے لیکن اس افسر کو نہ آنا تھا اور نہ آیا البتہ آہستہ آہستہ



ات آ گئی اور اپنے جلو میں اندھیروں کی برات بھی لے آئی۔

اندھیرا ہر برائی کو ڈھانپ لیتا ہے لیکن مجرموں کی تشہیر کو ڈھانپنے سے قاصر تھا۔
ھانے کی عمارت پر نصب سرچ لائٹس ہر پیڑ کو اپنی روشنی کے گھیرے میں لئے ہوئے تھیں اور
یڑوں سے بندھے قیدیوں کی تشہیر کر رہی تھیں۔ سڑک پر آنے و جانے والے لوگ قیدیوں پر
قارت بھری نگاہیں ڈالتے ہوئے گزر رہے تھے۔ انسان مار کی چوٹ بھلا دیتا ہے لیکن حقارت
ھری نظر کو نہیں بھلا پاتا۔ میرے بھی تن بدن میں آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کو
ینٹھنے کی کوشش کی لیکن کافی زور لگانے پر بھی بندش ڈھیلی نہ پڑی۔ پانچ گھنٹے سے ایک ہی انداز
یں کھڑے رہنے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے۔ ہاتھوں کی رگوں میں بھی خون رکنے لگا
ھا۔ شاید اسی لئے میں پوری قوت نہیں لگا پایا تھا۔ میں نے مجبور ہو کر صبر کر لیا۔ دل ہی دل میں
ساوتری کی سات پشتوں کو صلواتیں سنا رہا تھا کہ میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ چاروں ہاتھ
اؤں سے چلتا ہوا ایک بچہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دانتوں میں چاقو دبا رکھا تھا۔ اسی
چاقو نے مجھے متوجہ کر لیا۔ اسے دیکھ کر دور بیٹھے سپاہی نے ہش ہش کی آواز نکالی شاید اس نے
بچے کو کتا سمجھ لیا تھا۔ میں نے جواب میں نیچی آواز میں سپاہی کو گالی دی اور بچے کی طرف دیکھنے
لگا۔ وہ بچہ میرے بہت قریب آ چکا تھا۔ اسے میں نے پہچان لیا۔ وہ بچہ ساوتری کا چھوٹا بھائی
مہادیو تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''دادا، میں چاقو لے آیا ہوں۔ رسی کاٹ کر فرار ہو
جایئے۔''

میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ میں نے سوچا، کیا میں اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں کہ بچے مجھے
دادا کہیں؟ پھر یاد آ گیا کہ بنگالی ہندو بڑے بھائی کو دادا کہتے ہیں اور دادا کو دادو۔

میں نے ذہن سے ان باتوں کو جھٹک کر کہا۔ ''میرے ہاتھ بھی بندھے ہیں۔ کسی
طرح ان بندھنوں کو کاٹ دو۔''

میرے برابر والے پیڑ سے بندھے قیدی نے کہا۔ ''دادا مجھے بھی آزاد کرا دو۔''

میں نے جواب دیا۔ ''مجھے آزاد ہو جانے دو۔ سب کو آزاد کر دوں گا۔''

مہادیو نے پیڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر میرے ہاتھوں کی رسی کو کاٹنا شروع کر دیا۔
کچھ ہی دیر میں رسی کٹ گئی لیکن میں نے جنبش نہیں کی۔ مہادیو نے کمر اور پیروں کے بندھن کو
بھی کاٹ دیا۔ میں نے دوران خون صحیح کرنے کے لئے ہاتھوں کو نیچے جھکا کر مٹھیاں کھولنا بند
کرنا شروع کر دیں۔ میری یہ حرکت تھانے کے برآمدے میں بیٹھے سپاہی کی نظروں سے چھپی

نہ رہ سکی۔

''اے اے کیا کرتا ہے۔'' کہتا ہوا وہ میری جانب لپکا۔

شیر پنجرے سے آزاد ہو جائے تو اسے سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ سوکھا سڑا سپاہی مجھے کیسے روکتا؟ اتنی دیر تک بندھے رہنے کا غصہ میں نے اسی پر اتارا اور تڑاتڑ دو طمانچے رسید کر دیئے۔ بہ خدا یقین کریں۔ غصے نے میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھر دی کہ ان طمانچوں سے اس کا چوکھٹا بگڑ گیا۔ وہ کراہتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ تھانے کے اندر بھی ہلچل مچ گئی۔ وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مہادیو دوسرے قیدی کی رسی کاٹ رہا تھا میں اس کے پاس پہنچا اور رسی کو پکڑ کر جھٹکا دیا تو رسی ٹوٹ گئی۔

اسے آزاد کرا کر میں نے مہادیو کو بازوؤں میں بھرا اور باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ میرے پیچھے پیچھے وہ قیدی بھی آ رہا تھا۔ ہم دونوں کو بھاگتے دیکھ کر دوسرے قیدی شور مچانے لگے۔ ان کے شور نے راہگیروں کو بھی متوجہ کر لیا۔ پولیس والے بھی اندر سے نکل آئے۔ مہادیو کو اٹھائے ہوئے میں ہرن کی طرح دوڑ رہا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے وہ قیدی بھی اپنی پوری قوت سے دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دوڑتے دوڑتے کہا۔ ''دادا سامنے والی گلی میں گھس جاؤ۔''

میں نے وہی کیا پھر پیچ در پیچ گلیوں کو پار کرتے ہوئے ہم لوگ ندی کنارے جا نکلے۔ میں نے مہادیو کو گود سے اتارتے ہوئے کہا۔ ''میرے ننھے محسن! تم اپنے گھر چلے جاؤ۔''

''آپ نہیں جائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں میں بیٹے! میں کل آؤں گا۔'' اسے جھوٹی تسلی دے کر میں اس قیدی کے ساتھ ندی کی جانب بڑھنے لگا۔ میری نگاہیں اس کشتی پر ٹکی تھیں جو کنارے پر بندھی ڈول رہی تھی۔

''تم ناؤ چلا لیتے ہو؟'' میں نے کشتی کی رسی کھولتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں دادا۔'' اس نے لمبے بانس کو ہاتھوں میں تولتے ہوئے کہا ''اس لکھی سے میں ندی پار کر لوں گا۔'' میرے بیٹھتے ہی اس نے کشتی کھینا شروع کر دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مہادیو واپس جا رہا تھا۔

''تمھارا نام کیا ہے؟'' میں نے قیدی سے پوچھا۔

''انیل اور آپ کا نام۔''



''ونود۔'' میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''ونود دادا'' ۔اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ کا جرم کیا تھا؟''

''میرا جرم ہی یہ ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔''

میں نے دور افق پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ تاروں کی ٹمٹماتی روشنی اندھیرے کو بھگا نہیں پا رہی تھی۔ اندھیرے کے دامن میں سیندھ لگاتے ہوئے ہم دونوں بڑھتے جا رہے تھے۔

''لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے گھر۔ اس دنیا میں میری صرف ایک بہن ہے۔ مجھے تلاش کرتے ہوئے پولیس کے کتے میرے گھر ضرور جائیں گے اور مجھے نہ پا کر میری گڑیا بہن پر ظلم کریں گے۔''

''تم پر کیا الزام تھا؟''

''بلوہ کرنے کا۔ میں نے اپنے گاؤں کے مہاجن کی پٹائی کر دی تھی۔''

''بنیے سے تمھاری کیا دشمنی تھی؟''

''وہ ناپ تول میں گھپلا کرتا تھا۔'' اس نے لکھی کو کشتی پر رکھ دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہم ندی پار کر چکے ہیں۔ دوسرے کنارے پر اتر کر میں اس کے ساتھ چل پڑا ہم تقریباً آدھا گھنٹا چلتے رہے، پھر سامنے اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''وہ ٹین کی چادروں والا میرا گھر ہے۔ تم اکیلے وہاں جاؤ میری بہن سے کہنا، تمھارا بھائی سینول کے پیڑ تلے بیٹھا تمہیں بلا رہا ہے۔''

''تم کیوں نہیں جاتے؟''

''اگر کسی نے دیکھ لیا تو سب گھیر لیں گے۔ یہاں کے لوگ مہاجن کے مقروض ہیں۔ وہ اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔''

''لیکن میں اسے پہچانوں گا کیسے؟''

''گھر میں وہ اکیلی ہو گی۔ گوری سی لمبے قد کی ہے۔ اس کا نام پتول ہے۔''

میں نے اس گھر کی جانب قدم بڑھا دیئے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اتنی رات میں دستک دینے کا مطلب تھا کہ آس پاس والے بھی ہوشیار ہو جائیں۔ اس لئے میں نے دروازے سے داخل ہونے کا خیال مسترد کر دیا اور پیچھے کی جانب پہنچ کر اندر گھسنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ پچھلے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی چونک اٹھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے حیرت

نے گھیر لیا لیکن میں رکا نہیں اور اندر داخل ہو گیا۔ پہلے کمرا پار کرتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا اور رگوں میں لاوا ابھر گیا۔

''اوئے حرام کے پلے! دور ہٹ۔'' میں نے اس بڈھے کو للکارا جو ایک معصوم لڑکی کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا اور وہ لڑکی سہمی ہوئی کبوتری کی طرح دیوار سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ مجھے امداد غیبی کی طرح دیکھ کر وہ میرے جانب دوڑی۔

''دادا! مجھے بچالو۔ یہ بھیا کا بدلہ مجھ سے لینے آیا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''فکر نہ کریں آ گیا ہوں۔''

''پھر میں نے اس بڈھے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تو مہاجن ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تجھے شرم نہیں آتی اپنی بیٹی کی ہم عمر لڑکی پر بری نظر ڈالتا ہے؟'' میں نے الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔

میرا ہاتھ کچھ تگڑا پڑ گیا۔ اس کا جبڑا اپنی جگہ سے کھسک گیا۔ وہ جبڑے کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کارٹون بنے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں نے لڑکی سے پوچھا ''تمھارا نام پتول ہے؟''

''جی!'' اس نے ساڑھی کے آنچل کو درست کرتے ہوئے کہا۔

پتول بنگلہ میں گڑیا کو کہتے ہیں اور وہ واقعی پتول جیسی تھی۔ میں نے بھرپور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کے گورے بدن پر پھولدار ساڑھی تھی۔ جس پر چھوٹے چھوٹے پھول تھے جو فاصلوں کے ساتھ جسامت بڑھاتے گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ساڑھی پر بہار کھلا ہو۔ ساڑھی باغ تھی تو وہ بہار۔ اس شاداب جسم اور شمشاد قد لڑکی کا سراپا قیامت تھا۔ میری آنکھیں باغی ہونے لگی تھیں کہ اس نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

''میں انیل کا دوست ہوں۔ وہ سینول کے پیڑ تلے بیٹھا تمھارا انتظار کر رہا ہے۔''

''بھیا آ گئے؟'' اس نے خوشی سے چیختے ہوئے کہا۔

''ہاں آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارا کیا۔

مہاجن ہائے واؤ کر کے رونے لگا۔

''سن اوئے مہاجن کی اولاد! اگر تو نے کسی کے سامنے میرے بارے میں کچھ کہا تو یاد رکھ سات پردوں میں بھی تو بچ نہیں پائے گا۔ گلا دبا کر ہمیشہ کے لئے تیرا منہ بند کر دوں گا۔



یہ کہتے ہوئے میں پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔

سینول کے پیڑ کی جانب بڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ انسان بھی کتنا بے وقوف ہے۔ جذبات میں اندھا ہو کر غلط قدم اٹھاتے وقت ذرا سا بھی نہیں سوچتا کہ میرے بعد گھر والوں کا کیا ہوگا؟ ذرا سا غصہ آیا اور سامنے والے پر غصہ اتار دیا۔ ذرا سی جذباتیت کتنی بڑی پریشانی کو جنم دیتی ہے، یہ سامنے تھا۔ اگر انیل گھر پر رہتا، مہاجن سے دشمن مول نہ لیتا تو کیا مہاجن کی ہمت ہوتی کہ وہ پتول پر بری نگاہ ڈالتا۔ میں اپنے خیال میں ڈوبا ہوا بڑھتا جا رہا تھا کہ میری یکسوئی چور چور ہو گئی۔ پتول بھیا کہہ کر انیل سے لپٹ گئی تھی۔

''رومت بہن! چل ہم یہاں سے دور، بہت دور چلتے ہیں۔ اپنے گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے۔'' انیل نے کہا۔

''لیکن بھیا! سارا سامان تو گھر میں پڑا ہے۔ اسے چھوڑ کر کیسے جائیں گے؟'' پتول نے جواب دیا۔

''بازو میں قوت ہونا چاہیے۔ ایسے پچاس گھر بن جائیں گے۔''

''لیکن ہم جائیں گے کہاں؟''

''مرشد آباد۔''

''وہ تو اپنے کریم گنج سے بھی چھوٹا قصبہ ہے۔''

نواب سراج الدولہ کے مرشد آباد کو ختم کرنے کے لئے انگریزوں نے بہرام پور بسایا تھا اسے بھی مرشد آباد کہتے ہیں۔ وہ کوئی خاص دور تھا نہیں۔ مرشد آباد سے صرف چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

''وقت برباد کرنے سے اچھا ہے چل دیں۔'' انیل نے کہا۔

ہم تینوں ہائی وے پر آئے۔ یہ وہی مشہور سڑک ہے جو انگریزوں نے کلکتہ سے پلاسی تک تعمیر کی تھی بعد میں اس کی مرشد آباد تک توسیع کی گئی لیکن 1947ء کے بعد اسے جی ٹی روڈ سے ملا دیا گیا۔ اس سڑک پر ساری رات گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ کلکتے سے سلی گوڑی جانے والی ایک بس کو رکوا کر ہم لوگ سوار ہو گئے۔ رات کے ڈھائی بجے بہرام پور بس اسٹینڈ پر اترے جہاں اور بھی مسافر بیٹھے تھے۔ ہم لوگ بھی ان کے درمیان بیٹھ گئے۔

وقت گزاری کے لئے میں نے پوچھا۔ ''یہاں تک تو پہنچ گئے اب ٹھہریں گے کہاں؟''

''صبح ہوتے ہی ہم لوگ امارا بنگالی کے دفتر چلیں گے۔ ان لوگوں کو بتائیں گے
ہم ایسٹ پاکستان سے بھاگ کر آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے ظلم سے تنگ آ کر ہر روز ایک
خاندان آتے رہتے ہیں۔ ان کی آبادکاری یہی لوگ کرتے ہیں۔'' انیل نے بتایا۔

''میں نے سنا ہے وہاں ہندوؤں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''تم نہیں سمجھو گے۔ وہ سب ویسٹ بنگال کے ہی غریب مزدور ہوتے ہیں
بات امارا بنگالی والے بھی جانتے ہیں لیکن اعداد و شمار بڑھانے اور چندہ وصولنے کے لئے
لوگ کچھ نہیں کہتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔''

امارا بنگالی میں اگر کسی نے مجھے پہچان لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ سوچ
میں نے انکار کرنا چاہا تھا کہ دماغ نے مشورہ دیا۔ ''خطرہ مول لیے بغیر منزل نہیں ملتی'' لہٰذا
نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح کی روشنی پھیلتے ہی ہم تینوں کھگڑا گھاٹ بازار کے قلب میں واقع امارا بنگالی
آفس میں پہنچے۔ اتفاق کہیے یا میری خوش قسمتی کہ وہاں کسی نے مجھے نہیں پہچانا اور ہم تینوں کا
لکھ کر ایک پرچی تھما دی گئی۔ ان کا ایک آدمی ہمیں ساتھ لے کر نوتن پاڑا پہنچا۔ گنگا ندی
کنارے سرکاری زمین پر چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

''آج کا دن کھلے آسمان کے نیچے گزار لو۔ کل تمہیں بانس اور چٹائیاں مل جا
گی۔'' ساتھ آنے والے نے زمین پر نشان لگاتے ہوئے کہا۔

''بابو جی! ہم اپنے پیسے سے بانس اور چٹائی لے آئیں؟''

''پیسے ہیں تو ضرور خرید لو۔'' وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔

میں نے پیسے نکالنے کے لئے دھوتی آہستہ آہستہ اوپر اٹھانا شروع کی پتول مہ
طرف دیکھتی رہی۔ میں جھٹکے سے زمین پر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا دادا؟'' پتول نے پوچھا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے شرم و حیا کے زیور سے آراستہ مسلمان لڑ
نہیں جس کے تقدس کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔ وہ تو ہندو تہذیب کی نمائندہ تھی جس
بھگوان شری کرشن ندی میں نہانے والی عورتوں کے کپڑے لے کر پیڑ پر چڑھ جاتے تھے
انھیں پیڑ کے نیچے آ کر کپڑے لے جانے کا حکم دیتے تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ایک انسانی عضو
کو ''مہادیو'' کہتے اور اس کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کے مذہب میں ''مہادیو'' سے کنواریوں



شادیاں بھی کی جاتی ہیں اور وہ اس پتھر کے ٹکڑے کو اپنا شوہر سمجھ کر زندگی گزار دیتی ہیں۔ ایسے
مذہب پر اعتقاد رکھنے والی لڑکی سے حیا کی توقع عبث تھی لیکن میں تو اسلامی ماحول کا پروردہ تھا۔
اسلام کے الہامی اصولوں پر چلنے والا تھا، اس لئے میں نے بیٹھے بیٹھے ہی ران پر بندھے نوٹوں
کا بنڈل کھول کر باہر نکال لیا۔

''لو تم بانس اور چٹائی لے آؤ۔'' میں نے سو سو کے دو نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

انیل نے ہاتھ بڑھا کر روپے لے لئے اور بازار جانے کے لئے مڑ گیا۔ اس کے
جاتے ہی پتول نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ونود تم میرے ساتھ رہو گے
ناں؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میرے جواب نے اس کے چہرے کو گلنار کر دیا۔ کسی کے دل میں تو جھانکا نہیں جا
سکتا۔ انسان کی آنکھیں جذبات کی عکاس ہوتی ہیں۔ اس کے دل میں بھی کھچڑی پک رہی
تھی۔ اس کا احساس دلانے کے لئے کندھے پر جما اس کا ہاتھ کافی تھا۔ مصافحے اور پنجہ لڑانے
میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کے لمس نے مجھے احساس دلایا تھا کہ اس کے جسم کی
کوری ہانڈی عمر کے الاؤ پر چڑھی ہے اور جذبات کی کھچڑی کھدبد، کھدبد کر رہی ہے۔ ڈاکٹروں
کا کہنا ہے کہ صحیح وقت پر مرض کا صحیح علاج کر لینا چاہیے ورنہ مرض بڑھ کر جسم کو چاٹ جاتا ہے۔
لڑکی کی بڑھتی عمر بھی ایک مرض ہوتی ہے اور اس کا بھی صحیح وقت پر علاج کرنا چاہیے مگر انیل نے
آنکھیں بند کر رکھی تھیں یا مجبوری نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا تھا اسی لئے پھنسی بھگندر
بن رہا تھا۔ میں نے پتول کو ٹال دیا اور آرام کرنے کے بہانے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔

''لو بھئی لے آیا۔'' انیل کی آواز پر میں چونک کر دیکھا وہ بانس اور بانس کی چٹائیاں
لے آیا تھا۔ دو مزدور بھی ساتھ تھے۔

''کام شروع کرا دو۔'' میں نے کہا۔ شام تک جھگی تیار ہو گئی۔ میں نے تین
چارپائیاں اور بستر بھی منگوا لیے۔ خانہ داری کے برتن اور راشن بھی ڈلوا دیا تھا چنانچہ شام کا کھانا
پتول نے خود بنا کر کھلایا۔

گرمی کچھ زیادہ تھی۔ میں نے اپنا بستر باہر ہی بچھوا لیا۔ تاروں بھرے آسمان تلے لیٹا
ہوا میں دشمنان وطن کو سبوتاژ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ پتول نے آ کر پوچھا۔ ''دادا' پیر دبا
دوں؟''

"نہیں۔" میرے انکار پر اس کا چہرا مرجھا گیا۔ میرے دل کو بھی ٹھیس لگی۔
چاری کتنی محبت سے میری خدمت کرنے آئی تھی اور میں نے جھڑک کر بھگا دیا کہ میں تو
بھاگتا ہوا مسافر تھا۔ اس کے لئے چھاؤں کہاں سے لاتا؟ میرے دل میں کسی اور کے لئے
بچی ہی نہیں تھی وطن کی محبت نے، ساری جگہ گھیر لی تھی۔ جذبہ حب وطن نے ہی مجھے اغیا
سرزمین پر دھکیلا تھا۔ یہیں اس زہریلے پیڑ کی جڑیں تھیں جن کو قطع کرنے آیا تھا۔ اپنے مش
بھلا کر میں راستہ کیسے بھٹک جاتا؟ اپنا مشن کیسے پورا کروں؟ کون سا راستہ اختیار کروں؟
سوچ رہا تھا سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند کو موقع مل گیا اور اس نے مجھے دبوچ لیا۔

صبح پتول کے جھنجوڑنے پر بیدار ہوا آنکھیں مسلتے ہوئے گھڑی دیکھی دن کے
رہے تھے۔

"اس گھڑی کو پھینکئے بھی۔" پتول نے کہا۔ "دیکھنے میں ہی سست بیگ کی بی
لگتی ہے۔"

"اولڈ از گولڈ" میں نے جواب دیا۔ "میری گھڑی تو پولیس والوں نے ہتھیا
تھی۔ یہ تو بھاگتے بھاگتے ایک سپاہی کی کلائی سے نوچ لی تھی پھر بھی ٹائم صحیح بتاتی ہے۔" یہ
ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔

بنگالی ہندوؤں کا قاعدہ ہے کہ صبح اٹھ کر پہلے نہاتے ہیں۔ میں نے بھی کچھالیا
ندی کی سمت قدم بڑھا دیئے۔ ایک ڈبکی لگائی اور پھر مچھے سے بدن پونچھ کر لوٹ آیا۔ پتو
نے ناشتا تیار کر لیا تھا۔ کھا پی کر میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور پھر انیل سے پوچھا۔ "آ
کیا پروگرام ہے؟"

"نوکری تلاش کرنے نکلوں گا۔" انیل نے جواب دیا۔

"دیکھو دوست ہم مفرور ملزم ہیں۔ ہمیں مضبوط سہارے کی ضرورت ہے اور میر
خیال میں امارا بنگالی ایک مضبوط تنظیم ہے۔ اگر وہ ہماری پیٹھ پر ہاتھ رکھ دے تو ہم پر ہاتھ ڈا
والے بھی گھبرا جائیں گے۔"

"لیکن وہ ہمیں سہارا کیوں دینے لگی؟"

"ہر تنظیم کو کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو پیش کریں گے۔ ان کے
اندر پہنچ کر ہم راستہ نکال ہی لیں گے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" انیل نے جواب دیا۔



اسی دن ہم دونوں امارا بنگالی کے دفتر میں پہنچے۔ ہمیں دیکھتے ہی کل والے شخص نے
پوچھا۔ "کوئی تکلیف؟"

"جی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم اس لئے آئے ہیں کہ اگر ہماری ضرورت ہو
تو بتائیں۔ ہم اپنی قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔"

"بولو کیا کر سکتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"آپ جو کہیں گے۔"

"کل ہماری جنرل باڈی کی میٹنگ ہے، آ جانا۔"

"جی اچھا!" میں نے نمسکار کیا اور باہر نکل آیا۔

"تم گھر جاؤ۔ پتول اکیلی ہوگی۔ مجھے بازار سے کچھ چیزیں خریدنا ہیں۔" باہر آ کر
میں نے انیل سے کہا۔

اسے گھر بھیج کر میں مسجد کی تلاش میں نکل پڑا۔ کئی دن کی نماز قضا تھی۔ ادا کرنی
ضروری تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے کلپنا سینما تک پہنچ گیا۔ سینما کے سامنے ہی ایک مسجد نظر آ گئی شیطان
اور رحمان کا گھر آمنے سامنے تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا اور اندر داخل ہو گیا۔

نماز ادا کرتے کرتے تین گھنٹے لگ گئے دل کو سکون مل گیا۔ باہر نکل کر میں نے رکشا
پکڑا اور نوتن پاڑا چلا آیا۔ انیل بستر پر لیٹا تھا اور پتول کھانا پکا رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

کھانا کھا کر میں نے انیل سے کہا۔ "یہ شہر بھی عجیب ہے۔ ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔
ایک حصہ تو دیکھ لیا۔ اب دوسرا حصہ بھی دیکھنا چاہیے چلو لال باغ والا حصہ دیکھ آئیں۔"

جنگ شروع کرنے سے پہلے میدان جنگ کو اچھی طرح دیکھ لینا ہی عقلمندی ہے۔
اندھی چال شکست کا باعث بنتی ہے۔ میں میدان کارزار سجانے کے لئے ہی مرشد آباد آیا تھا۔
نواب سراج الدولہ نے اسی سرزمین سے انگریزوں کو للکارا تھا اور میں ہندو بنیوں کو للکارنے آیا
تھا جو دیمک بن کر میرے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔

اس دن ہم دونوں نے ہزار دواری (ہزار دروازوں والی امام بارگاہ) موتی مسجد،
بھانکا کیلہ (ٹوٹا قلعہ) بکھری گلی اور رنگ محل دیکھا۔ مسلمانوں کی عظمت کا گیت گانے والے
شہر میں مسلمانوں کی غربت اور کسمپرسی دیکھی۔ واپسی کے وقت کنواری بی بی کے مزار پر فاتحہ
پڑھی جسے نوابین کے دور اقتدار میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا کیوں کہ پورے خاندان میں اس کے

جوڑ کا رشتہ نہیں تھا۔ وہاں سے لوٹ کر بہرام پور کی سڑکوں پر مٹر گشتی کرتا رہا۔ شام ڈھلے لو
کھانا کھایا اور چار پائی لے کر باہر آ گیا۔

اگلے دن انیل کو لے کر امارا بنگالی کے دفتر پہنچا۔ وہاں پہلے سے ہی کئی لوگ مو
تھے۔ ان کے ساتھ ہم دونوں بھی بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد کمرا بھر گیا اور ایک آدمی نے کھڑ
ہو کر تقریر شروع کر دی۔ بنگلہ میں روانی سے بول لیتا تھا لیکن ڈھاکے کی بنگلہ میں اور ہندوستا
کی بنگلہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پھر بھی میں بڑے دھیان سے سن اور سمجھ رہا تھا۔ وہ تقر
کرنے کی بجائے زہر اگل رہا تھا۔

کہہ رہا تھا۔ ''بھائیو! یہ پاکستان انگریزوں کی سازش کا حصہ ہے۔ اس کی بنـ
انگریزوں نے 1905ء میں رکھی تھی۔ ہماری مادر وطن کو دو حصوں میں بانٹ کر مشرقی بنگا
کے نام سے ایک نیا صوبہ بنایا تھا جس کی راج دھانی ڈھاکے میں بنائی گئی جب کہ ہمارا دل کلـ
میں تھا۔ ہمارے بازو قلم کر کے اس صوبے کو اس لئے بنایا گیا تھا کہ نیچ مسلمانوں کو قوت ملے
ان مسلمانوں کو جو ہماری جوتیاں اٹھایا کرتے تھے، جن کی بہو بیٹیوں پر ہمارا حق تھا۔ ہمارے ح
کو غصب کیا گیا ہے۔ رہی سہی کسر کراچی کے بیرسٹر نے پوری کر دی۔ مسٹر جناح نام کے ا
شخص نے ہمارے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنا حق واپـ
لے لیں۔ آپ سب ہمارا ساتھ دیں۔ میں آپ لوگوں کو مشرقی پاکستان کے مشن پر بھیجنا چا
ہوں۔ آپ وہاں مسلمان بن کر جائیں۔ مسلمان بن کر رہیں۔ آپ کی مدد کے لئے وہا
ہمارے کارکن موجود ہیں۔''

''وہاں جا کر ہم کریں گے کیا؟'' سامعین کی صف میں سے آواز سنائی دی۔

''آپ کا بس ایک ہی کام ہوگا۔ نفرت کے کھیت کی آب پاشی۔ بہاری بنگالی
تعصب پیدا کریں۔ شیعہ سنی کے درمیان نفرت پھیلائیں۔ دیو بندی، بریلوی کا جھگڑا پید
کریں اور اگر آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو سمجھ لیں کہ میدان ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔
وہ ملک فوراً ٹوٹ جاتا ہے جس کے عوام آپس میں دست و گریباں ہوں۔ ہماری کئی تنظیمیں کام
کر رہی ہیں، آپ انھیں مدد دیں۔ کامیابی ہمارا مقدر ہے۔''

''کون کون سی تنظیم؟'' ایک شخص نے سوال کیا۔

''معافی چاہتا ہوں۔ ان کے نام بتا نہیں سکتا۔'' مقرر نے جواب دیا۔

''پھر ہم ان کی مدد کیسے کریں گے؟'' اسی شخص نے کہا۔



''آپ کو جس تنظیم کی مدد کے لئے بھیجا جائے گا، اس کے نام تعارفی خط دے دیا
جائے گا۔ اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں بتا سکتے کیونکہ اسی میں تنظیم کی بقا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ
بیٹھ گیا۔

جلسے کے اختتام پر چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک جانب کچھ لوگ بیٹھے رجسٹر میں
اندراج کر رہے تھے میں بھی ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب ان کا نام پتا لکھ رہے تھے
جو مشرقی پاکستان جانا چاہتے تھے۔

جب بھیڑ کم ہو گئی تو میں بھی ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ انیل بھی تھا۔

''تم بھی جانا چاہتے ہو؟'' اندراج کرنے والے نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' انیل نے کہا۔

''آج سے تمھارا نام نورالاسلام بھویاں ہے۔ تمھاری تقرری ڈھاکے میں کی جاتی
ہے۔ تم وہاں انجمن قرآن و سنت کے دفتر میں جاؤ گے وہ لوگ تمھیں کچھ دنوں تک ٹریننگ دیں
گے اور پھر تم گاؤں گاؤں گھوم کر مسجدوں میں تقریر کرنا۔ تمھارا خاص نشانہ ہوں گے بریلوی اور
شیعہ۔ ان دونوں کے خلاف جتنا زہر اگلو گے تمھاری کامیابی اتنی ہی نزدیک آتی جائے گی۔''

''یعنی ہم دونوں آمنے سامنے ہوں گے؟'' وہیں کھڑے ایک کارکن نے کہا۔

''ہاں، تم انجمن عندلیب نبی کے ممبر بنو گے اور تمھارا کام ہوگا انجمن قرآن و سنت پر
کیچڑ اچھالنا۔ اس کے ممبران پر کفر کا فتویٰ لگاؤ گے۔ ان کے جلسے میں تخریب کاری کرو گے
تا کہ ان کے پیرو کار تمھاری انجمن کے دشمن بنیں اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو سکے۔''

''میں بھی جانا چاہتا ہوں لیکن مجھے ایک ڈر ہے۔'' میں نے ٹھیٹ بنگالی لہجے میں
کہا۔

''کیسا ڈر؟'' اس نے پوچھا۔

''راج شاہی میں میرا دشمن ہے۔ سندھ سے آ کر ہم پر راج کر رہا ہے۔''

''کرتا کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پی ڈبلیو ڈی میں کلرک ہے اپنے آپ کو بہت بڑا محب وطن کہتا ہے۔''

''کہیں تم ابڑو کے بارے میں تو نہیں کہہ رہے ہو؟''

''ہاں ہاں وہی۔'' میں نے سر ہلا دیا۔

اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''ڈرو نہیں میرے دوست، وہ اور اس کا ایک دوست ہماری

قید میں ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔''کیا اس حرامی کو گرفتار کر لیا ہے؟''

''ہاں، ہم اپنے دشمنوں کو معاف نہیں کرتے۔''

''وہ ہے کہاں؟ میں اسے جوتے مار مار کر اپنا حساب بے باق کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہم نے سارا حساب چکتا کر کے اسے پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ فار ایکٹ کے تحت جیل کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔''

''میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔ وہ کس جیل میں ہے؟''

''چھوڑو اس کی بات۔ چھوٹے چھوٹے مہروں پر توجہ نہ دو۔ وہاں پہنچ کر اس کے استاد سے حساب بے باق کرو۔ اس کا نام ضیغم عابدی عرف خان ہے۔''

میرا دل کانپ اٹھا لیکن میں نے گھبراہٹ کو سختی سے دبا دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا جھوٹا نام ونو دلکھا دیا میرے ذمے شیعوں کو بھڑکانے کا کام سونپا گیا، ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر انھیں دوسرے فرقوں کے خلاف ابھارنا تھا۔

مجھے ایک چٹ دیتے ہوئے اس نے کہا۔''اسے لے کر تم کل آنا، تمھیں اسپیشل کلاس اٹینڈ کرنی ہے تا کہ تقریر کرنے کا فن تمھیں آ جائے۔''

کاغذ کا پرزہ لے کر میں نوتن پاڑا کی جھگی میں لوٹ آیا۔

اب میں ان دونوں کو آزاد کرانے کی راہ تلاش کرنے لگا۔ جو بھی کرنا تھا، جلد از جلد کرنا تھا۔ کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے زبردستی ڈھاکا نہ بھیج دیں۔ کافی دیر سوچ بچار کے بعد مجھے ایک نئی راہ مل گئی میں اپنے روپے پتول کے پاس رکھ کر گھر سے نکل پڑا۔

☆=====☆=====☆

میرا منصوبہ خطرناک تھا۔ خطروں سے کھیلے بغیر منزل ملتی بھی نہیں ہے اسی لئے میں نے سر پر کفن باندھ لیا تھا۔ نوتن پاڑا سے پیدل ہی بس اسٹینڈ پر پہنچا۔ کلکتہ، سلی گوڑی، مالدہ وغیرہ کی بسیں آ جا رہی تھیں۔ مسافروں کا ہجوم تھا۔ دکانوں پر خریداروں کی بھیڑ تھی۔ میں نے سجی سجائی دکانوں پر ایک نظر ڈالی اور مسافروں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا اور اپنے سامنے والے کی پاکٹ میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ سانپ جیسی تیزی سے پلٹا اور میری کلائی پکڑ کر تابڑ توڑ گھونسے



برسانے لگا۔ اس شور نے آس پاس کے لوگوں کو بھی متوجہ کر دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا فیصلہ غیر دانشمندانہ تھا۔ عوام جب بپھرتے ہیں تو کس بری طرح پیش آتے ہیں اس کا احساس مجھے تب ہوا جب بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ یقین کریں میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا قیمہ بن جاتا لیکن میرے جسم کو جنگلی حکیم کی دوا سوم رس نے فولاد بنا دیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے احساس تک نہیں ہو رہا تھا کہ مجھ پر گھونسے برس رہے ہیں۔ جب ان کا دل بھر گیا تو مجھے تھانے پہنچا دیا گیا۔ تھانے میں بھی جم کر پٹائی ہوئی اور پھر جیل خانے بھیج دیا گیا۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ لال چار دیواری تک پہنچنے کے لئے ہی تو میں نے اتنے لات گھونسے کھائے تھے۔

جیل میں پہنچتے ہی مجھے ڈاکٹر کے سامنے پیش کیا گیا اس نے کپڑے اتروا کر میرے جسم کا معائنہ کیا اور پھر اس نے رپورٹ بنا کر مجھے تھما دی۔ رپورٹ میں اس نے لکھا تھا کہ کسی قسم کی چوٹ کا نشان نہیں ہے۔ جیلر نے رپورٹ دیکھی اور پھر میرے دونوں ہاتھوں کی چھاپ لے کر مجھے وارڈن کو سونپ دیا۔ وہ مجھے لے کر اندرونی دروازے کی جانب چل پڑا۔ ایک کے بعد ایک تین دروازے پار کر کے ہم پانچ نمبر بیرک میں پہنچے۔ بیرک بالکل خالی تھی۔

''کیا مجھے قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وارڈن نے جواب دیا۔

''لیکن یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں؟''

''سب مزدوری کرنے گئے ہیں۔ آج تمھارا پہلا دن ہے کل سے تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گے۔'' کہہ کر وہ لوٹ گیا۔

میں سیمنٹ سے بنے پشتے پر بچھے کمبل پر لیٹ گیا لیکن جسم میں خارش ہوتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ اب جو غور سے دیکھا تو کراہیت سے اچھل کر دور ہٹ گیا۔ کمبل پر پسوؤں کا بازار سجا تھا۔ ادھر سے اُدھر دوڑتے بھاگتے پسو دیکھ کر ہی میری رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ بیرک کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ ورنہ میں باہر نکل کر جان چھڑا لیتا۔

کوئی چارہ نہ دیکھ کر میں نے دروازے سے ٹیک لگائی اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔ چھری کے نیچے گردن ڈال تو دی تھی لیکن اب چھری ہٹے کیسے؟ یہی سوچ رہا تھا کہ ان دونوں کو کیسے فرار کرایا جائے اسی پر غور کر رہا تھا کہ مجھ پر غنودگی سی چھانے لگی۔

آپ نے دیکھا ہوگا محفل رقص و موسیقی میں لوگ ساری رات بیٹھ کر گزار دیتے ہیں۔ گھڑی بھر کے لئے جھپکی بھی نہیں لیتے لیکن محفل وعظ میں لوگ خراٹے لینے لگتے ہیں۔

مولانا وعظ فرما رہے ہیں ''لوگو! یہ دنیا فانی ہے۔ ہر چیز کو فنا ہو جانا ہے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''
سامعین میں سے کئی کے ناک جواب دیتے ہیں خرخرخر۔ یعنی اپنے آپ کو خر ثابت کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کا جسم تو وہیں ہوتا ہے لیکن دل و دماغ کہیں اور اسی رسہ کشی میں نیند غلبہ پا لیتی ہے۔ میرا جسم بھی وہاں تھا لیکن دماغ کہیں اور تھا نتیجہ غنودگی نے حملہ کر دیا اور میری تمام حسیں جسم کی تھکاوٹ کے باعث آہستہ آہستہ سوتی چلی گئیں۔ مجھے پتا نہیں کتنی دیر تک سوتا رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تھی کسی کی لات کھانے پر۔ میں ہڑبڑا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے سامنے ایک شخص سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اوئے تُو کون ہے؟ تجھے پتا نہیں کہ جیون لال اسی بیرک میں رہتا ہے۔ تُو نے راستے میں بیٹھنے کی جسارت کیسے کی؟''

میں نے جواب نہ دیا۔ بس خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

''اوئے تُو نے سنا نہیں؟ بتا تیرا نام کیا ہے اور اپنے جرم کی تفصیل بھی بتا۔'' اس نے میری ٹھوڑی کو دو انگلیوں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میرا نام ونود ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور جرم؟''

''جیب تراشی۔''

''بیرک والو! اس سے ملو یہ جیبوں میں گھسنے والا چوہا ہے۔ پتا نہیں جیلر کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نے شیروں کے پنجرے میں چوہا بھیج دیا ہے۔''

سارے قیدی ہنسنے لگے۔

''چل، میرے پیر دبا۔'' اس نے میرے کالر کو پیچھے سے پکڑ کر گھسیٹا میں نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا تھا لیکن ضبط کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھائے جا رہا تھا۔ اس نے مجھے گھسیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس ظلم ناروا پر میرا دل چیخ اٹھا اور میں نے اپنے پیر مضبوطی سے جما لئے۔ مجھے چٹان کی طرح ایک جگہ جما دیکھ کر وہ بری طرح بوکھلا گیا اور پوری قوت سے مجھے گھسیٹنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پہاڑ بھی کبھی اپنی جگہ چھوڑتے ہیں۔ غصے میں اس نے زوردار جھٹکا مارا۔ میری شرٹ کا کالر پھٹ کر اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا اور میرے ہونٹوں پر ہنسی کی لکیر کھنچ گئی۔ مسکراہٹ نے آگ پر گھی ڈال دیا۔ وہ بارود کی طرح جل اٹھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اچھل کر میرے سینے پر ٹکر مارنی چاہی تھی میں پہلے سے ہی تیار تھا۔ فوراً بائیں جانب سرک گیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا جا کر دیوار سے ٹکرا



یا۔ اس ٹکر نے اس کے غصے کو مزید ہوا دی اور وہ ارنا بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا پلٹا۔ اس نے رے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ میں نے دائیں جانب سرک کر اپنا پیر سیدھا کر دیا۔ وہ ری ٹانگ سے الجھ کر لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ اس بے عزتی نے اس کے تن بدن میں آگ لگا ی کیوں کہ ہم دونوں کے گرد گھیرا بنائے قیدیوں نے قہقہہ لگایا تھا۔ اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے اس نے اچھل کر لات ماری۔ میں نے بھی جواب میں لات چلا دی۔ دونوں کے پیر ٹھیوں کی طرح ٹکرائے اور وہ پیر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں اگر چاہتا تو ایک دو گھونسے جڑ سکتا تھا لیکن ں نے ہاتھ نہ اٹھایا میں جانتا تھا اگر میرا ایک بھی کرارا ہاتھ پڑ گیا تو وہ اٹھ کر پانی نہیں پی سکے ا۔ مجھے خاموش کھڑا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر کرب انگیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ درد کی ٹیس کو نے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''تُو بہادروں کا بہادر ہے۔ ایسا فولادی جسم میں نے ہیں دیکھا مجھ سے دوستی کرے گا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''دشمنی کب ہے؟''

''تو آ ہاتھ ملا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ کو میں نے اپنے دونوں تھوں میں تھام لیا۔

''تُو مسلمان ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''میرا نام ونود ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر مسلمانوں کی طرح ہاتھ کیوں ملا رہا ہے؟''

''میری عادت ہے۔''

''اس عادت کو چھوڑ دے ورنہ کسی دن بلوے میں مارا جائے گا۔ آ روٹی کھا لے۔ ج تیرا پہلا دن ہے جیل سے کھانا نہیں ملے گا۔'' وہ لنگڑاتے ہوئے ایک پشتے کی جانب ڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں چل پڑا۔ چبوترے پر بیٹھ کر اس نے آواز لگائی۔ ''سنتو، چل کھانا گا۔''

ایک منحنی سے لڑکے نے المونیم کی پلیٹ میں رکھ کر پانچ چھ روٹیاں اور المونیم ہی کے کٹورے میں پانی جیسی دال لا کر سامنے رکھ دی۔

''لے میری جانب سے آج تیری دعوت ہے۔''

کھانا کھا کر اس نے اپنے برابر والے چبوترے پر لیٹے قیدی سے کہا۔ ''او سکھا تُو ھر جا کر سو۔ یہاں میرا یار سوئے گا۔''

وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کی جگہ میں نے ہتھیا لی۔

استاد تیرا داؤ بتا رہا ہے کہ تو مار کٹائی میں مہارت رکھتا ہے۔ پاکٹ مار کبھی اتنا پھرتیلا نہیں ہوتا۔'' جیون لال نے کہا۔

''تمہارا اندازہ صحیح ہے۔ میں کون ہوں یہ بعد میں بتاؤں گا۔''

''مجھ پر بھروسا نہیں کیا؟''

''بھروسا کیوں نہیں ہے لیکن ابھی وقت نہیں آیا ہے۔''

''ویسے بتا دوں۔ جیون لال دوست کے لئے جیون دے سکتا ہے اور میں نے تمہیں دوست کہا ہے۔ میں نے تم سے ڈر کر دوست نہیں کہا بلکہ تمہاری ہمت اور بہادری نے مجھے تمہارا گرویدہ کر لیا ہے۔ میں خود بھی بہادر ہوں اور بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔'' میں نے باتوں کا رخ بدلا۔ ''کیا تم نے کسی ایسے قیدی کو دیکھا ہے جو پنجابی لہجے میں بات کرتا ہو؟''

''ہاں، دو پاکستانی ہیں۔ دونوں اسی بیرک میں رہتے ہیں۔''

''لیکن اب تک دکھائی نہیں دیے؟''

''وہ دونوں بھی شیروں کے شیر ہیں۔ اب تک دو بار وارڈن کی پٹائی کر چکے ہیں۔ انھیں ڈنڈا بیڑی پہنا کر سیل میں رکھا گیا ہے۔ کل ان کی قید تنہائی کی مدت ختم ہونے والی ہے لیکن تم انھیں کیوں تلاش کر رہے ہو؟''

''میں جس گینگ کے لئے کام کرتا ہوں، وہ سامان کے ساتھ آدمیوں کی اسمگلنگ بھی کرتا ہے۔ ان دونوں کو ہم نے ہی بارڈر کراس کرایا تھا۔ ان کے پاس سو تولے سونا ہے۔ اسی کے بارے میں پوچھنا ہے۔''

''سو تولے!'' اس نے حیرت سے کہا۔

''اسمگلنگ میں تو یہ معمولی سا وزن ہے۔ تم کیسے گینگسٹر ہو جو اتنے سے سونے پر حیران ہو گئے؟''

''یقین کرو گے دوست! جیل پہنچنے سے پہلے میں ایک سیدھا سادا آدمی تھا اس لئے کچھ بھی نہیں جانتا۔'' اس نے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''پھر جیل کیسے پہنچ گئے؟''

''غصے کی آگ نے عقل کو جلا دیا تھا۔''



''اوہ! مار پیٹ کر کے آئے ہو۔''

''مار پیٹ نہیں، قتل کر کے۔ میں درزی ہوں۔ نینی تال میں میری دکان تھی۔ جیل آنے سے تین ماہ پہلے شادی کی تھی۔ نئی نئی دلہن کے نخرے اٹھانے میں کتنا لطف آتا ہے، یہ تم بھی جانتے ہو گے۔ وہ دن تو مرادوں کے ہوتے ہیں۔ ہر رات دیوالی ایسی سندر ہوتی ہے۔ میری بیوی کنک لتا بھی پھولوں جیسی سندر تھی۔ اتنی سندر دلہن کی فرمائش میں ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک دن اس نے چھوٹی سی فرمائش کی۔ وہ فلم دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے دکان بند کی اور اسے لے کر سینما ہال پہنچا۔ ایک تو سولہواں برس اس پر سولہ سنگھار! شادی کے فوراً بعد یوں بھی عورت کا روپ کچھ زیادہ ہی نکھر جاتا ہے۔ وہ بھی قیامت بن گئی تھی۔ جب ہم پہنچے فلم شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں باہر کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا ہمارے آس پاس منچلے نوجوان چکرا رہے ہیں۔ میں غصے سے کھول اٹھا لیکن کوئی رولا مول نہیں لینا چاہتا تھا، اس لئے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے خاموش تھا۔'' یہ کہتے کہتے وہ رک گیا۔ اس کی نگاہیں دیوار پر مرکوز تھیں جیسے اس پر ماضی کے منظر ابھر رہے ہوں۔

اسے خاموش پا کر میں نے ٹوکا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

وہ چونک گیا۔ اس نے سر گھما کر میری جانب دیکھا اور پھر بولا۔

''گھنٹی بجنے کے بعد ہم دونوں ہال میں داخل ہوئے۔ نشست بتانے والے نے ٹارچ سے ہماری سیٹوں کی جانب اشارہ کیا۔ ہم دونوں جا کر بیٹھ گئے۔ تم نے دیکھا ہوگا، سینما ہال میں بیٹھنے والے اکثر سامنے والی سیٹ پر پیر ٹکا دیتے ہیں۔ کنک لتا کے پیچھے جو نوجوان بیٹھا تھا، اس نے پیر بڑھا کر اس کی سیٹ سے ٹکا دیا۔ کنک لتا نے مجھ سے کہا۔ میں نے مڑ کر اسے ہدایت کی اس نے پیر ہٹا لیا۔ کچھ دیر بعد پھر اس نے وہی حرکت کی تو میں نے اسے ڈانٹا۔ دوسری بار جب اس نے پھر پیر رکھا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے پلٹ کر ایک ہاتھ جڑ دیا۔ اس نے جواب میں گالی دی۔ گالی سنتے ہی میرا خون کھول اٹھا اور میں نے سیٹ پھلانگ کر اس کی گردن پکڑ لی۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا تھا۔ مجھے خود اپنا ہوش نہیں تھا۔ اس کی گردن پر اتنا زیادہ دباؤ بڑھا دیا تھا کہ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ ہال میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ ان کی چیخ و پکار سے فلم بند ہو گئی۔ لوگوں ہی نے مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ یوں مجھے سزا ہو گئی۔''

''گھر میں اور کون کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف ماں۔''

''ملنے تو آتی ہوگی؟''

''ہاں کبھی کبھی۔''

''اور بیوی؟''

''ایک بار آئی تھی لیکن میں نے ملنے سے انکار کر دیا۔''

''وہ اپنے میکے چلی گئی ہے یا تمہارے گھر پر ہے؟''

''اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ اسے ماموں نے پالا تھا۔ وہ تو پہلے ہی ان پر بھار تھی، اب تو اسے گھر میں گھسنے ہی نہیں دیں گے۔''

''بڑی دکھ بھری کہانی ہے تمہاری۔ کتنے سال کی سزا ہوئی ہے؟''

''چودہ سال کی۔''

''اگر مجھے وہ دونوں مل گئے تو میں تمہیں بھی جیل سے نکال لوں گا۔'' میں نے وعدہ کر لیا۔

''بعد کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔'' اس نے کروٹ بدل کر کہا۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ رو رہا ہے۔ میں نے دخل دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ہر غم کا علاج آنسو ہوتے ہیں۔ میں نے اسے آنسو بہانے سے نہ روکا تا کہ اس کا دماغ پُرسکون ہو جائے۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ ہی دیر بعد نیند نے میری آنکھوں میں ڈیرا جما لیا۔

اگلی صبح مجھے دوسرے قیدیوں کے ساتھ مزدوری کے لئے بھیج دیا گیا۔ کچھ قیدی فرنیچر بنانے کے کارخانے میں چلے گئے۔ کچھ دری اور کمبل بننے کے کارخانے میں۔ میری ڈیوٹی جیون کے کہنے پر باغ میں لگا دی گئی۔ وہاں کام کچھ بھی نہ تھا۔ صرف پتے چننے تھے اور شام کو لوٹتے وقت درختوں کو پانی دینا تھا۔

ہم دونوں ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ بیڑی ڈنڈے کی جھنکار سنائی دی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو میری اوپر کی سانس اوپر نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ تراب فاروق تھا میری خاطر آگ کی ندی میں چھلانگ لگانے والا۔ ڈھاکا سے راج شاہی آکر طوفان سے ٹکرانے والا۔ جس کے دل میں حب وطن کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لاکھوں کی جائیداد کا مالک نوکروں پر حکم چلانے والا آج اس طرح بے کس و لاچار تھا۔ پاؤں میں



یاں تھیں جنہیں ران کی بیڑیوں سے منسلک کر دیا گیا۔ وہ ایسا ہی منظر تھا کہ جذبات پر قابو نا دشوار ہو گیا تھا۔ پھر یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں وہ ضیغم کہہ کر نہ پکار لے اگر اس کی زبان سے ایک بھی نکلتا تو میری قسمت پھوٹ جاتی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ سارے منصوبے دھرے رہ تے۔ جیون لال کی باتوں سے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے۔ میرا نام رے چہرے سے نقاب نوچ سکتا تھا اس لئے میں خود اس کی جانب دوڑا اور بولا۔

''میرے دوست، میرے بھائی مجھے پہچانو۔ میں ونود ہوں ونود تمہیں بارڈر کراس رانے والا۔''

وہ سمجھنے اور نہ سمجھنے کی حالت میں کھڑا مجھے ایک ٹک دیکھتا رہ گیا۔ میں نے اسے سینے ے لپٹا لیا اور اسے بھینچتے ہوئے سرگوشی میں بولا ''میں ہندو بنا ہوا ہوں۔'' پھر قدرے بلند آواز ں پوچھا ''وہ تمہارا دوست کہاں ہے؟''

''وہ بھی قید تنہائی میں تھا۔ اسے بھی لایا جا رہا ہوگا۔'' فاروق نے جواب دیا۔

میں نے پھر سرگوشی میں جواب دیا۔ ''اسے بھی سمجھا دینا۔''

اس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔''

میں نے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرے دوست! باس نے حکم دیا ہے کہ تمہیں زاد کرا دیا جائے۔''

جیون لال نے آگے بڑھ کر کہا ''لیکن دوست! یہ پاکستانی ایجنٹ ہے۔ اسے اتنی سانی سے آزادی نہیں ملے گی۔ دو سال کا عرصہ یہاں گزارنا اس کا مقدر بن چکا ہے۔''

میں نے جواب دیا ''جیون لال! بزدل اپنے مقدر پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہم تو ت بازو سے جیون سنوارنا اور مقدر بدلنا جانتے ہیں۔ طاقت تمہارے پاس بھی ہے لیکن تم نے اسے استعمال نہیں کیا اور قسمت پر بھروسا کر کے بیٹھ گئے۔ ذرا یہ تو سوچو تمہارے بعد ہارے گھر کی حالت کیا ہوئی ہوگی؟ کون تمہاری ضعیف ماں اور بے سہارا بیوی کی خبر گیری کر ہا ہوگا۔''

بات سچی ہو تو کڑوی لگتی ہے۔ جسے لوگ تھوک دیتے ہیں۔ بھول جاتے ہیں کہ ڑوی دوا زندگی بچانے کی ضامن ہوتی ہے۔ وہ بھی انسان تھا۔ اس نے برا سا منہ بنا لیا اور ا۔ ''یہ مغربی بنگال ہے۔ یہاں عورتوں کو مکمل آزادی ہے۔ ہر کارخانے میں آفس اور لت میں عورتیں نوکری کرتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر دکانیں بھی لگانے میں عار نہیں سمجھتیں۔ شاید

تم نے دیکھا نہیں ہے کہ مختلف صوبوں کے لاٹری ٹکٹ فروخت کرنے میں عورتیں آگے ہیں

میں نے جواب دیا۔ ''میرے بھائی لاٹری سرکاری جوا ہے اور جوا کھیلنے والے قماش کے ہوتے ہیں، یہ تم بھی جانتے ہو۔ وہ بطور امداد لاٹری نہیں خریدتے۔ لاٹری اس خریدتے ہیں کہ انہیں پھل جائے۔ سب نہ سہی مسکراہٹ سہی۔''

وہ بولا۔ ''تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم سنکیرن مستیسک کے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں میں چھوٹے ذہن کا ہوں میرے نزدیک عورت چار دیوا کے حصار میں محفوظ ہوتی ہے۔ کیا تم نے رامائن نہیں پڑھی؟ رام کی بیوی سیتا کو اس کے لچھمن نے گھر کے دروازے پر لکیر کھینچ کر تنبیہہ نہیں کی تھی کہ اس لکیر سے باہر مت جانا۔ اس لچھمن کی لکیر کو پار کیا اور راون کے چنگل میں پھنس گئی۔''

اس نے کہا۔ ''وہ ست جگ کی بات تھی۔ یہ کل جگ ہے۔ آج گھر سے باہر عورت کی ضرورت بن چکا ہے۔''

میں نے جواب دیا۔ ''ضرورت نہیں بے غیرتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ صنف مخا کی کشش ختم ہو چکی ہے۔ بھگوان رجنیش نے اپنی کتاب ''سمبھوگ سے سمادھی تک'' میں با سچ لکھا ہے۔ ''عورت تب تک عورت تھی جب تک راز تھی۔ راز عیاں ہوتے ہی کشش کھو ہے۔'' یوں بھی بند مٹھی تجسس کو جنم دیتی ہے کھلا ہاتھ منہ پھیر لینے پر مجبور کرتا ہے۔''

اس نے اکتا کر کہا۔ ''چھوڑو، ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ یہ بتاؤ اسے آزاد کراؤ گے۔''

میں نے جواب میں کہا۔ ''آج پلان بناؤں گا۔''

اس نے دور سے آتے ہوئے وارڈن کو دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا ''پانی کی بالٹی اٹھا کر پودوں پر چھڑکو۔ جلاد آ رہا ہے۔''

میں نے فوراً بالٹی اٹھائی اور پودوں پر پانی چھڑکتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ جاتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ کٹی ہوئی سوکھی جھاڑیوں کو دیکھ کر میرے دماغ میں ایک نیا خیا ابھرا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں آزادی دلانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ میں نے جھاڑیوں کو ایک جگہ جمع کیا اور جیون لال کو آواز دی۔

''کیا ہے۔'' اس نے نزدیک آ کر پوچھا۔

''ماچس ہے؟''



''کیا کرو گے؟''

''ان جھاڑیوں میں آگ لگاؤں گا۔''

''جیل میں ماچس لانا جرم ہے۔ ہم بھاری رشوت دے کر سگریٹ ما س لاتے ہیں۔ آگ دیکھ کر جیلر آگ بگولا ہو جائے گا۔''

''دھواں نہیں اٹھنے دوں گا یا پھر آگ لگا کر ہم کھسک لیں گے۔''

''ڈیوٹی بک میں لکھا ہو گا کہ باغ میں آج کس کی ڈیوٹی ہے۔''

''یاد رکھو جیون' بغیر خطرہ مول لیے کامیابی نہیں ملتی۔ مجھے ان جھاڑیوں کا کوئلہ چاہیے۔''

''کوئلہ چاہیے۔''

''میں باورچی خانے سے کوئلہ لا دیتا ہوں۔''

''اگر پتھر کے کوئلے کی ضرورت ہوتی میں خود کہتا۔ یہ روسے کی جھاڑیاں ہیں۔ ان کا کوئلہ سب سے ہلکا ہوتا ہے۔ بارود میں اسی کوئلے کی ضرورت پڑتی ہے۔''

''تو کیا بم بناؤ گے؟ سوراء گندھک اور گن پاؤڈر کہاں سے لاؤ گے؟''

''بس دیکھتے رہو میں آج رات ہی تمہیں آزاد کرا لوں گا۔''

اس نے ماچس نکال کر دے دی۔ میں نے چھوٹا سا گڑھا کھودا اور اس میں جھاڑیاں رکھ کر آگ لگا دی خشک جھاڑیاں سلگ اٹھیں۔ میں نے کچھ دیر توقف کیا، پھر اوپر سے مٹی ڈال دی تاکہ دھواں کوئلے میں سرایت کر جائے اور کوئلہ ہلکا ہو جائے۔ اس کام سے نمٹ کر جیون کے ساتھ واپس چل پڑا۔ فاروق وہیں پر بیٹھا تھا جہاں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔

''ابڑو اب تک نہیں آیا؟'' میں نے فاروق سے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے اس کی ڈیوٹی کسی دوسری جگہ لگا دی گئی ہو۔''

اتنے میں پھر جھنکار سنائی دی۔ ابڑو کی بیڑیاں جھنکار پیدا کر رہی تھیں۔ وہ جھومتا جھامتا چلا آ رہا تھا۔

''واہ میرے شیر! واقعی تو سندھ کا شیر ہے۔ تجھ پر لال شہباز قلندر کی دعائیں سایہ فگن رہیں۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

اس کی نگاہ مجھ پر پڑ چکی تھی۔ اس نے زوردار نعرہ لگایا۔ ''دم علی علی۔''

میں نے گھبرا کر فاروق کو اشارا کیا تو وہ اٹھ کر اس کی جانب دوڑا کہیں وہ

لے لے یہی ڈر تھا لیکن وہ باب الاسلام کا فرزند تھا۔ بہادری کے ساتھ عقل بھی رکھتا
فاروق کی بات سنتے ہی اس نے سر ہلایا اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا کر میری جانب بڑھا۔ ''سا
ونو دا! تم کیسے آ گئے؟''

''تمہاری محبت کھینچ لائی۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا ڈھیروں خون بڑھ گیا ہے۔ دیکھنا سائیں ان کافروں کو چھٹی کا دودھ
دلا دوں گا۔''

میں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ دبایا لیکن کمان سے نکلا تیر اور زبان سے نکلی بات لو
نہیں آتی۔ جیون داس نے تاڑ لیا کہ میں نے اپنے چہرے پر نقاب لگا رکھا ہے۔ اس نے
کر کہا۔ ''اچھا، تو تم بھی پاکستانی ہو۔ جبھی اتنی بہادری سے شیر کی کچھار میں گھس آئے۔''

بات بگڑ چکی تھی۔ میں نے راز کھول دیا۔ ''ہاں، یہ میرے بھائی ہیں۔ انھیں آ
کرانے آیا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں آزاد ہو کر رہوں گا کیوں کہ کہا
ہے۔ پاکستانی بڑے لڑیا جن کی سہی نہ جاوے مار۔''

''لیکن دوست! اس راز کو راز ہی رکھنا ورنہ زندگی بھر یہیں تڑپتے رہ جاؤ گے۔ ع
کی سزا آسان نہیں ہوتی۔''

''بھئی تم جو بھی ہو مجھے اس سے مطلب نہیں۔ مجھے تو آزادی چاہیے۔''

''آزادی بھیک میں نہیں ملتی، حاصل کرنا پڑتی ہے۔ تم میرا ساتھ دو میں تمھ
آزادی دوں گا۔''

''میں تو ساتھ ہوں۔''

''تب رات کا انتظار کرو۔'' کہتے ہوئے میں ہری گھاس کے فرش پر لیٹ گیا۔

باتوں کے درمیان مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ سورج کو افق پر ج
دیکھ کر میں نے کہا۔ ''جیون لال! کوئلہ نکالنا ہوگا۔''

وہ میرے ساتھ گڑھے پر پہنچا۔ میں نے مٹی ہٹا کر کوئلہ نکالا اور اسے ہم چاروں
جیبوں میں بھر لیا۔ جب وہاں سے بیرک میں پہنچے تو میں نے جیون لال سے کہا۔ ''ا
باریک پیسنا ہوگا۔''

''ابھی لو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک چبوترے پر کوئلے رکھ کر پتھر کے ٹکڑے سے



لگا۔

پاؤڈر بنتے ہی میں نے جیون کی دھوتی پھاڑ کر پوٹلی بنالی اور اسے لے کر بیرک کے
سامنے لگے برگد کے پیڑ پر چڑھ گیا۔ ساتھ میں ماچس کی تیلیوں کی ایک لڑی بھی تھی۔ میں نے
چار ڈبی ماچس کی تیلیوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر اور پھر مسالے والے حصے کو
دھاگے سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر لڑی بنالی تھی۔ اب میں نے اس لڑی کا سرا پوٹلی
سے باندھ کر نیچے لٹکا دیا اور پوٹلی کو گھنی شاخوں کے درمیان پتوں کی آڑ میں چھپا کر نیچے اتر
آیا۔ میری حرکتوں کو وہ سب بڑے غور سے دیکھ رہے تھے مگر سمجھ نہیں پائے تھے کہ میں کیا کرنے
والا ہوں۔ میں نے بھی اپنا پلان نہیں بتایا تھا۔ یوں بھی میں اپنے راز میں کسی کو شریک کرنا پسند
نہیں کرتا۔ پیڑ سے نیچے اتر کر میں نے کہا۔ ''آؤ واپس گارڈن میں چلتے ہیں۔''

''نہیں، گنتی کا وقت ہونے والا ہے۔'' جیون لال نے کہا۔

ہم دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ قیدیوں کا جتھا واپس آتا نظر آیا وہ سب نل پر
ہاتھ منہ دھو رہے تھے کہ گھنٹی بجی۔

''چلو کھانا لے آتے ہیں۔'' جیون بولا۔

دوپہر کی طرح شام کو بھی میں جیون کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کی دھاک تمام قیدیوں
پر تھی اسی لیے مجھے بھی قطار میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ پڑی۔ روٹی اور دال لے کر ہم
سب بیرک میں واپس آ گئے۔ کھانے کے بعد اسے گانجا پینے کی عادت تھی اور مجھے اس غلیظ
شے کے دھوئیں سے نفرت تھی۔ ہندوؤں میں گانجا اور بھنگ متبرک نشہ سمجھا جاتا ہے اور اسے
شنکر بھگوان کا تبرک کہا جاتا ہے۔ جیل میں نشے کی چیزیں لانا جرم ہے پھر بھی رشوت کے بل پر
ہر کام ہو جاتا ہے۔ جبھی تو بیرک گانجے کے دھوئیں سے بھر گئی تھی اس کراہت آمیز ماحول میں
میرا دم گھٹنے لگا تو میں باہر نکل آیا کھلی فضا میں آ کر میں اپنے پلان پر غور کرنے لگا۔ میرا پلان ہر
طرح مکمل تھا پھر بھی مستقبل کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔

''کیا سوچ رہے ہو سائیں؟'' ابڑو نے دروازے پر آ کر پوچھا۔

''تم لوگوں کی فکر میں ہلکان ہو رہا ہوں۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہم لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ وارڈن دو سپاہیوں کے ساتھ آ گیا۔

''اوئے تو کیا کر رہا ہے۔ چل لائن میں بیٹھ۔ گنتی ہونی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کی آواز پر سارے قیدی باہر نکل آئے اور بلب کی تیز روشنی میں ایک دوسرے

کے پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے جیون کو اشارہ کر دیا تھا۔ ابڑو اور فاروق بھی آہستہ آہستہ بیرک
پیچھے کھسکتے جا رہے تھے۔ ان کی رفتار بہت زیادہ کم تھی۔ وہ چیونٹی کی چال چل رہے تھے۔
بیڑیوں کی جھنکار وارڈن کو ہوشیار نہ کر دے۔ جیون لال نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ماچس
تیلیوں کی لڑی میں جلتا ہوا سگریٹ لگایا اور سرعت سے دور ہٹ گیا۔ یکے بعد دیگرے تیل
جلتی ہوئی پوٹلی تک پہنچ گئیں۔ پوٹلی میں بھرے کوئلے کے پاؤڈر نے آگ پکڑ لی۔ روسے
کوئلے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اندر ہی اندر سلگتا ہے۔ پوٹلی میں جمع پاؤڈر بھی کچھ دیر سلگتا رہا
پھر بھربھرا کر نیچے گرنے لگا۔ پاؤڈر جل کر انگاروں کی صورت میں گر رہا تھا۔ ہندو ویسے
ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ تمام قیدی شور مچانے لگے ''آ گیا بیتال آ گیا بیتال۔''

آ گیا بیتال ہندوؤں کا ایک دیوتا ہے جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ جب
چلتا ہے تو آگ کے شرارے پھوٹتے ہیں۔ انھوں نے یقین کر لیا کہ پیڑ پر ان کا دیوتا آ
ہے۔ وارڈن پڑھا لکھا تھا پھر بھی اندھے اعتقاد نے اسے بھی سجدے میں جھکا دیا۔ سارے
قیدی سجدے میں تھے اور ہم چاروں گندے پانی کے نالے میں، سب سے آگے میں تھا میرے
پیچھے ابڑو، فاروق اور جیون لال۔ اندر ہی اندر ہم لوگ دیوار تک پہنچ گئے۔ انگریزوں
بنائے ہوئے اس جیل کا نالہ بھی کم گہرا نہیں تھا۔ آپ نے کراچی کی سڑکوں کے کنارے
ہوئے بڑے نالوں کو دیکھا ہوگا۔ وہ بھی اتنا ہی گہرا تھا۔ دیوار کے نیچے موٹی موٹی سلاخیں
ہوئی تھیں جن پر سڑے ہوئے پتے، گندے کپڑے اور دیگر گندگی لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے
سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور زوردار جھٹکا دیا۔ سلاخیں اکھڑ گئیں۔ مزید چار سلاخوں
اکھاڑ کر میں نے اتنی جگہ بنالی کہ ایک آدمی آرام سے باہر نکل سکتا تھا۔ ہم باہر نکل آئے
ہمارے سامنے ندی تھی۔ میں نے فاروق سے پوچھا۔ ''تیرنا آتا ہے؟''

''ہاں!''

''اور تمھیں؟'' ابڑو سے سوال کیا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمھارا بنگال، میں رہنا بیکار ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے اسے پیٹھ پر لاد لیا اور
ندی کے پار جانے کے لئے ہاتھ پیر چلانے لگا۔ تیرتے ہوئے آہستہ آہستہ دوسرے کنارے
کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی جیل کے سائرن نے چونکا دیا۔

''انھیں ہمارے فرار کی خبر ہو چکی ہے۔'' میں نے کہا۔



''بس اسٹینڈ کی طرف دوڑو۔'' جیون نے مشورہ دیا۔

''نہیں، تم سب جیل کے کپڑوں میں دور سے پہچان لیے جاؤ گے۔ میں نے ابڑو کو
پیٹھ سے اتارتے ہوئے کہا۔'' میں نے ایک جگہ دیکھ رکھی ہے۔ وہاں پہنچ کر کپڑے تبدیل کر
لینا۔ پھر صبح کی بس سے تمھیں روانہ کر دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ابڑو اور فاروق کی
بیڑیوں کو کھینچ کر توڑا۔ اور پھر انھیں لے کر سڑک کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔

''ونودا!'' جیون لال نے کہا۔ ''سڑک کی ناکہ بندی کر دی گئی ہوگی ادھر خطرہ ہے۔''

''پھر بھی تم بس اسٹینڈ کی جانب جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔'' میں نے کہا۔

''میری عقل خبط ہو گئی تھی۔''

''تو پھر میری عقل پر بھروسا کیے جاؤ۔'' کہتے ہوئے میں نے سڑک کراس کر لی۔
دوسری جانب نوتن پاڑا تھا۔ میرے قدم انیل کی جھگی کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اس کے
دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ پتول سامنے کھڑی تھی۔ مجھے
دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ڈھیروں شکوے تھے۔ میں نے اسے
سامنے سے ہٹاتے ہوئے تینوں کو اندر آ جانے کا اشارہ کیا۔ ان کے اندر آتے ہی میں نے
پتول سے کہا۔

''تمھارے پاس روپے تو ہوں گے؟''

پتول نے جواب دیا۔ ''ہاں!''

میں نے کہا۔ ''فوراً بازار سے چار جوڑے پینٹ شرٹ یا کرتا دھوتی لے آؤ۔''

''ابھی لائی۔'' کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے جیون سے کہا۔ ''تم بارڈر کراس کرا سکتے ہو؟''

''ہاں، کیوں نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تب تم صبح سویرے ہی ان دونوں کو لے کر نکل جاؤ۔''

''کیوں تم نہیں جاؤ گے۔'' فاروق نے پوچھا۔

''نہیں مجھے کچھ کام ہے۔ جڑوں کو قطع کرنا ضروری ہے نا؟''

''ہم تینوں ساتھ رہیں گے۔'' ابڑو نے کہا۔

''نہیں میں کچھ آدمیوں کی لسٹ دے رہا ہوں۔ تمھیں ان کا باجا بجانا ہے۔''

ابڑو نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ فٹافٹ نام پتا دو۔''

''پتول کو آنے دو، قلم کاغذ اسی کے پاس ہے۔''

''یہ ہے کون؟''

''قسمت کی ماری ہے۔''

''کہیں یہ بے چاری تو نہیں ہے؟'' ابڑو نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، اس کے بھائی انیل سے بھی تمہیں وہاں نمٹنا پڑے۔''

''اب سمجھا! تم نے خوب جگہ تلاش کی ہے۔ چراغ کے نیچے اندھیرا رہتا ہے۔ اس اندھیرے کا تم نے فائدہ اٹھایا ہے۔''

جیون لال ہماری باتوں کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اسی لئے میں نے باتوں کا رخ موڑ دیا۔

''کیوں جیون کام ہو جائے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، کل ہی انھیں بارڈر کراس کرادوں گا صبح کی بس سے سکدار پاڑا جاؤں گا اور پھر وہاں سے بوگ مارا۔''

''ہاں، یہ صحیح ہے۔ اسی راستے سے ہم آئے تھے۔'' فاروق نے کہا۔

پتول کے آجانے سے باتوں کا سلسلہ رک گیا۔ وہ دھوتیاں اور کرتے لے آئی تھی۔ پتول کو باہر بھیج کر ہم سب نے کپڑے تبدیل کیے۔ پتول نے مچھلی کا سالن بنایا تھا۔ کھانا کم پڑ سکتا تھا اس لئے اس نے چاول چڑھا دیے تھے۔ وہ چولھے کے پاس بیٹھی تھی میں بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''انیل کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو ڈھاکا چلے گئے۔ یہاں خطرہ تھا۔ کوئی بھی انھیں پہچان سکتا تھا۔ پھر اتنی اچھی نوکری بھی اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔ وہاں ان کا خرچ تنظیم اٹھائے گی اور یہاں مجھے تین سو روپے ماہوار ملیں گے۔''

''جاتے وقت مجھے تلاش تو نہیں کر رہا تھا۔''

''ان کا خیال تھا کہ آپ کی پارٹی جا چکی ہے۔''

''میرا جانے کا ارادہ نہیں۔''

''میں پہلے ہی جانتی تھی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔



اس کے لہجے میں چھپی خوشی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ آنکھوں کی گہرائی میں مچلتے طوفان کو چھپا نہیں پائی تھی۔ اس کے دل میں مچی ہلچل کو محسوس کرتے ہی میرے اندر پھریری سی دوڑ گئی۔ میں گھبرا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

''کہاں چلے؟'' پتول نے پوچھا۔

''کاغذ قلم کہاں ہے؟''

''دیتی ہوں۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بکس سے کاپی قلم نکال کر مجھے دے دیا۔

میں باہر نکل آیا مگر آتے آتے ابڑو کو اشارا کیا تھا۔

وہ بھی باہر آ گیا۔

''تم سندھی میں چند خاص نام لکھو تاکہ اگر پکڑے بھی جاؤ تو آسانی سے کوئی پڑھ نہ سکے۔'' میں نے کہا۔

''بتایئے؟'' اس نے کاپی قلم سنبھال لیا۔

میں نے انجمن قرآن و سنت کے ان عہدیداران کے نام لکھوائے جو ایجنٹ تھے۔ نام لکھنے کے بعد ابڑو نے پوچھا۔ ''صدر اور سیکرٹری کے نام کیوں نہیں لکھوائے؟''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ان بے چاروں کے فرشتے بھی نہیں جانتے ہوں گے کہ وہ امارا بنگالی کی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ ایجنٹوں کو عہدے نہیں چاہئیں وہ تو اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں اور جذبات بھڑکا کر اپنا اُلو سیدھا کر لیتے ہیں۔ خیر آگے لکھو۔'' پھر میں نے انجمن عندلیب نبی اور انجمن شیعان علی کے جعلی ارکان کے نام لکھوائے۔

فہرست مکمل کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''وہاں پہنچتے ہی ان سب کی کڑی نگرانی شروع کر دینا۔ ضرورت پڑے تو محکمہ خفیہ کے اعلیٰ عہدیداروں سے مل کر میرا نام بتانا اور فہرست انھیں دے دینا۔ وہ خود ہی ان سے سمجھ لیں گے۔''

''صحیح ہے۔'' کہہ کر اس نے کاغذ کو تعویذ کی طرح ایک چھوٹے سے کپڑے میں لپیٹا اور اپنے بازو پر باندھ لیا۔

اسی وقت پتول نے دروازے پر آ کر پوچھا۔ ''بھات نہیں کھائیں گے؟''

''کھانا نکالو۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھات نکال چکی ہوں۔ وہ دونوں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''چلو بھئی۔'' میں نے ابڑو سے کہا۔

"بھوک سے ہماری جان جارہی ہے اب آ بھی جاؤ۔"

فاروق نے آواز دی۔ ہم دونوں جا کر بیٹھ گئے۔

کھانا کھا کر ہم چاروں باہر برآمدے میں آ گئے۔ پتول نے لمبا سا بستر بچھا دیا۔ ہم چاروں لیٹتے ہی نیند کی وادی میں پہنچ گئے۔ میری آنکھ کھلی تو پتول کے جھنجوڑنے پر۔ میں نے آنکھیں کھولتے ہی پوچھا "کیا ہوا؟"

"وہ شری کانت جیپ لے آیا ہے۔"

میں نے ہی رات کو برابر والی جھگی کے ڈرائیور سے کہا تھا کہ وہ جیپ پر میرے چند دوستوں کو جولنگی تک پہنچا دے۔

سکدار پاڑا جولنگی کے راستے میں تھا۔ پہلے سے بارڈر کا نام لیا نہیں تھا۔ جیوں لال کو سمجھا دیا تھا کہ وہ راستے میں اتر جائے۔ اسے میں نے پچاس روپے رات ہی کو دے دیے تھے۔ اسی وجہ سے وہ صبح ہی صبح پہنچ گیا تھا۔ میں نے پتول سے کہا "جا انھیں بھی اٹھا دے۔"

اس نے جواب دیا۔ "وہ سب تیار بیٹھے ہیں۔"

میں بھی اٹھ کر جیپ کے پاس آیا۔ ابڑو اور فاروق کے چہرے پر غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اکیلے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے لیکن ڈھاکا میں ان کی ضرورت تھی اس لئے انھیں مجبوری کی ڈور کھینچے لیے جا رہی تھی۔ ان کے جاتے ہی میں اٹھ کر کمرے میں چلا آیا اور پھر لمبی تان کر سو گیا۔

"میری آنکھ لگی ہی تھی کہ مجھے احساس ہوا جیسے میرے بالوں میں کچھ رینگ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ پتول میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کی لمبی لمبی گوری انگلیاں میرے بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ مجھے اپنے جسم میں سرسراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ رگوں میں چنگاریاں سی دوڑنے لگیں اور پورا جسم تپنے لگا۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے ہی والا تھا کہ میرے اندر کے آدمی نے للکارا۔ "بے غیرت! اپنے آپ کو سنبھال، تُو مسلمان ہے۔ گناہ میں ڈوبنا تیری شان نہیں ہے۔"

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"دل کا کہا پورا کر رہی ہوں۔"

"یہ پاپ ہے۔ میں اسے پسند نہیں کرتا۔" کہتے ہوئے میں باہر نکل آیا۔ میرے



کندھے پر تولیہ تھا اور میرا رخ دریا کی جانب تھا۔ میں نے اپنے تپتے ہوئے بدن کو دریا میں غوطے پر غوطہ دے کر ٹھنڈا کرنا چاہا۔ اس غدار گنگا میں جسے پار کرنے کی للک میں نواب سراج الدولہ انگریزوں کے چنگل میں پھنس گئے تھے، پلاسی کی جنگ میں میر جعفر کی غداری نے انھیں پسپا ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ میر مدن کے مشورے پر واپس مرشدآباد آئے اور بیگم کو ساتھ لے کر مونگیر جانے کے لئے نکل پڑے۔ انھوں نے فقیروں کا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ بیگم بھی خادمہ کا پھٹا پرانا برقع پہنے تھیں۔ وہ دونوں بھاگتے ہوئے اسی گنگا تک آئے اور پار جانے کے لئے مانجھی (ملاح) سے منتیں کرنے لگے۔ ملاح نے معاوضہ مانگا ان کے پاس روپے تھے نہیں۔ انگلی سے انگوٹھی نکال کر دینے لگے۔ ملاح نے انگوٹھی دیکھی اور پھر اس کی نگاہ بیگم کے جوتے پر پڑی۔ پھٹا ہوا برقع اور اتنا قیمتی جوتا! وہ سمجھ گیا کہ نواب اور بیگم بھاگ رہے ہیں۔ اس نے فوراً انگریزوں کو خبر دی اور انھیں کشتی میں بٹھا کر گنگا کے درمیان لے گیا۔ منجدھار میں اس وقت تک کشتی کو پھنسائے رہا جب تک کہ انگریز سپاہی نہ آ گئے۔ میں نہاتے ہوئے نواب سراج الدولہ کے ہی بارے میں سوچتا رہا تا کہ ذہن کا رخ مڑ سکے۔

کچھ دیر میں دماغ پر چھایا تناؤ ختم ہو گیا تو میں لوٹ آیا۔

"کھانا نہیں کھاؤ گے؟" مجھے دیکھتے ہی پتول نے کہا۔

"لگا دو۔"

اس نے کھانا لگا کر مجھے آواز دی۔

ہندو بنگالیوں کا قاعدہ ہے کہ وہ کھانا باورچی خانے میں کھاتے ہیں۔ پہلے زمین کو لیپا جاتا ہے، پھر دو مکعب فٹ کا تختہ رکھ کر آواز دی جاتی ہے کہ کھانا لگ گیا۔ کھانے والا آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے اور گلاس سے چلو میں پانی لے کر پلیٹ کے چاروں جانب زمین پر چھینٹا مارتا ہے پھر کھانا شروع کرتا ہے۔ مجھے تو اس طرح کھانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ میں نے پالتھی مار کر کھانا شروع کر دیا اس نے رکابی میں سالن ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمھارے وہ دونوں دوست مسلمان تھے کیا؟"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"انھیں بھات کھانے کا طریقہ بھی نہیں معلوم۔ وہ مسلمانوں کی طرح کھاتے تھے۔ نہ جل چھڑکتے تھے اور نہ پالتھی مار کر بیٹھتے تھے۔"

"بے چارے زندگی بھر ہوٹل کا کھانا کھاتے رہے اسی لئے اپنی ثقافت کو بھول

گئے۔‘‘

میں نے کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ جیون لال لوٹ آیا۔

اسے دیکھتے ہی پتول نے دوسرا تختہ بچھا دیا۔ وہ بھی ہاتھ پاؤں دھو کر باورچی خانے میں آ گیا۔

میں نے نوالہ چباتے ہوئے پوچھا ’’ان دونوں نے بارڈر کراس کر لیا تھا؟‘‘

’’ہاں، سکدار پاڑے میں میرا ایک دوست ہے۔ اسے میں نے فی کس پچاس روپے دے کر کہا وہ انھیں بھیٹرمارا تک پہنچا کر راج شاہی کی ٹرین میں بٹھا دے۔‘‘

’’کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہوگی۔‘‘

’’نہیں یار مجھ پر بھروسہ رکھ۔ تُو نے مجھے آزادی دلائی ہے۔ میں تیرے ساتھ غداری کروں گا کیا؟‘‘

میں نے جواب نہ دیا اور خاموشی سے کھانے میں مشغول رہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے کہا ’’چل، بیل تلہ چلتے ہیں۔ میری ماں تجھے ڈھیروں دعائیں دے گی۔ اپنی بیوی سے بھی تجھے ملواؤں گا۔ تُو اسے دیکھے گا تو بس دیکھتا رہ جائے گا۔ پتول سے بھی زیادہ سندر ہے میری بیوی۔‘‘

پتول نے اٹھلا کر کہا۔ ’’واقعی؟‘‘

اس نے جواب دیا۔ ’’تُو عورت ہے اور ایک عورت دوسری عورت کو کبھی اپنے سے زیادہ خوبصورت نہیں سمجھتی مگر یقین کر تُو بھی اسے دیکھ کر تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے گی۔ خوبصورتی اس پر آ کر ختم ہو گئی ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ تُو ایک بار مجھ سے ملانے ضرور لائے گا؟‘‘

’’وعدہ رہا۔ ضرور لاؤں گا۔ اب چلو۔‘‘

’’لیکن جیون! ہماری تلاش ہو رہی ہوگی۔ ایسے وقت میں باہر نکلنا مناسب ہے؟‘‘

’’ہاں ہاں، فکر کی کوئی بات نہیں۔‘‘ وہ بولا

’’تم بہادر ضرور ہو مگر تمھاری عقل کم ہے۔ جیل سے چار چار قیدی بھاگ جائیں۔ اتنی بڑی بات کو اعلیٰ حکام آسانی سے برداشت نہیں کریں گے۔ جیل کے تمام اسٹاف کو سسپنڈ کر دیا جائے گا۔ اسی لئے جیلر نے اس خبر پر پردہ ڈال دیا ہوگا۔ کچھ دن صبر سے کام لو۔ جیل میں پہلے بیماری کا اندراج ہوگا پھر ہمیں مرا ہوا لکھ کر فائل بند کر دی جائے گی؟‘‘



’’اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟‘‘

’’ایسا ہی ہوگا۔ جیل کے ایک افسر سے ملاقات ہو گئی تھی۔ اسے میں برابر رشوت دیتا رہتا تھا۔ اسی نے بتایا تھا۔‘‘

’’لیکن تم تو غریب تھے۔ رشوت لاتے کہاں سے تھے؟‘‘

’’بازوؤں کی طاقت سے دوسرے قیدیوں سے بھتا لیتا تھا۔‘‘

’’گھر سے جدا ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا؟‘‘

’’تین سال۔‘‘ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

’’ہم دونوں بس اسٹینڈ پہنچے اور بیل تلہ کے لئے بس پر سوار ہو گئے۔ آدھے گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ جیون نے اپنے چہرے پر گمچھا لپیٹ رکھا تھا اور یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اس کے دانت میں درد ہے۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔

’’وہ رہا میرا گھر!‘‘ اس نے اشارہ کیا۔

انسان اپنی مٹی سے جڑا ہوا ہے۔ گھر نزدیک آتے ہی قدم تیز ہو جاتے ہیں۔ اس کے قدم بھی تیزی سے اٹھنے لگے۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھلا۔ ایک ضعیف العمر عورت سامنے کھڑی تھی۔ وہ جیون داس کو دیکھتے ہی لپٹ گئی۔

’’آہستہ، شور مت کرو۔‘‘ جیون اسے خاموش کراتے ہوئے اندر لے گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی تھا۔ وہ ماں کو سمجھا رہا تھا۔ ’’شور کرو گی تو محلے والے جان لیں گے کہ میں آیا ہوں۔ یہاں کے سب لوگ جانتے ہیں کہ مجھے عمر قید کی سزا ہوئی ہے۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی تو غضب ہو جائے گا۔‘‘ وہ ماں کو لے کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولا ’’کنک لتا نظر نہیں آ رہی؟‘‘

ماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ’’بیٹا! میں نے تجھ سے بہت سی باتیں چھپا لی تھیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تُو جیل میں گھٹ گھٹ کر مر جائے۔‘‘

’’کیوں، ایسی کون سی بات تھی؟‘‘ جیون نے پوچھا۔

’’بیٹا! ہم غریب ہیں اور غربت سب سے بڑی لعنت ہے۔ طاقتور کو بھی کمزور کے سامنے جھکا دیتی ہے۔ مرنے والے کا بھائی دولت مند ہے۔ دولت کے گھمنڈ میں چور ہے۔ تیرا بدلہ اس نے کنک لتا سے لیا۔‘‘

’’کیا اسے ختم کرا دیا؟‘‘ جیون نے پوچھا۔

"اگر اسے ایک بار موت آ جاتی تو اچھا تھا۔ اسے ہر روز موت کی سزا ملتی ہے۔ تیرے جیل جانے کے ایک ماہ بعد اس نے کنک لتا کو گھر سے اٹھوا لیا۔ میں نے بہت دوڑ دھوپ کی، تھانے جا کر ایک ایک کے آگے گڑگڑائی لیکن سب کے منہ پر دولت کا قفل لگ گیا تھا۔ کنک لتا کو اس نے ایک سال تک خود سزا دی پھر اسے سزا کے لئے دوستوں کے سامنے پیش کرنے لگا اور آج کل اس کے نوکر اسے سزا دے رہے ہیں۔"

"میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" جیون کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں۔

"نہیں بیٹے! اب تُو اس سے مت ٹکرا۔ وہ بہت طاقت والا ہے اس نے مجھے بلوا کر ایک بار کہا تھا۔ "اسی کنک لتا کی وجہ سے میرا بھائی مرا۔ اسے آخری سانس تک سزا دیتا رہوں گا۔" اسے بھول جا میرے بیٹے! رد بلا کے لئے بھکیچھا (صدقہ) دیا جاتا ہے۔ وہ تیرا صدقہ ہے۔ تیری سلامتی کے لئے تجھ پر سے دس کنک لتا وار سکتی ہوں۔"

"نہیں ماں! میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ سوچا تھا، تجھے اور کنک کو لے کر کلکتہ چلا جاؤں گا' لیکن اب میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے۔ اسے سزا دینا۔" جیون لال نے کھڑے ہو کر کہا۔

کنک لتا کو میں نے نہیں دیکھا تھا پھر بھی اس پر ترس آنے لگا۔ میں نے جیون لال سے پوچھا۔ "کنک لتا آ جائے تو اسے رکھو گے؟"

"ہاں!" اس نے جواب دیا۔

"تم مجھے اس بدمعاش کا پتا بتاؤ میں لاؤں گا کنک لتا کو۔" میں نے کہا۔

"تُو بھی کسی کا بیٹا ہے۔ تجھے بھی خطرے میں جانے نہیں دوں گی۔" ضعیفہ بولی۔

اس دن مجھے ماننا پڑا تھا کہ ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ نہ وہ ہندو ہوتی ہے اور نہ مسلمان۔ میں نے ماں کو تسلی دی۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے لے آؤں گا۔ جب جیل سے جیون کو نکال لایا تو اس کے گھر کی چار دیواری مجھے کیا روکے گی۔"

"ٹھیک ہے، مجھے تم پر اعتماد ہے کہ تم کامیاب لوٹو گے۔" جیون نے مجھ سے کہا اور پھر ماں سے بولا۔ "کنک کی تصویر انھیں دے دو۔"

ماں نے ٹین کی پیٹی سے ایک تصویر نکال کر مجھے تھما دی۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا۔ واقعی کنک لتا اپنی مثال آپ تھی۔ ایسے حسن کے لئے تو جنگیں لڑی جا سکتی ہیں۔ میں نے تصویر کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا اس ذات شریف کا حدود اربعہ بھی بتا دو۔"



"جس جگہ ہم بس سے اترے تھے، وہیں ایک عالی شان کوٹھی دیکھی ہوگی۔ گیٹ پر وں جانب دو شیر بنے ہوئے ہیں۔ اسی کوٹھی میں گنگولی رہتا ہے۔ اسی نے میری کنک کو قید کر ما ہے۔"

"تم میرا انتظار کرو میں ایک گھنٹے میں اسے لے کر آ جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نکل گیا۔

میرے قدم بس اسٹاپ کی جانب اٹھ رہے تھے۔ مجھے اپنے اندر طوفان کی ڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں اسی طوفان میں گنگولی کو اڑا دینا چاہتا تھا۔ اس کے ناپاک ود کو غرق کر دینا چاہتا تھا۔ اندر ہی اندر کھولتا ابلتا ہوا اس کوٹھی تک پہنچ گیا۔ باہر دو چوکیدار ڑے تھے۔ ان کی کمر سے گوکھری لٹک رہی تھی۔ وہ ہتھیار میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا پھر بھی ں نے خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا اور عمارت کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس جانب نوکروں ے کوارٹر تھے۔ چاروں جانب گھوم کر میں نے جائزہ لیا۔ کوٹھی میں خاصی چہل پہل تھی۔ کروں کی پوری فوج تھی۔ دن کے وقت کنک لتا کو نکالنے سے خاصا شور وغل ہو سکتا تھا۔ یہ وٹا موٹا گاؤں نہیں تھا۔ بھرا پرا شہر تھا پولیس تھانہ بھی نزدیک تھا۔ میں اکیلا کس کس سے مقابلہ رتا، اسی لئے میں لوٹ آیا۔ مجھے اکیلا دیکھ کر جیون لال نے پوچھا۔ "ہمت ہار بیٹھے؟"

"نہیں، اسے آزاد کراؤں گا لیکن جوش سے نہیں، ہوش سے کام لوں گا۔ عقل کا اضہ ہے کہ دن میں خطرہ مول نہ لوں، رات کو دیکھا جائے گا۔"

"میرے صبر کو نہ آزما، میرے اندر طوفان اٹھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں پھٹ وں۔"

"نہیں میرے یار! مجھ پر بھروسا کر، میں تیری بیوی لا کر دم لوں گا۔ یہ وقت مناسب یں ہے غلط قدم کنک کی زندگی پر بھی اثر انداز ہو سکتا ہے۔ پھر رات ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے پانچ بج ہی چکے ہیں۔ دو تین گھنٹے اور انتظار کر لو۔"

"اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ اپنے آپ کو شیر کہا کرتا تھا لیکن اندر سے گیدڑ ہوں۔ ں بزدل ہوں بزدل۔"

"نہیں میرے دوست! شرافت کو بزدلی کا نام نہ دو۔ میں تمھارے جذبات سمجھ رہا ں اسی لئے تمھیں آگ میں کودنے سے روک لیا ہے۔ یہ وقت جوش دکھانے کا نہیں، ہوش ے کام لینے کا ہے۔"

''میری دنیا اندھیر ہو چکی ہے۔ تم ہی روشنی کی ننھی سی کرن ہو۔ کچھ کرو۔''

اسے جذبات میں پاگل ہوتے دیکھ کر میں نے سوچا، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جلد بازی میں کوئی غلط قدم اٹھالے۔ جذبات اندھے ہوتے ہیں۔ عقل پر پردہ ڈال دیتے ہیں، یہی سوچ کر میں نے اس کی کنپٹیوں پر انگلی رکھی اور دباتا چلا گیا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کٹے ہوئے شہتیر کی طرح لڑھک گیا۔ اسے بستر پر لٹانے کے بعد میں نے آواز دی۔ ''ماں! یہاں آیئے۔''

''جیون لال کی ماں آنکھیں پونچھتی ہوئی باہر والے کمرے میں چلی آئی۔

''ماں! یہ سو گیا ہے۔ اسے اٹھایئے گا نہیں ورنہ یہ پھر شور کرے گا۔ میں جا رہا ہوں۔ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھانا ہے۔''

''جاؤ میرے بیٹے! بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔'' بڑی بی نے دعا دی۔

☆======☆=====☆



میں باہر نکل کر ادھر اُدھر گھومتا رہا پھر گھڑی میں وقت دیکھا سات بج رہے تھے۔ وقت گزاری کے لئے میں پھر مٹر گشت کرنے لگا کہ میری نظر ایک سینما پر پڑی اور میں ٹکٹ لے کر اندر بیٹھ گیا۔ فلمیں دیکھنا مجھے کبھی پسند نہیں تھا لیکن مجبوری کی ڈور مجھے سیٹ سے باندھے ہوئے تھی۔ بنگلہ فلمیں عام طور سے غمناک ہوتی ہیں۔ رونے دھونے والے مناظر نے میرے اندر مزید دھواں بھر دیا۔ گیارہ بجے فلم ختم ہوئی۔ سینما ہال سے نکل کر میں نے پیدل ہی گنگولی کے گھر کی جانب بڑھنا شروع کر دیا گیٹ پر دو چوکیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے کیبن سے نکلنے والی روشنی کی لکیر دور تک پھیل رہی تھی۔ میں نے صبح ہی دیکھ لیا تھا عمارت کے عقب سے اندر داخل ہونا نسبتاً آسان تھا۔ میں اسی جانب پہنچ گیا۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں نے اچک کر منڈیر پکڑ لی اور اپنے ہاتھوں پر وزن ڈالتے ہوئے آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر دیوار پر پیٹ کے بل سیدھا سیدھا لیٹ گیا۔ کچھ دیر اندر کی سن گن لی اور پھر آہستہ سے نیچے لٹک گیا۔ زمین سے پیر چھوتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔ عمارت کے نزدیک پہنچتے ہی میری سماعت سے برجو مہاراج کے مشہور ریکارڈ کی جھنکار ٹکرائی۔ برجو مہاراج کی ترتیب دی ہوئی کتھا کلی ناچ کی موسیقی کا ریکارڈ صرف ہندوستان میں ہی نہیں ہمارے ملک میں بھی اپنی ثقافت کے دشمنوں میں مقبول تھا۔ موسیقی روح کی غذا ہے پھر بھی مجھے اس ملک کی ہر چیز سے نفرت ہے کیوں کہ وہ ہماری جڑیں تراشنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے میں نے نفرت سے ناک سکیڑی اور اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ میری نگاہ گندے پانی کے پائپ پر پڑی اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے پائپ کے سہارے چھت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اوپر پہنچ کر سیڑھی سے پہلی منزل پر اترا۔ قطار در قطار کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں نے پہلے کمرے میں جھانکا۔ اندر اندھیرا تھا دوسرے اور تیسرے کمرے کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک کمرے سے دبی دبی سرگوشی ابھری۔ میرے قدم رک گئے۔ نسوانی سسکاری نے مجھے متوجہ کر لیا تھا۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا وہ اندر سے بند تھا پھر میں نے کھڑکی پر دباؤ ڈالا۔

وہ بھی بند تھی۔ یکا یک میری نگاہ دروازے کے اوپر بنے روشندان پر پڑی۔ آپ نے بھی
ہوگا کہ پرانی طرز کی عمارتوں کے روشن دان کافی بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ وہ روشندان
مددگار بن سکتا تھا لیکن اس تک پہنچنا دشوار تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کوئی بھی اونچی چیز
آئی جس پر چڑھ کر میں روشندان تک پہنچ سکتا۔ مایوس ہو کر نیچے کی سمت بڑھنا چاہتا تھا کہ
سیڑھی کے پاس ایک بانس رکھا نظر آ گیا۔ میں نے پروردگار کا شکر ادا کیا اور اسے لے کر
دان کے پاس پہنچا۔ بانس کو ترچھا کر کے سامنے والی دیوار کے نچلے حصے میں پھنسایا اور
جیسی پھرتی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا اتنا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی
دے رہا تھا۔ میں نے چھپکلی کی طرح رینگتے ہوئے روشن دان کو پار کیا اور اندر کی جانب
گیا۔ میری عجیب حالت تھی۔ میں نے پیروں کو روشن دان میں پھنسا رکھا تھا اور ہاتھوں کو
کے فرش چھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بانس جیسا لمبا تو تھا نہیں کہ فرش چھو لیتا۔ اس
ہتھیلی چوڑی کر کے روشن دان سے پیر نکال لئے۔ فرش دو فٹ کی دوری پر تھا۔ ہتھیلی ہلکے
دھماکے کے ساتھ فرش پر لگی اور پیر دیوار سے ٹکراتا ہوا نیچے کی جانب پھسلا۔ پھسلتا ہوا پیر
بورڈ سے ٹکرایا اور بلب جل اٹھے۔

"کون ہو تم؟" زنانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو
نگاہیں جھک گئیں۔

"کون ہو تم؟" مرد کی آواز سنائی دی۔

"میں نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ چادر لپیٹ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔ جیون لال نے گنگولی کا حلیہ بتایا تھا لیکن وہ
جیسا نہیں تھا۔ گنگولی بھاری تن و توش کا تھا اور وہ شخص منحنی تھا۔ میں نے اس کا جائزہ لینے
بعد عورت کو دیکھا۔ وہ دیکھنے میں بڑی پیاری تھی۔ جوانی اس کے انگ انگ سے پھوٹ
تھی۔ یکا یک میری نگاہ اس کی پشت کی دیوار پر لگے فریم پر پڑی۔ فریم میں اس عورت کی
جڑی تھی۔ اس کے ساتھ یقیناً گنگولی تھا۔ میں نے عورت کے دھواں دھواں چہرے پر
جماتے ہوئے کہا۔ "تصویر میں تمھارے ساتھ گنگولی ہے نا؟"

عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ڈرو نہیں، میں تو گنگولی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اس سے مجھے حساب بے باق
ہے۔ وہ ہے کہاں؟" میں نے پوچھا۔



"نیچے کے آخری کمرے میں ہوں گے دوستوں کی محفل جمی ہے آج۔" عورت نے
جواب دیا۔

"اس لڑکی کو پہچانتی ہو؟" میں نے کنک لتا کی تصویر دکھائی۔

"ہاں، یہ بھی وہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، میں جا رہا ہوں تم دروازہ بند کر لو۔ اسے کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن اگر
نیچے اتریں تو بتا دوں گا۔"

"دھنیہ واد" کہتے ہوئے مرد نے دروازہ بند کر لیا۔

میں نے مرد کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس لئے کہ جانتا تھا
جیسا کرو گے ویسا پھل ملے گا۔ اچھائی کرو گے، اچھائی ملے گی۔ برائی کرو گے، برائی ملے گی۔
گناہ کے ہزار پیر ہوتے ہیں تم اپنے لئے اس کا دروازہ کھولو گے تو وہ پورے معاشرے کو جکڑ
لے گا۔ کسی کے گھر کی طرف نگاہ اٹھاؤ گے تو دوسرا تمھارے گھر کی طرف ہاتھ بڑھا دے گا۔ اس
کا ثبوت گنگولی کا گھر تھا۔ میں نے گنگولی پر لعنت بھیجی اور سیڑھیوں سے نیچے اترتا چلا گیا۔

میرے قدم اس کمرے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں سے ریکارڈ بجنے کی آواز
آ رہی تھی۔ وہی کمرا آخری تھا۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا لیکن وہ نہ کھلا۔ اسے
بند دیکھ کر میں کھڑکی کو آزمانے کی ٹھانی لیکن کھڑکی کے نزدیک پہنچتے ہی امیدوں پر پانی پھر گیا۔
رنگین شیشہ جڑی کھڑکی میں سلاخیں لگی تھیں۔ نیلے شیشے سے اندر کا منظر دکھائی دینا ناممکن تھا۔
اس لئے میں دروازے میں جھری تلاش کرنے کے لئے مڑا لیکن مڑتے مڑتے رک گیا۔
کھڑکی کا سب سے اوپری شیشہ چٹخا ہوا تھا۔ میں نے اس معمولی سے سوراخ سے جھانکا اور
اندر بیٹھے آدمیوں کی تعداد معلوم کرنا چاہی لیکن اندر کا منظر دیکھتے ہی میرا سر شرم سے جھک گیا۔
رقص کرنے والی عورت کو میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ کنک لتا تھی لیکن اس کی درگت نے میری
رگوں میں لاوا بھر دیا۔ اندر پانچ چھ انسان نما درندے بیٹھے تھے ان کا ساتھ دینے والیاں بھی نظر
آ گئی تھیں۔ سب کے سب رقص دیکھنے میں محو تھے۔

اندر کے منظر نے میرے لہو کو گرما دیا تھا۔ غصے کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ عورت ماں
ہے، بہن ہے، بیٹی اور بیوی ہے۔ اس کا ہر رشتہ مقدس ہے۔ اس کی تذلیل مجھ سے دیکھی نہ گئی۔
میں نے ان انسانی درندوں کو سزا دینے کی ٹھان لی اور دروازے کی جانب بڑھا۔ شیشم کی لکڑی
سے بنے دروازے کا بھرپور نظروں سے جائزہ لیا اور پھر پوری قوت سے لات ماری۔ خاموش

رات میں صرف گراموفون کے ریکارڈ کی سریلی آواز گونج رہی تھی۔ آواز کے ساتھ تال م
رقص کرتی کنک لتا کے رقص میں محو لوگوں کی سماعت سے دروازے کی ٹکر بم کے دھماکے کی ط
ٹکرائی اور دروازہ کھل گیا۔ وہ سب اچھل پڑے کنک لتا بھی تھم کر کھڑی ہوگئی تھی۔ پالنے وا
نے جنگلی حکیم کو وسیلہ بنا کر مجھے طاقت کا سرچشمہ بنا دیا تھا۔ مجھ میں ہاتھیوں ایسی طاقت آ
تھی۔ وہاں بیٹھے رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہونے والے لوگ عیاش طبع تھے اور ع
انسان کو دیمک بن کر چاٹ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے شمشیر و سناں
رشتہ جوڑے رکھا، دنیا ان کے آگے سر جھکائے رہی مگر جب انھوں نے اقتدار اور طاؤس
رباب سے رشتہ استوار کیا تو بری طرح پٹ گئے۔ ... مسلمانوں جیسی شجاع قوم پٹ سکتی
بننے کی حیثیت کیا ہے، وہ سب تھر تھر کانپنے لگے۔ ان کی ساتھی لڑکیوں میں سے کسی نے فرش
بچھی چاندنی اوڑھ لی اور کسی نے اِدھر اُدھر بکھری ساڑھیوں کو لپیٹ لیا۔ میں نے ان مظ
لڑکیوں سے کہا "تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کنک لتا کو آزاد کرانے اور گنگولی کو
دینے آیا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ آج گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسیں گے۔"

کنک لتا اپنا نام سن کر چونک گئی۔ اس نے ساڑھی کی کونچی کو کھونستے ہوئے

"آپ کون ہیں؟ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"تعارف بعد میں ہوگا۔ ذرا میں اس سے نمٹ لوں۔" میں نے گنگولی کی طر
بڑھتے ہوئے کہا۔

"اے اے خبردار! رک جاؤ" گنگولی زنخوں کی طرح ہاتھ نچا کر چیخا۔

"چپ بے زنخے!" کہتے ہوئے میں نے اس پر چھلانگ لگا دی لیکن مجھے را
میں ہی کسی نے روک لیا اور میں پٹ سے زمین پر گر پڑا۔ دراصل دروازے کے ٹوٹنے کی آ
نے چوکیداروں کو متوجہ کر لیا تھا۔

ہندوستان میں سو سے زیادہ قومیں بستی ہیں لیکن ان میں صرف تین قوموں کو جنگجو
گیا ہے۔ مسلمانوں میں پٹھان، غیر مسلموں میں سکھ اور گورکھے۔ نیپال کے باسی گورکھا
میں بہادری اور مالک سے وفاداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ چوکیدار بھی گورکھے تھے
انھوں نے مجھے چھلانگ لگاتے دیکھ کر اپنے ڈنڈوں کو سیدھا کر دیا تھا اور میں الجھ کر گر پڑا تھ
فرش پر گرتے ہی میں نے لوٹ لگا دی ورنہ گورکھا چوکیداروں کے ڈنڈے میرے سر کو خربوز
کی طرح پھاڑ دیتے۔ مجھے اپنی زد سے دور جاتے دیکھ کر وہ پھری میری جانب لپکے لیکن



ا۔ اچھل کر کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ کی مٹھیاں سیدھی کر دیں۔ وہ تیز رفتاری سے میری
دوڑے تھے۔ نتیجتاً میری مٹھیاں مکے بن کر دونوں کے سینے میں لگیں۔ وہ دونوں بیٹھتے
ے۔ میں ان دونوں کو دیکھ رہا تھا کہ تیسرے گورکھے نے ڈنڈے سے میری پیٹھ پر وار کیا۔
ی سانپ کی طرح میں پلٹا میرا ہاتھ مشینی انداز میں گھوما لیکن وہ بھی بلا کا پھرتیلا تھا۔
دور ہٹ گیا۔ میں اپنے آپ کو ڈگمگانے سے روک کر حملے کے لئے تیار کر ہی رہا تھا کہ
، چھلانگ لگا دی۔ اس کی زد سے بچنے کے لئے میں نے بھی چھلانگ لگائی لیکن اس کی
نے مجھے مات دے دی۔ اس کا ڈنڈا پوری قوت سے میری کمر پر پڑا تھا، میری جگہ کوئی اور
مر پکڑ کر بیٹھ جاتا لیکن میں چوٹ کی پروا کیے بغیر اس پر چڑھ دوڑا۔ یہی غلطی تھی جنگ
نہیں ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا سی چوک نقشہ بدل دیتی ہے۔ اس چُوک کا اس
پور فائدہ اٹھایا۔ ایک تو نیپالی ٹھگنے ہوتے ہیں دوسرے پھرتیلے۔ وہ تو شانے سے بھی
کا تھا۔ اس نے سر جھکا کر جو ٹکر ماری تو میں چاروں شانے چت گر پڑا اور وہ پھرتی سے
سینے پر چڑھ بیٹھا، لیکن میں نے دونوں پاؤں جوڑ کر ٹخنے سے الٹا وار کیا۔ وہ منہ کے بل
ا۔ میں نے پھرتی سے اپنے سر سے اس کے سر پر ٹکر ماری۔ وہ الٹ گیا اور میں کھڑا ہو
نڈا ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی بڑھ گئی
وہ پھرکی کی طرح ڈنڈے کو گھمانے لگا۔ اس وقت اس سے بچنے کا صرف ایک طریقہ تھا
ڈنڈے کی زد سے بچا رہوں۔ ڈنڈے کی ضرب میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی پھر بھی لڑکھڑا
۔ یہ لڑکھڑاہٹ میری شکست بھی بن سکتی تھی۔ اسی ڈر سے میں دور دور رہنے کی کوشش کر
یکا یک مجھے موقع مل گیا اور میں ایک پیر پر کھڑا ہو کر دوسرے پیر کو سیدھا کر کے پنکھے کی
وم گیا۔ موسل کی طرح میرا کھڑا پیر اس ساڑھے چار فٹ کے وجود سے ٹکرایا اور وہ دور
ا۔ میرے لئے بس اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے چٹا گاؤں کے جنگل میں لاشا کا سکھایا ہوا
کے پیر پر آزمایا اس جنگلی دوست نے مجھے سانپوں کی ہڈیاں جوڑ جوڑ سے کھولنا سکھایا تھا
ا اس داؤ کو آدمیوں پر آزما رہا تھا۔ اس گورکھے کے پیروں کے تینوں جوڑ ایک ہی جھٹکے
گئے۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اسے چھوڑ کر میں نے گنگولی کی جانب
لگائی اور یہ میری سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ دو گورکھوں کو میں نے بھلا دیا تھا۔
ں نے ایک ساتھ پوری قوت سے میرے سر پر ڈنڈوں سے وار کر دیا میری آنکھوں
منے ستارے سے ناچنے لگے اور میرا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ غشی چھانے کے

کچھ پل پہلے میں نے کنک لتا کی چیخ سنی تھی پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا۔ ان لوگوں نے مجھے معمولی آدمی سمجھ کر صرف دروازہ بند کرنے پر اکتفا کیا تھا وہ بھول گئے تھے کہ میں ان کے کمرے میں دروازہ توڑ کر گھسا تھا۔ میں نے پہلا کام وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ دروازہ چوکھٹ سے اکھڑ کر دور جا گرا لیکن میں اپنے آپ کو بھی روک نہ پایا کیونکہ میں نے اتنی قوت سے ٹکر ماری تھی کہ دروازے کے ساتھ میں بھی باہر جا گرا تھا۔

ٹکر کے دھماکے نے عمارت کے مکینوں کو ہوشیار کر دیا اور وہ سب دوڑ پڑے۔ دونوں چوکیداروں کے ساتھ دوسرے نوکر بھی تھے۔ گنگولی بھی نظر آیا۔ سب کے ہاتھ میں ڈنڈے تھے۔ مجھ پر تو خون سوار تھا۔ دو گھنٹے پیشتر مجھے سر پر جو ضرب لگی تھی، اس کی ٹیس نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں نے جنونی انداز میں ان پر حملہ کر دیا۔ اس ہوشیاری سے تابڑ توڑ گھونسے برسانے لگا کہ وہ ڈنڈا گھمانا بھی بھول گئے۔ جس پر بھی گھونسا پڑتا، وہ پھر اٹھ نہ پاتا۔ دو چار ہڈیوں کا نذرانہ پیش کر کے لمبا لیٹ جاتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گلیارا زخمیوں سے بھر گیا۔ نوکروں سے نپٹنے کے بعد میں نے اچھل کر گنگولی کی گردن پکڑ لی اور اسے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ''کنک لتا کہاں ہے؟''

''انھیں...... انھیں چھوڑ دیں۔ بھگوان کے لئے چھوڑ دیں۔ میں بتاتی ہوں وہ کہاں ہے۔'' اس کی بیوی نے التجا کی۔

اس شیطان صفت کو چھوڑ دینا انسانیت کی تذلیل تھی پھر میرے سر پر خون سوار تھا۔ وہ عورت ایسی مقدس ہستی کو پامال کرنے والا بدذات تھا۔ اس نے صرف کنک لتا کی زندگی برباد کی ہوتی تو میں اسے چھوڑ دیتا لیکن اس محفل میں دوسری لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا، وہ میں بھی دیکھ چکا تھا پھر میں اسے کیسے معاف کر دیتا؟

میں نے انگلیوں کا دباؤ بڑھا دیا اور وہ گیلے کپڑے کی طرح میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ اسے میں نے زخمیوں پر پھینکا اور پھر اس کی بیوی کا گلا دبوچ لیا۔

''بول، کنک لتا کہاں ہے؟''

''بتاتی ہوں۔'' اس نے میری کلائی پکڑ کر جھٹکنے کی کوشش کی۔

''پہلے بتا۔'' میں نے دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وہ نیچے والے کمرے میں ہے۔''



''میرے ساتھ چل۔''

اسے لے کر میں سیڑھیوں کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

کنک لتا والے کمرے میں پہنچ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا اسے ایک ستون سے باندھ کر کوڑوں سے پیٹا گیا تھا۔ کپڑے تار تار تھے اور جسم لہولہان، وہ بے ہوش تھی۔

''چل اس کی رسی کھول۔'' میں نے حکم دیا۔

وہ مشینی انداز میں اسے آزاد کرنے لگی۔

''بے ہوش عورت کو اٹھا کر کیسے لے جاؤں۔'' اسی سوچ میں تھا کہ اس نے کہا۔ ''کار لے جایئے۔ انھیں ہوش آ گیا تو پھر وہ لڑ پڑیں گے۔''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا شوہر بے ہوش ہے۔

''کار تو ہو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ گیراج میں ہے۔''

''چلو مجھے گیراج کا راستہ دکھاؤ۔'' کہتے ہوئے میں نے کنک لتا کو کندھے پر اٹھا

گیراج میں پہنچ کر میں نے چابی مانگی۔ وہ پھر دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں نے لتا کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

وہ جس تیزی سے گئی تھی اسی تیزی سے لوٹ آئی اس سے چابی لے کر میں نے ہتھیلی کا وار اس کی گردن پر کر دیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گئی۔ اسے زندہ رکھنا ل تھا۔ میرے لئے نہیں، معاشرے کے لئے، اس کا گناہ میں نے اپنی آنکھوں سے تھا۔ ایسی عورتوں کے لئے رحم کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے۔

اسے زندگی سے آزاد کر کے میں کار کو باہر لایا اور پھر جیون لال کے گھر کی جانب ا۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ پانچ منٹ میں طے ہو گیا۔

جیون لال باہر ہی کھڑا تھا۔ اس نے دور سے کار کی روشنی دیکھ لی تھی۔ میں نے اس وازے پر کار روک کر کنک لتا کو نیچے اتارا اور پھر بولا۔ ''جیون! میں اس کار کو سڑک پر آتا ہوں۔''

رات کے سناٹے کا فائدہ اٹھا کر میں نے کار کو کچھ دور لے جا کر چھوڑ دیا اور پیدل یا۔ کنک لتا کو چارپائی پر لٹا کر وہ دونوں ماں بیٹے اسے آوازیں دے رہے تھے۔

''پانی کا چھینٹا مارو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

جیون دوڑ کر پانی لے آیا۔

''تم ابھی سامنے مت آنا۔ ورنہ اس کے ذہن پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔'' میں نے کو مشورہ دیا۔

''نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' جیون نے انکار کر دیا۔

میں نے پانی کا چھینٹا مارتے ہوئے آواز دی ''کنک'' دو تین بار کی کوشش سے نے آنکھیں کھول دیں۔

''آپ!'' اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''آپ کو تو ان لوگوں نے قتل کر دیا تھا''

''جا کو راکھے سائیاں مار سکے نہ کوئے۔'' میں نے ہندی کا شعر پڑھا۔

''کنک!'' جیون نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

کنک لتا نے مڑ کر دیکھا اور جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ ''ناتھ، میرے سوامی، آپ، تو سزا ہو گئی تھی۔''

''میں تمھاری خاطر جیل توڑ کر نکل آیا ہوں۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھیں گا۔ ہم لوگ کلکتہ جا کر رہیں گے۔ اس انسانی سمندر میں ہمیں کوئی تلاش نہیں کر سکے گا۔''

''سچ؟'' کنک کی آواز تھرتھرائی پھر اس کا جسم تھرتھرایا اور وہ بستر پر لڑھک گئی۔

گھبرا کر میں نے اسے ہلایا۔ ناک پکڑ کر دبایا مگر دیر ہو چکی تھی۔ جسے گنگولی نہیں مار سکا تھا، اسے جیون کے پیار نے مار دیا۔ تین سال تک ظلم کی چکی میں پسنے والی سے برداشت نہیں ہو پائی تھی۔ حرکت قلب نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کی رکی ہوئی سانس محسوس کرتے ہی جیون نے چیخ ماری اور اس کی لاش پر گر پڑا۔ خوشی ہو یا غم اس کا سیدھا پر پڑتا ہے۔ خوشی ہو تو بلیوں اچھلتا ہے۔ غم ہو تو بیٹھنے لگتا ہے۔ اتنی تگ و دو کے بعد وہ بیوی ملنے آیا تھا لیکن پہلے زمانہ دیوار بنا پھر موت حائل ہو گئی۔ بوڑھی ماں جو تین سال سے اکیلی اکیلی رہ گئی۔ میت ہندو عورت کی تھی۔ اسے ہندوانہ طریقے سے نذر آتش کرنا تھا اس لئے نے سو سو کے دس نوٹ اس کی ماں کے ہاتھ میں تھمائے اور باہر نکل آیا۔

اتنی رات کو کہاں جاؤں؟ دشمن ملک، بیری زمیں، زہریلی فضا۔ ہلکی سی پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ میں نے خدا کا نام لیا اور اس جانب بڑھنے لگا جہاں بسیں کھڑی ہوتی تھیں۔ بس اسٹاپ پر کچھ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں چائے کی دکانیں



تھیں اور کھانے کا ڈھابا بھی۔ میں نے چائے کی دکان کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ باہر بچھے بنچوں میں سے ایک پر بیٹھ کر میں نے پیر سیدھے کر لیے اور پھر چائے لانے کا اشارہ کیا۔ جس اطمینان سے میں بیٹھا تھا، اسے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے میں نے کئی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ مجھے اس بات کی بھی فکر نہیں تھی کہ گنگولی کی موت اب تک خبر بن چکی ہو گی۔ پولیس والے بھی تفتیش کے لئے پہنچ چکے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے میری تلاش میں نکل بھی پڑے ہوں، پھر بھی مجھے خوف نہیں تھا۔

خوف کا احساس تب بیدار ہوتا ہے جب انسان جذبات پر قابو رکھے ہوئے ہو اور اس کا دماغ خوف کے اثر کو قبول کر لینے کی حالت میں ہو لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان بہ یک وقت دو حصوں میں بٹ جاتا ہے یہی کیفیت میری بھی تھی۔ میں جیون کے گھر سے تو فرار ہو گیا تھا لیکن کچھ دیر پہلے انسانی زندگی کی حقیقت کا جو منظر میں نے دیکھا تھا، اس کی یاد سے فرار حاصل نہ کر سکا تھا۔ غم کا بوجھ دل و دماغ پر طاری تھا اور جب دماغ پہلے سے ہی بھرا ہوا ہو تو خوف کو جگہ کیسے ملتی؟ پھر بعض باتیں ذہن سے چپک کر رہ جاتی ہیں انھی میں سے ایک کنک کی موت تھی۔ زن و شوہر کے مابین پیار کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ رشتہ اتنا گہرا بھی ہو سکتا ہے، یہ میں نے اب جانا تھا۔ اس ایک منظر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

میں کھویا کھویا سا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ چونک اٹھا۔ پرشور آواز کے ساتھ ایک جیپ آ کر رکی۔ اس جیپ پر پولیس والے لدے ہوئے تھے۔ وہ سب بھی چائے پینے اسی دکان پر آئے تھے۔ پہلے میں نے ان کی جانب توجہ نہ دی لیکن ان کی باتوں نے متوجہ کر ہی لیا۔ ایک سپاہی جوش میں قدرے اونچی آواز کے ساتھ بول رہا تھا۔ ''صاحب یقین کریں وہ انسان نہیں جنات ہو گا۔ میں نے پانچوں لاشیں دیکھی ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے مقتولین کے سر روڈ رولر کے نیچے ڈال دیے گئے ہوں قیمہ بنا ہوا تھا قیمہ۔ ایک زخمی نے اس کا جو حلیہ بتایا ہے اسے سن کر مجھے ایسا لگا ہے جیسے میں نے اس قاتل کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''کیا حلیہ ہے؟'' افسر نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے ٹھیٹ بھوجپوری لہجے میں پوچھا۔

''قاتل کے بال بالکل ویسے تھے جیسے خانقاہوں کے پیر صاحبان رکھتے ہیں۔ کندھے تک بڑھے ہوئے بال اور خشخشی داڑھی۔'' سپاہی نے جواب دیا۔

''میں سمجھ گیا۔ یہ حلیہ ایک پاکستانی جاسوس کا ہے۔'' افسر نے تکا مارا۔ ''اس کا نام

ضیغم عابدی عرف خان ہے۔ وہ تین قیدیوں کے ساتھ جیل توڑ کر بھاگا ہے۔ بھاگنے و
میں اس عورت کا شوہر بھی تھا جسے وہ قاتل گنگولی سے چھین کر لے گیا ہے۔ اس کی گرفتاری
حکم نامے کے ساتھ حلیہ بھی لکھا ہے وہی تم نے پڑھا ہوگا۔''

افسر کی بات سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی۔ خوف کے
پنجے نے میرے دل کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ میں کچھ اور دور کھسک گیا لیکن صبح کا ذب کا د
مجھے چھپا لینے میں نا کام تھا۔ میں کسی قسم کا پھڈا کرنا نہیں چاہتا تھا اسی لئے پروردگار کے
دل ہی دل میں گڑگڑانے لگا۔ صدق دل کی دعا مستجاب ہوگئی اور وہ سب چائے پی کر
گئے۔ ان کے جاتے ہی بس آ گئی اور میں پھرتی سے سوار ہو گیا۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میر
دل ہی دل میں قہقہہ لگایا۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی اس افسر کی عقل پر میرا تعلق نہ حکومت سے تھ
میں جاسوس تھا۔ میں تو معمولی سا محب وطن ہوں پھر بھی وہ خطرناک سمجھ رہا تھا۔

بس چلتے ہی میں نے اطمینان کی سانس لی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بس
رفتاری سے ہزار گنا تیز وقت کا پہیہ گھوم رہا تھا۔ مشرقی افق آہستہ آہستہ گل گوں ہوتا جار
بہرام پور پہنچتے پہنچتے سورج پوری آب و تاب سے چمکنے لگا تھا۔

پولیس والوں کو میرا حلیہ بتا دیا گیا ہے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے، یہی سوچ
نے سائیکل رکشا والے سے سودا طے کیا اور نوتن پاڑا کے لئے چل پڑا۔ راستے میں کچھ د
لئے رکشا رکوایا اور سیفٹی ریزر اور بلیڈ خریدا۔ نوتن پاڑا کی سڑک پر رکشا سے اترا اور پید
انیل کے گھر کی جانب چل پڑا۔

پتول بیدار ہوگئی تھی اور گمچھا لے کر نہانے کے لئے ندی کی جانب جا رہی تھی
دیکھتے ہی وہ رک گئی اور آنچل سے چابی کھول کر میری جانب بڑھا دی۔

دروازہ کھولنے کے بعد میں نے سب سے پہلے شیو کی۔ شیو کرتے وقت میرا
رہا تھا لیکن مجبوری تھی۔

داڑھی کے بعد میں نے قینچی سے کاکل کو تراشا اور پھر میں بھی غسل کے لئے
پہنچ گیا۔ پتول عورتوں کے گھاٹ پر کھڑی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا میں نے اس
میں پانی میں ڈبکی لگا دی۔ نہا کر نکلا تو عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔ ساری تھکن دور
کسلمندی کی جگہ طمانیت نے لے لی تھی۔ میں نے گمچھے سے بدن پونچھا اور واپسی کے
گیا۔ بھیگی ساڑھی میں ملبوس جسم کے اوپری حصے پر گمچھا لپیٹے پتول بھی پیچھے پیچھے چلی آ رہی



گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا۔ ''رام قسم! آج آپ بہت خوبصورت لگ
رہے ہیں۔''

میں نے جواب نہیں دیا اور بھیگی دھوتی بدلنے کے لئے پردے کی آڑ میں چلا گیا۔
میرے نکلنے کے بعد وہ بھی کپڑے بدل آئی۔ جسم کو آرام دینے کی غرض سے لیٹنا تھا کہ اس نے
کہا۔ ''بھات کھالیں۔''

''ابھی تو سو کر اٹھی ہو چاول کب پکائے؟''

''رات میں پنتھا کے لئے پانی میں بھات ملا کر رکھ دیا تھا۔''

رات سے ایک کھیل بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ بھوک سے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ
رہی تھیں اسی لئے میں بنگالیوں کی مرغوب ڈش، پانی ملے باسی چاول پیاز کے ساتھ کھانے بیٹھ
گیا۔ پیٹ بھرتے ہی غنودگی سی طاری ہونے لگی تو میں بستر پر لیٹ گیا۔ تھکن اور شب بیداری
نے جوڑ جوڑ ہلا دیا تھا۔ لیٹتے ہی نیند نے دبوچ لیا۔

میں بے خبر سو رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ دروازے پر پچاسوں آدمی کھڑے شور مچا
رہے تھے۔

''کیا بات ہے کیوں شور مچا رہے ہو۔'' پتول نے پوچھا۔

''یہ محلہ شریفوں کا ہے۔ یہاں غلط کام نہیں ہونے دیا جائے گا۔''

''کون سا غلط کام؟''

''بھائی کی غیر موجودگی میں غیر آدمیوں کو کیوں بلاتی ہو۔''

''کس غیر آدمی کی بات کر رہے ہیں؟''

وہ سامنے کون سویا ہوا ہے؟''

''وہ غیر نہیں ہے۔''

''پھر کون ہے۔''

پتول نے جواب نہ دیا۔

''جلدی بولو ورنہ ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ دونوں کا سر مونڈھ کر پولیس کے حوالے
کر دیں گے۔''

پتول نے سر گھما کر میری طرف دیکھا اور پھر ان پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے
بولی۔ ''یہ میرا پتی ہے۔''

اس کا جواب سن کر مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ میرے پورے وجود میں دھما
ہونے لگے اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"تم شادی شدہ ہو تو مانگ میں سیندور کیوں نہیں ہے۔" شرپسندوں کے غول
آگے کھڑے ہوئے شخص نے کہا۔

اس سوال نے مجھے بھی دہلا دیا۔ ہر ہندو عورت کے لئے ضروری ہے کہ شادی
بعد مانگ میں سیندور کی سرخی بھرے۔ یہی تو پہچان ہے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی۔

میرے چہرے کو نظروں سے تولتے ہوئے وہ دروازے کی جانب مڑی اور
بولی۔ "کس کتاب میں لکھا ہے کہ بیاہتا عورت بھر مانگ سیندور لگائے۔ سیندور سہاگ
سلامتی کے لئے لگایا جاتا ہے۔ نمائش کے لئے نہیں، میں نمائش کرنا پسند نہیں کرتی ہوں۔
کی سلامتی کے لئے مانگ میں سیندور بندی لگا لیتی ہوں۔ اگر آنکھ ہے تو دیکھ لو۔"

وہ اپنا بالوں سے بھرا سر نیچے کر کے دکھانے لگی۔ سیندور کی بندی ہوتی تو نظر آتی
بھی، وہ سب مطمئن ہو گئے۔

چتول کا نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا تھا۔ ان لوگوں نے سوچا ہوگا وہ نہا کر آر
ہے اسی لئے سیندور کی ہلکی سی لکیر مٹ گئی ہوگی۔

ان کے جاتے ہی میں نے کہا۔ "یہ تم نے کیا کہہ دیا؟"

"غلط کہا؟" اس نے پوچھا۔

"جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ سچ بول سکتی تھی کہ یہ میرے بھیا کے دوس
ہیں۔"

اس نے چڑ کر جواب دیا۔ "اور وہ چھوڑ دیتے۔ اس بری طرح مارتے کہ شکل
پہچانی جاتی پھر میں نے غلط کیا کہا؟ ہر لڑکی کو اپنا جیون ساتھی منتخب کرنے کا پورا حق ہے۔ مید
نے بھی تمہیں پسند کر لیا ہے۔"

اس کی بات سن کر حیرت سے میرا منہ کھلا رہ گیا۔ "کیسی عجیب لڑکی ہے؟" میں
سوچا شادی کی بات سن کر لڑکیاں شرماتی ہیں، مسکراتی ہیں اور اپنا ... ہیں مگر اس کا چہ
سپاٹ تھا۔ تاثرات سے عاری تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ... یا اللہ خیر! یہ میں کس
پھندے میں پھنس گیا۔"

اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔ "کیا میں خوبصورت نہیں ہوں؟ میرے لئے پو



گاؤں پاگل تھا پھر بھی میں نے کبھی کسی کو گھاس نہ ڈالی لیکن پتا نہیں کیوں تمہیں دیکھتے ہی میں
پاگل ہو اٹھی۔"

میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور بستر سے نیچے اتر گیا۔

مجھے باہر جاتا دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "کہاں چلے؟"

"خود بال تراش کر کارٹون بن گیا ہوں۔ سوچ رہا ہوں کہ کسی سیلون میں جا کر بال
سیٹ کرا لوں۔"

"ارادہ برا نہیں ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "جائیے!"

اجازت ملتے ہی میں باہر نکل آیا۔ دراصل میں اس پاگل لڑکی کے بارے میں
سکون رہ کر سوچنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا، اراکان کے جنگل میں تچھک ناگ نامی سانپ کے
رس لینے سے میرا خون زہریلا ہو چکا ہے۔ جنگلیوں کے حکیم نے بھی سختی سے منع کر دیا تھا کہ
بیوی کے پاس نہ جانا اس بے وقوف کو خبر نہیں تھی کہ میں انسانی روپ میں سانپ ہوں۔ میری
چاہت میں وہ موت کو گلے لگانا چاہتی تھی۔ وہ میری دشمن تھی۔ اس ملک کی رہنے والی تھی جو
ہماری جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش میں مصروف ہے اور دشمن کو موت کا تحفہ دینا میرا فرض
ہے۔ "کیا میں اسے موت دے دوں؟" میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "ہو سکتا ہے
جنگلیوں کے حکیم کا اندازہ غلط ہو؟" میرے دل میں چھپے شیطان نے اکسایا۔ دراصل فردوس کی
قربت ایک سال سے میسر نہیں تھی۔ پا... سے کیا تو تھا لیکن شادی کے ہنگامے نے دو گھڑی کے
لئے بھی اس سے ہمیں ملنے نہ دیا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" سوچتے ہوئے میں سیلون سے باہر آ گیا۔ جب لوٹ کر
گھر آیا تو چونک گیا۔ چتول پلنگ پر بیٹھی تھی۔ وہ ان تمام حربوں سے لیس تھی جو کسی بھی مرد کو
چاروں شانے چیت کرنے کے لئے آزمائے جاتے ہیں۔ اپنے بالوں کو اس نے جوڑے کی
شکل دے رکھی تھی۔ کاجل کی لکیر نے آنکھوں کو مزید خوبصورت بنا دیا تھا۔ گلابی ہونٹوں کو لپ
اسٹک کی سرخی نے قاتل حسن عطا کر دیا تھا۔ روج کی بھینی بھینی خوشبو نے گالوں کا احاطہ کر رکھا
تھا۔ اس خوشبو میں شفق کی لالی بھی شامل تھی جو میرے اندر کے مرد کو جھنجھوڑنے کے لئے کافی
تھی۔ وہ اس بات سے واقف تھی کہ مرد کا دل دیوانہ ہوتا ہے۔ ہر اچھی چیز کو دیکھ کر مچلنے لگتا
ہے۔ حسن کی کڑی سنگھار کی ... سے مل کر مضبوط زنجیر بن جاتی ہے جو مرد کے پاؤں روک لیتی
ہے، وہ بھاگنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ میرے قدم بھی ٹھٹک گئے۔ وہ مجھے دیکھ کر شرما بھی رہی

تھی، مسکرا بھی رہی تھی۔ مجھ سے نظریں چرا بھی رہی تھی اور چور نظروں سے قربان بھی ہو رہی تھی۔ اس کی قاتل آنکھوں میں عجیب سی پیاس ہلکورے لے رہی تھی۔ میرے اندر زلزلہ برپا ہونے لگا۔ میں نے گھبرا کر خشک ہوتے گلے کو تھوک نگل کر تر کیا اور بولا۔ ''کھانا...... مجھے دو۔''

وہ دھیرے دھیرے چارپائی سے نیچے اتری اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔

''نہیں! یہ گناہ ہے۔'' میرے دماغ نے سرزنش کی اور میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

''آؤ نا۔'' اس نے لگاوٹ بھری مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

میں اس کے ساتھ باورچی خانے میں آیا اور لکڑی کے چوڑے تختے پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہلسا مچھلی کا شوربے دار سالن بنایا تھا۔ چاولوں کے ساتھ ہلسا کے ذائقے نے اشتہا بڑھا دی اور میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ پیٹ کی آگ نے میرے اندر کی جنگ کو سرد کر دیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے چارپائی اٹھالی۔ میں باہر سونا چاہتا تھا کہ اس نے ٹوکا۔ ''آج رات تو اندر گزار لو۔''

''نہیں، میں باہر سونے کا عادی ہوں۔''

''بھگوان کے لئے ونود! دل نہ توڑو۔''

''نہیں پتول! یہ پاپ ہے۔'' کہتے ہوئے میں باہر نکل آیا۔ بستر لگا کر لیٹا تو میری نگاہ آسمان پر پڑی ایک بھی تارا نظر نہیں آ رہا تھا۔ مشرق کی جانب سے کوہ پیکر بادل اڑتے چلے آ رہے تھے۔ بنگال اور بارش لازم وملزوم ہیں۔ پھر بھی اس شب میں بادل دیکھ کر ڈر گیا تھا۔ طوفان کی آمد کے خطرے سے نہیں، اپنے اندر اٹھتے طوفان سے۔ میں جانتا تھا انسان اور شیطان کے درمیان حد فاصل کچھ نہیں ہے۔ ذرا سی لغزش پاتے ہی وہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے لیکن میں اسے یہ موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور قسمت بارش کی شکل میں اسے موقع فراہم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔ ''اے میرے رب عظیم! مجھے گناہ سے بچالے۔''

بعض دعائیں فوراً اثر دکھا دیتی ہیں۔ وہ دل کی گہرائی سے نکلتی ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ طالب دعا پاک باطن ہو مگر نہ میرا ظاہر پاک تھا اور نہ باطن طاہر تھا۔ میں تو فرض بجا لانے والا



ایک معمولی انسان تھا جو باطن کو پاکیزگی کا نمونہ بنانا چاہتا تھا لیکن دنیاوی گندگی کسی نہ کسی شکل میں لتھڑ ہی جاتی تھی۔ شاید اسی لئے میری دعا قبولیت کی منزل تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ جب انسان تگ و دو کرتا رہے اور اسے منزل نہ ملے تو اس پر تھکن غالب آ جاتی ہے۔ میرا انگ انگ ٹوٹنے لگا تھا۔ میں نے تھک کر نیند کی آغوش میں پناہ لے لی۔ میں بھول چکا تھا کہ اس سرزمین پر کیوں آیا ہوں؟ کیوں رکا ہوا ہوں؟ صبیحہ اور حسن آرا کو کیسے تلاش کیا جائے؟ میں بے خبر سو رہا تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے پانی کی بوندوں نے جگایا تھا اور اندر پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

باہر برسات کی بہار تھی، اندر حسن کا خمار تھا۔ پیٹ بھرا ہو تو ذہن پرسکون ہوتا ہے۔ جذبات برافروختہ ہو سکتے ہیں لیکن بھوک کی آگ بھڑک رہی ہو تو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے اندر تلاش کی آگ بھڑک رہی تھی اپنے وطن کی دو معصوم لڑکیوں کی تلاش کی آگ، جو وطن فروشوں کے ظلم کی چکی میں پس گئی تھیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں بھی پس کر ریزہ ریزہ ہو جاؤں گا۔ ان پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے گئے ہوں گے، اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا اور یہ غم مجھے دیمک بن کر چاٹ رہا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کب کا انھیں آزاد کرا چکا ہوتا لیکن ابھی تک اس بات کا پتا چل نہیں پایا تھا کہ وہ دونوں ہیں کہاں؟ ایسی حالت میں جب منزل بے نشاں ہو تو کوئی کیا کرے؟ میں بھی کشمکش و پیچ میں تھا۔ حالات کی زنجیریں بھی جکڑے ہوئے تھیں۔ اسی لئے پتول کا جادو بے اثر رہا تھا۔ اس کے حسن کی فسوں سازی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ مگر آج باہر بارش کی بوچھار تھی اور اندر حسین اداؤں کی یلغار تھی۔ بعض ادائیں سرد ہوتی ہیں لیکن جسم کو تپا دیتی ہیں۔ پتول کی بے خبر نیند بھی اداؤں سے لبریز تھی۔ اس کے سونے کی ادا ہیجان انگیز تھی۔ لیکن صبیحہ اور حسن آرا کا خیال اس پر غالب آ گیا۔ میں نے ایک نظر اس کے آڑے ترچھے جسم پر ڈالی اور چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

ذہن کو گناہ کے راستے سے موڑ کر میں نے آنکھیں موند لیں اور سو گیا۔

دروازے پر زوردار دستک نے مجھے جگا دیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ دستک کی آواز پر پتول آنکھیں ملتی اٹھ بیٹھی تھی۔ دوسری دستک پر اس نے پوچھا۔ ''کون؟''

''دروازہ کھولو۔'' باہر سے کرخت آواز آئی۔

اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر پولیس کا ایک افسر کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں کئی

سپاہی بھی نظر آ گئے۔ انھیں دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور دوران خون کنپٹی پر ہتھوڑا سی مارنے لگا۔ مگر میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ وہ مجھے سویا ہوا سمجھیں لیکن ذہن بیدار میں پوری طرح سے تیار تھا۔ گڑبڑ کا احساس تو مجھے ہو چکا تھا لیکن میں پہل نہیں کرنا چاہتا تھا

افسر نے چتول سے پوچھا۔ ''یہ کون سو رہا ہے؟''

''میرا پتی ہے۔'' چتول کی آواز میں بے خوفی تھی۔

''کیا کرتا ہے؟''

''جی، ہم لوگ کچھ ہی دنوں پہلے پاکستان سے بھاگ کر یہاں پناہ لینے آئے ہیں۔'' اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''انیل سے تمھارا کیا رشتہ تھا؟''

''وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔''

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میں کان لگائے ان کی باتوں کو سننے کی کوشش کر رہا تھا اور خاموشی میرے صبر کی چوکے لگا رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ اپنے آنے کا مقصد بیان کرے لیکن افسر شہر خموشاں کا باسی بنا ہوا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''انھیں جگا دو۔''

چتول کے پیروں کی چاپ آہستہ آہستہ نزدیک آ گئی۔ اس نے میرے کندھے کو پکڑ کر دھیرے سے ہلایا ''سنیے جی!''

''کیا ہے؟'' کہتے ہوئے میں نے کروٹ بدل لی۔

''اٹھیے نا۔''

''کیوں شور کر رہی ہو؟'' کہتے ہوئے میں اٹھ بیٹھا اور پھر چونکنے کے انداز میں بولا۔ ''یہ پولیس کیوں آئی ہے؟''

''آپ کا نام؟'' افسر نے دخل دیا۔

''ونود بنرجی۔'' میں نے جواب دیا۔

''مسٹر بنرجی! ایک دکھ کی خبر لایا ہوں۔''

''کہیے۔'' میں نے پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کل رات انیل باڈر پار کرتے ہوئے ای پی آر کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔''

''کیا؟'' میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ''ایسٹ پاکستان رائفلز والوں نے اسے گو



لی؟''

''ہاں اور اس کی لاش ہمارے علاقے میں پھینک گئے۔ بعد میں ہمیں اپنے ذرائع سے پتا چلا کہ اس کا تعلق ''امارا بنگالی'' سے ہے۔ ہم نے رات ان سے رابطہ کیا اور آپ کا پتا حاصل کیا۔ برائے مہربانی آج دوپہر تک اس کی لاش ہسپتال سے لے آئیں۔

''جی اچھا۔'' میں نے ٹوٹے لہجے میں جواب دیا مگر اندر سے خوش ہو گیا تھا میری دشمن کی صفوں میں جا کر انتشار پیدا کرنے والے کو ہمارے جیالے سپاہیوں نے جہنم واصل کر دیا تھا۔ یہ خوشی کی بات تھی ناں۔

افسر تو خبر دے کر چلا گیا اور مجھے چتول کے بین سننے کے لئے چھوڑ گیا۔ میں نے اسے روکا نہیں تھا، رونے دیا تھا تاکہ دل کے اندر پکنے والا غموں کا لاوا آنکھوں کے راستے بہہ جائے۔

کچھ دیر تک اسے آنسو بہاتے دیکھتا رہا پھر باہر نکل آیا۔ سڑک پر پہنچ کر رکشا لیا اور بڑا گھاٹ بازار پہنچ گیا۔

''امارا بنگالی'' کے دفتر میں کافی لوگ جمع تھے۔ وہ سب اپنا اپنا نام درج کرانے آئے تھے۔ ان پر نظریں ڈالتا ہوا میں منتظمِ اعلیٰ شری وشنو باگچی کے کمرے میں داخل ہوا۔ دھوتی اور سفید کرتے میں ملبوس وشنو باگچی کرسی پر بیٹھا رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''کہیے؟''

''میرا نام ونود بنرجی ہے اور میں انیل کا بہنوئی ہوں۔ صبح پولیس والوں نے خبر دی کہ انھیں پاکستانیوں نے گولی مار دی ہے۔ ان کی لاش لینے جانا ہے۔''

''سرسوتی۔'' اس نے کسی کو پکارا۔

''جی۔'' ایک لڑکی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''انھیں رام شرن سے ملوا دو۔ ان سے کہہ دینا کہ کچھ آدمی ساتھ کر دیں۔''

''جی اچھا۔'' اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارا کیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

سرسوتی سفید سوتی ساڑی پہنے تھی۔ اس کی مانگ میں نہ سیندور تھا۔ نہ کلائیوں میں چوڑیاں۔ پیر بھی ننگے تھے۔ اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ بیوہ ہے۔ اتنی کم عمر کی بیوہ دیکھ کر ہر دل میں رحم کا جذبہ جاگ اٹھتا ہوگا۔

''ایک بات پوچھوں۔'' چلتے چلتے میں نے کہا۔

''کہیے۔'' وہ پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کے چہرے کی طرح اس کی مسکراہٹ بھی قاتل تھی، گورے مکھڑے پر، ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ بلوہ کرا دینے والی تھی۔ میں نے گالوں کے چاہِ زقن پر نگاہیں ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں کب سے ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جب سے میرے شوہر شہید ہوئے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان کا انتقال کب ہوا؟''

''دو سال پہلے انھیں پاکستانی پولیس نے بے دردی سے ڈاکہ مارنے کے گولی مار دی تھی؟''

میں نے پوچھا۔ ''واقعی وہ ڈاکو بن گئے تھے؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں تنظیم نے انھیں اسی کام کے لئے بھیجا تھا۔ ان کے ذمے تھا کہ وہ غیر ملکی فرموں کو لوٹیں۔ ان کے کارکنوں کو اغوا کریں تاکہ بین الاقوامی طور پر بدنام ہو جائے۔ غیر ملکی سرمایہ وہاں کے لوگوں کی ترقی کے کام نہ آسکے۔ دہشت زدہ ہو کر اپنے ملکوں کو لوٹ جائیں۔ بھگوان کی کرپا سے وہ بخیر و خوبی اپنا کام سرانجام دے رہے تھے کہ پولیس سے مقابلہ ہو گیا۔''

''بچے وغیرہ تو ہوں گے؟''

''دل میں حسرت ہی رہ گئی ہے۔''

''آپ کے ماں باپ دوسری شادی کیوں نہیں کرا دیتے؟''

''باپ ہے نہیں اور ماں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ وہ بھاری تلک اور [illegible] کر سکے۔ ہم نے اتنی ترقی کر لی لیکن تلک اور جہیز کی رسم کا خاتمہ نہیں کر پائے۔''

اس کی آواز میں غم و غصہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ دل کا درد چھپانے سے قاصر تھی۔

''بھگوان کا شکر ہے کہ انگریزوں نے شوہر کے مرنے پر اس کی لاش کے ساتھ جل جانے کا خاتمہ کر دیا اور بیوہ کی دوسری شادی کا قانون بھی بنا دیا لیکن ہم ہندو بیوہ کو [illegible] اتے ہیں وہ ایسے تب، جب ڈھیر سا جہیز ملے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کو یہاں سے تنخواہ تو ضرور ملتی ہوگی۔ اسے جمع کر کے پوری کر سکتی ہیں۔ بغیر بچے کے عورت ادھوری ہوتی ہے۔ یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی



میری بات نے اس کے دل میں چھپے غم کو جھنجھوڑ دیا اور اس کی ہرنی جیسی آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ اس نے چھلک آنے والے آنسوؤں کو ہتھیلی کے رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔

''میری یہ حسرت خواب بن گئی ہے۔''

''کیوں؟'' میرے لہجے میں تجسس پنہاں تھا۔

''میری ڈیوٹی کیا ہے یہ تو جانتے ہی ہوں گے۔ روز روز کے مسئلے کا حل باگچی نے ائی سزا کے ذریعے تلاش کر لیا ہے۔ مجھے ہمیشہ کے لئے......'' کہتے کہتے وہ رو پڑی۔

کچھ باتیں بغیر کہے بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اس کا دکھ میں نے بھی سمجھ لیا تھا۔ واقعی اسے بہت بڑی سزا دی گئی تھی۔ جسم میں تبدیلی پیدا نہ ہو اس کی اتنی بڑی سزا ظلم عظیم تھی۔ میں نے اس کے ذہن کا رخ موڑنے کے لئے کہا۔ ''چلیے چلتے ہیں۔''

''چلیے۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھنے لگی۔ تیسرے کمرے کے سامنے جا کر وہ رک گئی۔ بند دروازے پر اس نے دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے آواز آئی۔

''میں ہوں سرسوتی۔''

چٹخنی کھلنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولا تھا سرسوتی کی ہم عمر ایک لڑکی نے، وہ بھی سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کی سونی مانگ اور سونی کلائیاں چیخ چیخ کر اس کے بیوہ ہونے کا اعلان کر رہی تھیں لیکن چہرے کی شادابی ایک نئی کہانی سنا رہی تھی۔ میں نے اس کے تمتماتے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر اس شخص کی جانب دیکھا جو بڑی سی میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

''شری مان!'' سرسوتی نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''باگچی جی نے کہا ہے کہ ان کے ساتھ کچھ آدمیوں کو بھیج دیا جائے۔ پرسوں کے اسائنمنٹ پر جانے والے کی لاش لینے۔''

اس نے ایک چٹ پر کچھ آدمیوں کے نام لکھے اور پھر سرسوتی کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ مدن کو دے دینا۔''

''آئیے۔'' سرسوتی نے مجھ سے کہا۔

میں اس کے ساتھ باہر آگیا۔ گلیارے کو پار کرتی ہوئی وہ باہر بیٹھے مدن کے پاس آئی اور اس سے بولی۔ ''یہ ونود جی ہیں۔ شری مان جی نے کہا ہے کہ ان آدمیوں کو ان کے ساتھ کر دیا جائے۔'' کہتے ہوئے اس نے لسٹ بڑھا دی۔

''کھوکا، کانتو، نیمائی، کشور! تم سب ان کے ساتھ چلے جاؤ۔'' اس نے نیچے دھوپ تاپنے والے نوجوانوں کی جانب مڑ کر کہا۔

وہ سب میرے ساتھ نکل پڑے۔ وہاں سے ہم پانچوں اسپتال پہنچے۔ ا افسر وہیں بیٹھا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنی ڈائری پر دستخط لئے اور لاش کو ہمارے حوالے ک

لاش جس وقت نوتن پاڑا پہنچی، محلے والے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑے۔ پُرنم تھی لیکن پتول کی آنکھیں خشک تھیں۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا تھا۔ اس کے سکتے کو تو بہت کوشش کی گئی لیکن وہ زندہ ممی بنی رہی۔ نہ بولتی تھی اور نہ روتی تھی۔ چچری پر رکھ کر ا جائی جانے لگی تو اسے عورتوں نے کمرے سے باہر نکالا اور چچری کے سامنے لا کر کھڑ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی۔ عام طور پر سکتہ شاک لگنے سے ہوتا ہے اور اس کا واحد آنسو بہانا لیکن خبر سن کر وہ روئی تھی پھر لاش دیکھ کر گم صم کیوں ہو گئی؟ یہ بات میری سمجھ آ رہی تھی۔ وہ وقت اس بات پر غور کرنے کا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اپنی پوری تو ادائیگی میں لگا دی۔ رسم کے خاتمے کے بعد لاش کو چار ہریجنوں نے کندھے پر اٹھایا اور گھاٹ کی جانب لے چلے۔ لاش چتا پر رکھ کر آگ لگا دی گئی۔ واپسی کے واقت ان لوگ کہنے پر میں نے بھی ندی میں ڈبکی لگائی اور گھر آ گیا۔

تیسرے دن سراد تھا۔ مردے کے نام پر برہمنوں کو کھانا کھلایا۔ لوگوں کی میں، میں ہی واحد عزیز تھا۔ اس لئے مجھے سر منڈانا پڑا۔ سر کے بالوں کے ساتھ داڑھی بھی منڈ والی گئیں۔

میں نے اپنا منڈن رسم کی ادائیگی کے خیال سے نہیں کرایا بلکہ اپنے خدوخ تبدیلی لانے کے لئے کروایا تھا۔ اس روپ میں اگر فردوس بھی مجھے دیکھ لیتی تو پہچان نہیر اتنا بدل چکا تھا میرا روپ۔ اس بہروپ میں آسانی کے ساتھ کہیں بھی آ جا سکتا تھا۔ بلک تھانے میں بیٹھ کر ان کے سوالات کا جواب بھی دے سکتا تھا۔ صبیحہ اور حسن آرا کو ڈھونڈ۔ یہ نیا روپ مددگار ہو سکتا تھا کیوں کہ سر مونڈنے والے نے ہندو عقائد کو مدنظر رکھتے ہو۔ چھوٹی سی چٹیا چھوڑ دی تھی جسے وہ ٹکی کہتے ہیں۔ اس ٹکی اور داہنے کندھے سے بائیں کو۔ جھولتے ہوئے دھاگے (جینو) کو دیکھ کر لوگ مجھے پنڈت سمجھنے لگے تھے۔ اس پر میں۔ اور پردہ بھی لگا لیا تھا جو ان کی عقل پر پڑ گیا تھا۔ وہ پردہ تھا تلک کا۔ ہر روز صبح نہانے ۔ میں صندل کو پتھر پر گھس کر لیپ تیار کرتا اور اس میں تھوڑا سا سیندور ملا کر پیشانی پر تین آ



کھینچ لیتا۔

یہ لکیریں دیکھ کر لوگ مجھے پنڈت سمجھتے تھے۔ میں بھی ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

لیکن میرا یہ روپ پتول کے لئے زہر تھا۔ وہ جب تب مجھے ٹوکتی کہ اپنے اس نئے بہروپ کو ختم کر دو لیکن میں نے تو کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا اپنے گھر کے باہر ایک چھوٹا سا مندر بھی بنانا چاہتا تھا کیوں کہ میں طویل المدت جنگ لڑنا چاہتا تھا کنائی سنیال کو بھرپور جواب دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ میں خون کے بدلے خون کا قائل تھا۔

میں اپنی اس جنگ کا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا کہ ایک دن صبح ہی صبح سرسوتی پہنچ گئی۔

''ارے تم؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں مجھے کلکتہ بھیجا جا رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''بطور سزا۔ میں نے اپنی کہانی آپ کو سنائی تھی ناں۔ وہ بات کھل گئی ہے۔ کسی نے شریمان جی سے کہہ دیا ہے۔''

کیا کلکتے میں کوئی جیل ہے؟''

''ہاں اسے جیل ہی سمجھ لو۔ باگھ بازار میں ایک عمارت ہے۔ اس عمارت کی پیشانی پر ناری سو گچھا گر بھا گر یہ کا بورڈ لگا ہے۔ وہ تنظیم بھی ہماری ہے۔ وہاں صرف عورتوں کو رکھا جاتا ہے۔ لیکن سور گچھا کے لئے نہیں، ایذا رسانی کے لئے۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ عیاشی کا ایک اڈہ ہے۔'' سرسوتی نے کہا۔

''اگر کوئی وہاں اپنے جاننے والی سے ملنا چاہے تو کیا ملاقات ہو سکتی ہے''؟

''نہیں۔ لیکن میں تنظیم کی وفادار ہوں۔ شاید مجھے ملنے کی اجازت مل جائے۔ کیا تم وہاں مجھ سے ملنے آؤ گے؟''

''ہاں۔''

''تو ایسا کرنا، سوم وار کے دن تارک اشور مندر آ جانا۔ ہر پیر کے دن وہاں پوجا کرنے سب کو لے جایا جاتا ہے تاکہ انجمن کی پبلسٹی ہو سکے۔''

''ٹھیک ہے میں تارک اشور مندر پہنچ جاؤں گا۔''

میرا ارادہ تھا کہ اس تنظیم کی تمام شاخوں کو تباہ کر کے ہی لوٹوں گا لیکن جلدی کرنے

سے [illegible] رہا تھا۔ کیوں کہ [illegible] اور اس کی [illegible] حسن آرا ان کے قبضے میں تھیں
نقصان پہنچا سکتے تھے اس لیے میں ہر قدم ناپ تول کر اٹھا رہا تھا۔ دشمن کی سرزمین تھ
لغزش جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتی تھی۔ اسی لئے میں نے درخت کا سبق دہرا
تھی۔ درخت آہستہ آہستہ سر اٹھاتا ہے اور جتنا بلند ہوتا جاتا ہے، اتنی ہی گہرائی میں
اتارتا جاتا ہے۔ میں اسی کلیے کو آزمانا چاہتا تھا۔

اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے کے لئے میں نے بازار سے کچھ چیزیں خ
مطلوبہ چیزیں مجھے اسکولوں کی لیبارٹری کو سامان فراہم کرنے والی ایک فرم سے مل
واپسی پر میں نے محلے کے بیے کی دکان سے دس کلو چنے بھی خریدے۔ وہ رات میر
بہت اہم تھی۔ میری کامیابی کا دارومدار اسی رات پر تھا۔ میں رات بھر مصروف رہا او
وقت مندروں سے آنے والی ناقوس کی آواز سن کر ہی لیٹا۔ ساری رات کی تھکن تھ
پر لیٹتے ہی نیند نے اپنی بانہوں میں بھرلیا۔

میں بے خبر سو رہا تھا کہ پتول نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''کیا ہوا؟'' میں آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''باہر چمت کار ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''آپ خود جا کر دیکھ لیں۔''

چارپائی کی محبت کو تیاگ کر سر جھٹکتا ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ باہر نکلتے ہی میں
کہ میری جھگی کے سامنے پورا محلہ جمع ہے۔ عورت اور مرد کی تفریق مٹ گئی تھی۔ ہر کوئی
کو دھکیل کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان کے تجسس کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر م
آ گئی اور میں نے قدم بڑھا دیا۔ مجھے دیکھتے ہی کئی نوجوان آگے بڑھے اور ''پنڈت جی
دو'' کہتے ہوئے لوگوں کو ہٹانے لگے۔ پر وقار انداز میں قدم اٹھاتا ہوا میں اس مقام
جو سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

لوگ سجدے میں پڑے گڑگڑا رہے تھے۔ ان بدعقلوں پر میں دل ہی دل میں
بھیج رہا تھا۔ ان سب کا مرکز سجدہ وہ لمبوترا گول پتھر تھا جو آہستہ آہستہ زمین سے ابھر رہا تھ
ہندوؤں کے کئی ہزار بھگوان ہیں۔ ان میں تین بھگوان سب سے بڑے ہیں
برہما ہے جس نے برہمنڈل یعنی دنیا بنائی۔ دوسرا وشنو ہے جو دنیا کو چلا رہا ہے تیسرا مہیش



دنیا کو وناش یعنی تباہ کرے گا۔ مہیش کے کئی نام ہیں شنکر شیو مہادیو وغیرہ۔ شنکر کی پوجا دو طریقوں
سے ہوتی ہے۔ اس کی پوری مورتی کی اور دوسری اس کے گندے عضو کی۔ اسے شیو لنگ کہتے
ہیں اس پتھر کو وہ لوگ شیو لنگ سمجھ کر سجدہ کر رہے تھے۔ میں اس پتھر کے نزدیک بیٹھ کر دھیمی مگر
جلدی جلدی پشتو میں انٹ شنٹ بکنے لگا۔ سرحد سے ہزار میل دور کے اس چھوٹے سے شہر میں
جہاں اردو تک نہ سمجھی جاتی ہو، وہاں والوں کے لئے پشتو کی گالیاں بھی منتر تھیں۔ وہ لوگ
بڑے اعتقاد سے نعرے بھی لگا رہے تھے۔

''دیبر دیب مہادیب'' کی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی نعروں کے ساتھ وہ لوگ
پرشاد یعنی تبرک کی بھی بارش کر رہے تھے۔ نقد رقم، ناریل اور مٹھائی وغیرہ کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔

شام تک اتنا سامان جمع ہو گیا کہ مجھے محلے والوں سے کہنا پڑا۔ ''یہ سب تم لوگ لے
جاؤ۔''

سامان تقسیم کر کے جب میں جھگی میں داخل ہوا تو پتول نے میرے پیر چھو کر کہا۔
''اب تو مجھے بھی یقین ہو گیا ہے کہ بھگوان آپ سے خوش ہے تبھی تو ہمارے آنگن میں بھگوان
اترے ہیں۔''

میں نے جواب نہ دیا اور پیسے گننے لگا۔ حقیقت بتا کر آمدنی کا راستہ بند کرنا نہیں
چاہتا تھا۔ اگر بتا دیتا کہ شیو لنگ میں نے رات دفن کیا تھا اور اس کے نیچے چنے کا ڈھیر ڈال کر
اوپر سے دو بالٹی پانی ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے چنے پھولے اور وہ پتھر اوپر اٹھنے لگا تو لوگ
میرے گنجے سر پر چپت مار مار کر پلپلا کر دیتے۔ اسی لئے میں خاموش تھا۔

کل آٹھ سو روپے دکھشا میں ملے تھے۔ وہ سنبھال کر رکھنے کے لئے پتول کو دے
دیے اور خود لمبی تان کر سو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو دیکھا باہر مجمع لگا ہوا ہے۔ وہ لوگ میرے منتظر تھے۔ انھیں پوجا
کرانے کے لئے میں نے تیاری کی اور پتھر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ اس دن مجھے احساس ہوا
کہ یہاں کے لوگ کتنے غریب ہیں۔ غریبی کی مار راستے میں رکاوٹ کھڑی کرتی ہے اور معصوم
فطرت لوگ سائے کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔ سو سالہ سنیاسی بابا اور بنگال کے جادو والے کے
پیچھے پیسے لٹانے لگتے ہیں۔ میں نے بھی ان سے پیسے بٹورنے کیلئے پوری تیاری کر لی تھی۔ ایک
شخص نے مجھ سے کہا۔ ''باباجی میری بہولڑا کی ہے۔ میرے بیٹے کو ہم سے الگ کرنا چاہتی
ہے۔''

"فکر نہ کر بچے۔" کہتے ہوئے میں نے پشتو کی گردان کی اور پھر بولا۔ "تیرے پاس دس پیسے ہیں۔"

"ہاں بابا جی، یہ لیجیے۔" اس نے دس پیسے نکال کر بڑھا دیے۔ میں نے سکے کو چٹکی میں پکڑا اور پھر پشتو کی گردان کرتے ہوئے اسے واپس دے دیا۔

"اسے مٹھی میں بند کر کے بھگوان کو یاد کر۔" میں نے حکم دیا۔

اس نے مٹھی بند کر کے رام رام کہنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بولا۔ "بابا مٹھی میں بند سکہ انگارہ بن گیا ہے۔ ہاتھ جلنے لگا ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "فکر مت کر تیری پریشانی جل رہی ہے۔"

کچھ دیر توقف کے بعد میں نے کہا۔ "اب مٹھی کھول دے۔"

"اس نے مٹھی کھول دی۔ مٹھی کا سکہ غائب ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ راکھ تھی۔ میں نے کہا۔ "یہ راکھ نہیں، بھبھوت ہے۔ شنکر بھگوان کا پرشاد۔ اسے اپنے گھر میں سب کی نظر بچا کر چھڑک دینا۔"

وہ خوش عقیدہ شخص اس سائنسی شعبدے کو خوشی خوشی لے کر گھر چلا گیا۔ یوں بھی جاہل مطلق شخص مارکیورک ایسڈ کی خوبی کو کیا جانتا۔ اس شخص کو بے وقوف بنا کر مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا پھر بھی میں مطمئن تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔

میدان جنگ میں دشمن سپاہیوں کا خون بہانا جائز ہے۔ وہ بھی میرے دشمن کا بہی خواہ تھا۔ اس لئے اسے بے وقوف بناتے ہوئے مجھے مطلق شرمندگی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی طرح کئی دوسرے بھی بے وقوف بنے اور میری جھولی بھر گئے۔ شام تک اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے۔ وہ بھی میں نے پتول کو دے دیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ محلے کے سرکردہ لوگوں کا وفد آ گیا۔

کہیے۔" میں نے باہر آ کر پوچھا۔

"آپ اپنی پتنی کو لے کر مانک کی شادی میں آئیں۔"

"میں کلکتہ جا رہا ہوں۔"

"کب؟" اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور پھر اٹھ کر اٹیچی میں کپڑے رکھنے لگا۔ وہ بھی میری مدد کر رہی تھی۔ تیاری مکمل کرتے ہی میں باہر نکل آیا۔



سوتے جاگتے کلکتہ کا سفر طے ہو گیا۔

"کیسے آنا ہوا؟" سرسوتی نے پوچھا۔

"تم سے ملنے چلا آیا۔"

"اچھا!" وہ خوش ہو گئی۔ "ٹھہرے کہاں ہیں؟"

"کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا۔"

"چلئے، میں ایک دو اچھے اور سستے ہوٹل دکھا دیتی ہوں۔"

واقعی اسے ہوٹلوں کی پہچان تھی۔ "پنتھ نیواس" صاف ستھرا ہوٹل تھا۔ کرایہ بھی کم تھا۔ پہلی منزل پر مجھے کمرا ملا۔ کمرے میں پہنچتے ہی میں نے کہا۔ "بھئی میں تو نہانے چلا۔" اور باتھ روم میں داخل ہو گیا۔

نہا کر نکلا تو تھکن میں کمی آ چکی تھی۔ کھڑکی سے باہر نظر پڑی تو میرا دل دھڑک اٹھا۔ ہوٹل کے دروازے پر آگے پیچھے تین جیپیں رکی تھیں۔ ان میں پولیس والے سوار تھے۔ وہ سب رائفلیں سیدھی کیے ہوٹل کا محاصرہ کر رہے تھے۔ مجھے ہر جانب سے خطرے کی بو آنے لگی۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں حیران و پریشان کھڑا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سرسوتی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر بیرا کھڑا تھا اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہوٹل پر چھاپا پڑا ہے۔ آپ دونوں اپنے آپ کو میاں بیوی ظاہر کریں گے۔ رجسٹر میں بھی یہی لکھا گیا ہے۔"

"دھنیہ واد۔" میں نے ٹھیٹ ہندی میں شکریہ ادا کیا۔

اس کے جاتے ہی سرسوتی کھڑی ہو گئی۔

"کہاں چلی؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہاری بیوی ہوں مہمان نہیں۔ اس لیے نہانے چلی۔" اس نے مسکراتے ہوئے غسل خانے کی جانب قدم بڑھا دیا۔

"مگر تم نہا کر پہنو گی کیا؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے یقین ہے تم باتھ روم میں نہیں جھانکو گے۔" اس نے شوخی سے کہا اور اندر داخل ہو گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"آ جاؤ دروازہ کھلا ہوا ہے۔" میں نے جواباً کہا۔ دروازے کو دھکا دے کر اندر آنے والوں کو دیکھتے ہی میرا دل دھڑک اٹھا۔ سب سے آگے ایک افسر تھا اور اس کے پیچھے

آٹھ دس سپاہی۔ افسر نے میرے سینے کی جانب رول سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا نام ہے؟''

''ونود!'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں سے آئے ہو؟''

''بہرام پور سے سیر کے لیے آیا ہوں میرے ساتھ میری بیوی بھی ہے اور کیا پوچھنا ہے؟'' میں نے چڑ کر جواب دیا۔

مجھے تیز لہجے میں بولتے دیکھ کر وہ مرعوب ہو گیا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے دوبارہ چوٹ کی۔ ''میں ڈی آئی جی سے پوچھوں گا۔ کسی کو بلا جواز پریشان کیوں کیا جاتا ہے''۔

میری بات سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے سوچا ہوگا، میں بھی کوئی افسر ہوں وہ کچھ سہم بھی گیا اور بولا۔ ''سر! معافی چاہتا ہوں بات دراصل یہ ہے کہ امورل ایکٹ کو سختی سے لاگو کرنے کا حکم ہے اسی لیے ہم لوگ ہر ہوٹل کو چیک کر رہے ہیں تاکہ جسم فروشی بند ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے جاؤ میں سونا چاہتا ہوں۔''

شاید وہ اسی انتظار میں تھا۔ میری بات ختم ہوتے ہی ایسے بھاگا جیسے میں اس کا پروانہ موت جاری کرنے والا ہوں۔ اس کے جاتے ہی باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز ہوگئی اور پھر سرسوتی گیلے بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے باہر نکل آئی۔ بھیگا بھیگا حسن آنکھوں میں چبھنے لگا تھا۔ سرسوتی کو خدا نے دل کھول کر حسن عطا کیا تھا جسے اس نے نازوانداز کے حربوں سے مزید تیکھا کر لیا تھا۔ بھیگے جسم کو جس انداز میں وہ بل دیتی ہوئی باہر آئی تھی۔ قیامت کا منظر تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر کے بالوں پر تولیہ رگڑنے کا انداز اتنا ہیجان انگیز تھا کہ میری آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ اس نے نزدیک پہنچتے ہی کہا۔ ''تم واقعی چھپے رستم ہو۔ آسانی سے اسے ڈرا کر بھگا دیا۔'' اس کی کھلکھلاتی آواز پر میں نے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر میرے اندر کے آدمی نے روک دیا۔ بے حجابی میرے مذہب میں گناہ ہے۔ عورتوں کے ساتھ مردوں کو بھی نظریں جھکائے رکھنے کا حکم ہے پھر میں کیسے اپنی نگاہوں کو گناہ آلود کرتا اس لیے اس جانب پیٹھ کیے کھڑا رہا۔

''کیا بات ہے، مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہے کیا؟'' اس نے پوچھا۔

میرے اندر پھریری سی اٹھ رہی تھی۔ لاوا سا ابلنے لگا تھا۔ فردوس سے دور رہتے ہوئے میں نے دو سال گزار دیے تھے۔ مرد تھا اور مرد کے جذبات کچھ زیادہ ہی منہ زور ہو



کہیں منہ زور جذبے مجھے جہنم کا ایندھن نہ بنا دیں۔ اسی ڈر سے میں نے خشک ہوتے گلے کو تر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تھک گیا ہوں پلیز! مجھے سونے دو۔''

''سو جاؤ میں نے کب منع کیا ہے۔''

''تم کب جاؤ گی؟''

''ارادہ تو نہیں لیکن تمہارا موڈ نہیں ہے تو جانا ہی پڑے گا۔''

اسے جانے کے موڈ میں دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''ایک بات بتاؤ گی؟''

''بولو!''

''کیا وہاں دو مسلمان لڑکیاں بھی ہیں؟''

''کہاں؟''

''ارے بھائی وہیں جہاں تم رہتی ہو۔''

''اچھا! وہاں۔ ان دونوں کا کیا نام ہے؟''

''ایک کا نام صبیحہ اور دوسری......''

''کہیں تم پاکستانی صبیحہ کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟'' اس نے درمیان میں ہی میری بات اچک لی۔

''ہاں!''

''بے چاری، وہ دونوں غیور خاندان کی تھیں عزت کی جگہ جان دے دی۔ مرشد آباد پہنچنے کے دوسرے ہی دن انہوں نے چوڑیاں پیس کر پھانک لیں۔''

پاکستان اسی لیے تو بنایا گیا تھا کہ برصغیر میں ہماری عزت و آبرو اور تشخص محفوظ نہیں تھا اور ہم جان سے بڑھ کر عزت کی حفاظت کرتے ہیں۔

''کیا سوچنے لگے؟'' اس نے سوال کیا تو میرے خیالات بکھر گئے۔

''یہ کب کی بات ہے؟''

''بتایا تو ہے، پاکستان سے جس دن انہیں لایا گیا، اسی کے اگلے دن۔''

''اچھا!'' میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اس وقت میرا دل چاہتا تھا کہ اپنا سر پیٹ لوں خواہ مخواہ ڈیڑھ سال تک ہندوستان میں دھکے کھاتا رہا۔ یہی بات اگر مرشد آباد پہنچتے ہی پوچھ لیتا تو وقت ضائع نہ ہوتا۔

''آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں، ساری رات جاگ کر سفر کیا ہے۔ تھکن سے بدن چور ہے۔"
"مالش کر دوں؟"
"نہیں میں سونا چاہتا ہوں۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے آپ آرام کریں، میں شام میں آؤں گی۔" کہتے ہوئے وہ کھڑ
ہوگئی۔

اس کے جاتے ہی میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب واپسی کیسے ہو؟ کس را
سے بارڈر کراس کروں؟ یکایک میرے دماغ نے سرگوشی کی۔ "اگر تُو کنائی سنیال جیسے دیمکو
سے اپنے ملک کو محفوظ کرنا چاہتا ہے تو اس کے مرکز کو تباہ کر دے۔ یہی مناسب ہے۔ ورنہ ا
فیکٹری میں ہزاروں کنائی سنیال پیدا ہو جائیں گے۔"

اس خیال نے مجھے نئی راہ سجھائی اور میں نے اسی وقت سامان سمیٹا اور ہوٹل کا بل ا
کر کے بس اسٹینڈ پر آ گیا۔ اتفاق سے مرشد آباد جانے والی ایک بس تیار کھڑی تھی۔ اس بر
میں سوار ہو گیا۔ راستے بھر میرے دماغ میں دو شکلیں ابھرتی رہیں۔ ان میں ایک سرسوتی کی تھ
وہ بے چاری قسمت کی ماری مجھے نہ پا کر کتنا پریشان ہوگی۔ اور دوسری شکل بھی پریشان پریشا
سی نظر آ رہی تھی۔ وہ شکل تھی پتول کی۔ پتول جو خواہ مخواہ کمبل ہو رہی تھی۔ اپنی موت کو آواز دے
رہی تھی۔ مجھے یقین تھا مرشد آباد کے شہر بہرام پور پہنچتے ہی وہ پھر ضد شروع کر دے گی۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ رات دو بجے بہرام پور کے بس اسٹینڈ پر اترا اور رکشا لے کر
نوتن پاڑا پہنچا تو پتول سو رہی تھی۔ میری آواز پر ایسے دوڑتی ہوئی آئی گویا میرے انتظار میں ہ
بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی۔ میرے ہاتھ سے اٹیچی لے کر
بولی، بڑی جلدی لوٹ آئے؟ میں نے جواب نہ دیا اور اسی کے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس نے
اپنے لیے دوسری چارپائی پر بستر بچھا لیا۔

☆======☆=====☆

صبح آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا اور ناشتا کر کے باہر نکل
آیا۔ میرے قدم امارا بنگالی کے دفتر کی سمت اٹھ رہے تھے۔ ابھی میں راستے میں ہی تھا کہ میری
نظر ایک رکشا پر پڑی اور میں چونک گیا۔ رکشا پر کنائی سنیال بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ جو آدمی تھا
اسے بھی میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ کشور تھا جس کے ساتھ جا کر میں نے انیل کی لاش حاصل کی



تھی۔ میں نے بھی رکشا لیا اور اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ پتلی پتلی گلیوں سے ہوتا ہوا ان کا
رکشا ایک عمارت کے سامنے جا کر رک گیا۔ میں نے بھی اپنا رکشا رکوا لیا۔ جب وہ دونوں اندر
داخل ہو گئے تو میں بھی گیٹ کی سمت بڑھا۔

گیٹ پر بندوق کندھے سے لٹکائے ایک چوکیدار بیٹھا تھا۔ چوکیدار کو دیکھتے ہی میں
سمجھ گیا کہ یہ کوئی اہم عمارت ہے۔ اسے اندر سے دیکھنے کی خواہش کو میں دبا نہ پایا اور پچھلی جانب
سے اندر کود گیا۔ دیوار اور عمارت کے درمیان آم کا چھوٹا سا باغ تھا۔ اس باغ سے ہوتا ہوا چھپتا
چھپاتا میں عمارت کی پشت پر پہنچ گیا۔ پچھلی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ شاید خدا کو میری کامیابی منظور تھی۔
اس سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی تھی۔ میں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھا، دونوں ہاتھوں پر جسم کو
تولا اور پھر اوپر کی جانب اٹھتا چلا گیا کھڑکی سے اندر کودا تو ہلکی سی دھمک پیدا ہوئی، میں وہیں دبک
کر بیٹھ گیا لیکن جب کوئی ادھر نہ آیا تو میں اٹھا اور دبے قدموں کمرے سے باہر کی جانب بڑھا۔
باہر گلیارے میں نکل کر دیکھا کہ دونوں جانب ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح برابر برابر دس بارہ
کمرے بنے تھے۔ پہلے کمرے کے دروازے کو میں نے کھولنا چاہا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ میں
نے چابی کے سوراخ سے اندر جھانکا۔ اندر اندھیرا سا چھایا تھا۔ روشن دان سے چھن کر آنے والی
ہلکی روشنی میں جو کچھ مجھے نظر آیا اسے دیکھتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا اندر طرح طرح کا
اسلحہ رکھا ہوا تھا مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب ہمارے وطن عزیز کی بنیاد ہلانے کے لئے جمع
کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے کمرے میں جھانکا۔ وہ کمرہ کھلا ہوا تھا اور اس میں بھی اسلحہ بھرا
تھا۔ لیکن سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کمرے کے فرش میں چوکور خلا تھا۔ میں دبے پاؤں اسی خلا
تک پہنچا اور اندر جھانکا۔ نیچے سیڑھی بنی تھی اور وہاں سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دو
آدمیوں کی آواز تھی۔ ان میں ایک آواز کنائی سنیال کی تھی۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ "میں
نے وہاں پوری طرح پیر جما لیے ہیں۔ کسی طرح اسلحے کو بارڈر پار کرانے کی ضرورت ہے۔" اس
کے آگے میں کچھ نہ سن سکا۔ میرے دماغ پر غصے نے قبضہ جما لیا تھا۔

کہتے ہیں غصہ حرام ہے۔ غصہ عقل کو کھا جاتا ہے۔ ہر کام سے پہلے سوچنا چاہیے لیکن
میں نے آگے پیچھے کی کچھ نہ سوچی اور وہیں سے دو ہینڈ گرینڈ اٹھا لیے دانتوں سے بجلی کی سی
تیزی سے پن نکالے اور انھیں اندر کی جانب لڑھکا کر تیزی سے باہر کی جانب بھاگا۔ اس وقت
میرے جسم میں برق کی رو سی دوڑ گئی تھی اور میں تیز رفتاری سے دوڑا تھا لیکن حادثہ مجھ سے بھی
تیز نکلا۔ کھڑکی سے باہر کودتے ہی زوردار دھماکہ ہوا لیکن بے ہوش ہونے سے ایک پل

پہلے مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھ پر پوری عمارت آ گری ہے۔ ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھا۔ اسپتال کی سفید چادر والے بیڈ پر لیٹے لیٹے جب میں نے کروٹ بدلنا چاہی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرا داہنا پیر ٹخنے سے غائب تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ معذور ہو جاؤں گا لیکن قسمت نے یہ دن بھی دکھا دیا۔

اس بے کسی کے دور میں پتول نے میرا بڑا ساتھ دیا اس نے دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دن رات ایک کر کے میری خدمت کرتی رہی۔ اس کی بے لوث خدمت نے مجھے ٹوٹنے بکھرنے سے بچا لیا۔ اسپتال میں تین ماہ گزار کر جب میں نوتن پاڑا واپس آیا تو عیادت کرنے والوں کا ایک جم غفیر میرے گھر پر جمع ہو گیا۔ ہر ایک مجھے ''پنڈت جی آپ کو نیا جنم ملا ہے۔'' کہہ کر مبارکباد دے رہا تھا۔

بھیڑ چھٹنے کے بعد میں نے پتول سے کہا ''پتول! میں نے تم سے ایک بات تو پوچھی ہی نہیں۔''

''کون سی؟''

''اسپتال میں ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی تھی اس لئے پوچھ نہیں پایا کہ مجھے حادثہ کہاں پر پیش آیا تھا؟''

''رام رام اتنا بھیانک حادثہ تھا کہ کیا بتایا جائے۔ پوری عمارت روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئی تھی۔ عمارت کے ملبے سے تین لاش نکلی تھیں آٹھ دس راہ گیر اور چوکیدار بھی مارے گئے۔ پتا نہیں آپ کس طرح ملبے کی زد میں آ گئے؟''

''عمارت میں ہوا کیا تھا؟'' میں نے پوچھا

''اخبارات میں لکھا تھا کہ اس عمارت میں اسلحے کا ڈپو تھا۔ امر بنگالی کے لوگ وہاں اسلحہ جمع کر رہے تھے کہ کسی طرح ڈپو میں آگ لگ گئی۔ قیاس ہے کہ بجلی کے سرکٹ سے آگ لگی ہے۔'' پتول نے بتایا۔

''مرنے والوں کا نام معلوم ہوا؟''

''نام کو پولیس کے کچھ افسران نے چھپانے کی کوشش کی ہے معاملے کو بھی دبا دیا گیا ہے پھر بھی اخبارات میں نام آ ہی گئے۔ ان میں ایک کشور تھا، دوسرا بھومک، تیسرا کنائی سنیال، چوتھا چوکیدار رام شرن۔''

''بس!'' میں نے اسے روک دیا کیوں کہ مجھے جو معلوم کرنا تھا کر لیا۔ میرا سب



ے بڑا دشمن جہنم واصل ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے مفلوج ہونے کا بھی غم نہیں تھا۔ اس لئے میں اس ن آرام کی نیند سویا۔ شام کے وقت پتول نے بیدار کیا۔ اسی نے ہر روز کی طرح ہاتھ منہ ھونے میں میری مدد کی اور پھر چائے دے گئی۔

''سنو!'' میں نے اسے پکارا۔

''جی!''

''بیٹھو، تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔''

''کیا؟''

اس کے بھولے چہرے پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے میں نے کہا۔ ''پتول! تمہیں یاد ہوگا میں نے ایک بار بتایا تھا کہ جیسور میں میری کچھ زمینیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں انہیں فروخت کر دوں۔''

''وہاں کی زمینوں پر تو مسلمانوں نے قبضہ کر لیا ہوگا؟''

''نہیں، اسپتال میں ایک آدمی سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی میرے محلے کا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اب تک میری زمینوں پر کسی نے قبضہ نہیں کیا ہے۔''

''لیکن آپ جائیں گے کیسے؟''

''اس کے لیے راستہ تلاش کر رہا ہوں لیکن تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔''

''کیسا وعدہ؟''

''تمہیں کسی اچھے لڑکے کو پسند کر لینا ہوگا۔''

''نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''سمجھنے کی کوشش کرو پتول! میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ اپنے آپ کو تباہ مت کرو تمہیں میری سوگند، کسی کا ہاتھ تھام لو۔''

''اگر یہ آپ کا حکم ہے تو میں پورا کرنے کی کوشش کروں گی مگر یاد رکھیے آپ کو کبھی بھلا نہیں پاؤں گی۔''

''تو میں تمہارے لیے لڑکا تلاش کروں؟''

''یہ کیوں نہیں کہتے تمہارے لیے موت تلاش کروں؟'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیلاش تمہیں کیسا لگتا ہے؟''

''آپ کی پسند مقدم ہے۔سزائے موت پانے والا یہ نہیں کہتا میری موت ایسی ہو۔''

اس سے دماغ کھپانا فضول سمجھ کر میں بیساکھی کے سہارے باہر نکل آیا اور پھر کیلاش کے گھر کی جانب چل پڑا۔اس کے دروازے پر پہنچتے ہی میں نے آواز دی۔

''ہری گوسائیں۔''

پہلی آواز پر ہی کیلاش گوسائیں کا باپ ہری گوسائیں نکل آیا۔مجھے دیکھتے ہی بولا۔

'آیئے آیئے پنڈت جی،آج تو میرے گھر کے بھاگ جاگ اٹھے۔''

وہ مجھے سہارا دے کر اپنے گھر میں لے گیا۔

غریبوں کے گھر میں صوفہ سیٹ نہیں ہوتا مگر اخلاق ومحبت ہوتی ہے۔اس نے پلنگ پر بچھی میلی سی چادر کو درست کر کے مجھے بٹھادیا۔میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔''ہری!تم شاید نہیں جانتے کہ میں''بال برہمچاری'' ہوں۔میری بات پر چونک گئے ہوگے کہ جب میں نے ہنومان جی کے نام پر شادی نہ کرنے کی قسم کھائی ہے تو پھر پتول میری کون ہے؟ تو سنو!''میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر گہرا سانس لیا اور پھر بولا۔''پتول میری بہن سمان ہے۔اگر لوگوں کو یہ معلوم ہوجاتا کہ پتول میری کوئی نہیں ہے تو لوگ اس کا جینا دوبھر کر دیتے اس لیے جھوٹ مشہور کردیا کہ وہ میری پتنی ہے مگر یقین کرو وہ گیتا کی طرح پوتر ہے۔اگر اس کی شادی تم اپنے بیٹے سے کردو گے تو بھگوان خوش ہوگا۔تمہاری غریبی کے دن ختم ہوجائیں گے۔''

''پنڈت جی!آپ مہاپُرش ہیں۔دل کا حال جانتے ہیں۔آپ سے تو بھگوان بھی خوش ہے تبھی تو آپ کے آنگن میں زمین سے بھگوان کی مورتی نکلی ہے۔آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن......''

''لیکن کیا؟''میں نے پوچھا

''ایک گھر میں آپ بھی رہیں گے اور کیلاش بھی۔لوگ کیا کہیں گے؟''

''میں شادی کراتے ہی پاکستان چلا جاؤں گا۔وہاں میری زمینیں ہیں۔اگر نہیں گیا تو مسلمان ان پر قبضہ جمالیں گے۔تم سب سے کہہ دو بھگوان نے مجھے خواب میں درشن دیا ہے کہ میں اپنی بیوی کی شادی تمہارے بیٹے سے کرا کر ہری دوار برندابن چلا جاؤں اور اپنی باقی عمر وہیں گزار دوں۔''



''جو حکم۔''اس نے کہا۔

''اور سنو!پاکستان پہنچانے والے کسی دلال سے بات کرو جو مجھے باآسانی پہنچا دے مگر یہ بات راز میں رہنی چاہیے۔''

''جی اچھا!''اس نے کہا۔

ہری کے گھر سے لوٹ کر میں نے رکشا لیا اور امارا بنگالی کے دفتر پہنچ گیا۔مجھے دیکھتے ہی شریمان نے کہا۔''کہیے ونود جی اب کیسے ہیں؟''

''سب پربھو کی مایا ہے۔بتاؤ کتنا کام ہوا ہے؟''

''ہماری تو کمر ٹوٹ گئی ہے۔لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔پورا اسلحہ خانہ تباہ ہوگیا ہے۔''

''حادثہ کیسے ہوا؟''اس بارے میں سوال کرتے ہی اس نے بنی بنائی کہانی شروع کردی۔اکتا کر میں نے کہا۔''میں پاکستان جارہا ہوں تاکہ اپنا ادھورا کام پورا کردوں جو کام انیل نہیں کرسکا اسے میں پورا کروں گا۔''

''جاتے وقت مل کر نئی ہدایات لے کر جایئے گا تاکہ وہاں ٹھہرنے میں آپ کو پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

''جی ہاں۔جانے سے پہلے آپ سے مل لوں گا تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ وہاں پہنچ کر مجھے کیا کرنا ہے۔''

''بھئی،آپ کو ٹریننگ کے وقت بتایا تو تھا۔''

''میں ان دنوں نجی پریشانیوں کا شکار تھا اس لیے کلاس اٹینڈ نہیں کرسکا تھا۔''

''سیدھی سی بات ہے۔ہمارے کارکنوں کی بس ایک ہی ڈیوٹی ہے۔وہاں پہنچ کر تعصب پھیلانا شروع کردیں۔مذہبی'گروہی'لسانی'جس سبجیکٹ کی آپ نے ٹریننگ حاصل کی ہے اسی پر کام بھی کرنا ہوگا۔اگر مسلکی تعصب کی ٹریننگ کی ہے تو مسلکی تعصب۔گروہی یا لسانی حاصل کی ہے تو اسی میدان میں جم کر تعصب پھیلانا ہے تاکہ اسلام کا بھوت مسلمانوں کے سر سے اتر جائے اور آپس میں جوتے بازی شروع ہوجائے اور ہمیں اس ملک پر قبضہ کرنے میں آسانی ہو۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن جناب!یہ تو کافی طویل مدت کا فارمولا ہے۔''

''یہ وقت ضرور لیتا ہے لیکن کامیابی کی صد فیصد امید ہوتی ہے۔ہسپانیہ کی مثال

سامنے ہے۔اس ملک پر بھی ملیچھ مُسلوں نے ایک ہزار سال حکومت کی تھی لیکن عیسائیوں نے انہیں کیسا ختم کر دیا۔اس ملک میں آج ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ پہلے انہیں لڑایا پھر خود حملہ کر دیا۔اسی فارمولے کو ہم استعمال کریں گے۔''

''جی اچھا' میں جاتے وقت مل لوں گا۔'' کہتے ہوئے میں لوٹ آیا۔

لوٹنے میں جلدی اس لیے کی تھی کہ غصے نے میرے دماغ پر پردہ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا تھا ان بدبختوں پر جو پہاڑ کی اوٹ میں لشکر نہیں دیکھ رہے تھے۔ مفاد پرستی کے لیے پھیلائی جانے والی تعصب کی آگ میں جل رہے تھے۔ جو اپنے آپ کو سندھی مہاجر پنجابی پٹھان بلوچ شیعہ سنی بنا کر پیش کر رہے تھے' اخوت اور بھائی چارے کا اسلامی سبق بھول گئے تھے۔ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے کنائی سنیال جیسے لوگوں کو موقع ملتا ہے۔ اپنے خیالوں میں اس طرح ڈوبا ہوا تھا کہ راستہ طے ہونے کا احساس تک نہ ہوا۔ خیالوں کا سلسلہ تب ٹوٹا تھا جب رکشا والے نے کہا نوتن پاڑا آ گیا۔

اس کی آواز پر میرے ذہن پر چھایا پردہ سرکا اور میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے پتول سے پوچھا۔'' مجھے ڈھونڈنے تو کوئی نہیں آیا تھا؟''

''جی ہاں' ہری گوسائیں جی آئے تھے۔''

''تم کھانا نکالو۔تب تک میں ان سے مل کر آتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں پھر مڑ گیا۔

ہری اپنے گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔''کیا خبر ہے؟ کہاں تھے آپ؟''

''ذرا کھگڑا تک گیا تھا۔''

''ارے' اتنی دور اکیلے چلے گئے!''

''اب تو زندگی بھر معذوری کو جھیلنا ہے؟'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

اس نے جواب نہ دیا۔ میرے لیے کرسی بچھا دی۔ میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''پتول بتا رہی تھی کہ آپ مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟''

''ہاں' ایک دلال سے بات ہوئی ہے۔ وہ آپ کو جیسور تک پہنچا دے گا۔''

''اس کا قافلہ کب جائے گا؟''

''وہ کل ہی جا رہا ہے۔''



''ٹھیک ہے میں تیار ہوں لیکن آپ کو وچن دینا ہوگا کہ پتول سے اپنے بیٹے کی شادی کرائیں گے۔''

''میرا وعدہ ہے۔ کہیے تو گیتا کی قسم کھا لوں۔''

''نہیں مجھے یقین ہے اب آئیے میں آپ کی بات پتول سے کرا دوں''۔

''چلیے۔'' کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کو ساتھ لے کر میں پتول کے پاس پہنچا۔ پتول کھانا نکال کر بیٹھی میرا انتظار میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے کہا۔''پتول! تُو ہری گوسائیں کے بیٹے سے شادی کر لے۔ میں کل ہی اپنی زمینوں پر لوٹ رہا ہوں۔''

''آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ زمین بیچ کر یہیں لوٹ آئیں۔'' اس نے دبے لفظوں میں مخالفت کی۔

''نہیں کم سے کم ایک ڈیڑھ سال میں لوٹنا ناممکن ہے۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں تم شادی کر لو۔ تمہیں تحفظ کی ضرورت ہے۔''

''ہاں بیٹی! تُو ہاں کر دے۔'' ہری گوسائیں نے لقمہ دیا۔

''جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔'' پتول نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسے راضی ہوتے دیکھ کر میں نے ہری سے کہا۔''دلال سے بھی بات کر لیں۔''

''میں نے پوری بات کر لی ہے۔ وہ صبح سویرے سکدار پاڑا کے راستے بارڈر کراس کرے گا۔ آپ تیار رہیے گا وہ یہیں سے آپ کو ساتھ لے گا۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے جلد سے جلد بھگانا چاہتا ہے۔ اتنی خوبصورت بہو کو حاصل کرنے کے لیے ہی وہ چال چل رہا ہے۔

''تو ٹھیک ہے' آپ جائیے۔ مجھے بھی کچھ کام ہے ایک بار پھر کھگڑا جانا ہوگا۔'' میں نے بیساکھی سنبھالتے ہوئے کہا۔

''چلیے میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔'' اس نے پیشکش کی۔

''نہیں' میں اکیلے جاؤں گا۔'' کہتے ہوئے میں گھر سے نکل پڑا۔ باہر آ کر رکشا لیا۔ اور کھگڑا بازار میں واقع امارا بنگالی کے آفس میں پہنچ گیا۔

میری قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ دفتر میں صرف شریمان جی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے

ہی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''سنا ہے تم پاکستان اپنی مہم پر جا رہے ہو؟''

''جی ہاں، براہِ کرم مجھے ان لوگوں کا نام پتا دے دیں جن سے ملنا ہے۔''

''بیٹھو میں لے کر آتا ہوں۔'' وہ برابر والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

بیٹھ کر انتظار کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ بیساکھی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھا۔ لاکھ کوشش کے بعد بھی بیساکھی کی کھٹ کھٹ کو روک نہیں پا رہا تھا۔ تیسری آواز کے ساتھ میں اندر والے دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے سے جھانکتے ہی میں نے دیکھا کہ شریمان الماری کے سامنے کھڑا فائل سے کچھ نوٹ کر رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے دروازے کی چوکھٹ کو تھاما اور اکلوتے پیر پر بوجھ ڈال کر ایک بیساکھی کو سیدھا کیا اور پھر پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا اس اچانک حملے سے وہ بوکھلا گیا اور پھرتی سے پلٹا میں نے دوسرا وار کیا تو وہ چاروں خانے چت گر گیا۔ میں نے وہیں سے چھلانگ لگائی اور اسے چھاپ بیٹھا۔ میں بھول گیا تھا کہ اب میں پہلے ایسا ضیغم نہیں ہوں۔ معذور ہو چکا ہوں۔ اس نے پلٹی کھائی اور مجھے اپنے نیچے داب لیا۔ وہ تابڑ توڑ گھونسے برسا رہا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا بے ہوش ہو چکا ہوتا لیکن سوم رس کے اثر نے مجھے چوٹ کی تکلیف سے محفوظ رکھا تھا۔ غصے نے جب بے چین کر دیا تو میں نے تیندوے کا حربہ آزمایا اور اس کے نرخرے پر دانت گاڑ دیے۔ میں نے اسے اس طرح دانتوں سے بھنبھوڑا کہ اس کا نرخرا ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا اور خون کا فوارہ سا ابل پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا تڑپتا ہوا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کی لاش پر تھوک کر میں نے بیساکھی اٹھائی اور اس کے سہارے آگے بڑھا۔ الماری کھولی اور وہ فائل نکالی۔ اس پر نظر ڈالتے ہی میرا وجود کانپ اٹھا۔ بڑے بڑے ستونوں کے نام اس میں بحیثیت ایجنٹ لکھے تھے۔ ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں کے اس میں نام تھے۔ اس فائل کو اپنی قمیص کے اندر رکھ کر بنیان کو پائجامے کے اندر اڑس لیا تاکہ فائل گر نہ جائے پھر باقی کاغذات کو اس کی لاش پر گرایا اور ماچس کی تیلی دکھا دی۔ وہاں سے فارغ ہو کر نوتن پاڑا لوٹ آیا۔

اس رات میں نے بھرپور نیند کا مزہ لیا اور صبح دلال کی آواز پر بیدار ہو گیا۔ پتول نے نم آنکھوں سے وداع کیا۔ دلال کی جیپ سکدار پاڑا کی جانب چل پڑی۔ صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے ہم لوگ پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ وہاں پہلے سے دوسری جیپ کھڑی تھی۔ اس پر سوار ہو گئے۔ پہلی جیپ لوٹ گئی۔ ہماری جیپ تیز رفتاری سے راج شاہی کی جانب چل



۔ نو بجے تک ہم لوگ راج شاہی پہنچ گئے۔ پدما بورڈنگ میں تین کمرے ان لوگوں نے
س کرا رکھے تھے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ان کا ارادہ تھا جیسور جانے کا لیکن میں نے
، جانے سے انکار کر دیا۔ انہیں معاوضہ دینے کے بعد رکشا پر سوار ہو کر میں حمید ابڑو کے گھر
۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لپٹ گیا۔ ڈیڑھ سال بعد ملاقات ہوئی تھی مگر اس میں وہی جوش و جذبہ
کھلے دل سے ملا۔ میرے پیچھے اس نے کیا کیا کیا تھا، وہ بھی بتایا۔ اسی نے مجھے ڈھاکا تک
نے کا انتظام کیا۔ جس وقت میں کملا پور اسٹیشن پر اترا میرا دل رو اٹھا تھا۔ اسی اسٹیشن سے
راج شاہی کے لیے چلا تھا تو میرے دونوں پیر سلامت تھے اور جب واپس آیا تو ایک پیر
روم تھا۔

''بے وقوف! بزدلی کی باتیں سوچ رہا ہے۔ تیری ٹانگ وطن کے نام پر قربان ہوئی
تُو خوش قسمت ہے۔'' میرے دماغ نے سرزنش کی تو میں سنبھل گیا۔ اپنے آنسو پونچھے اور
پر سوار ہو کر بونو گرام کے لیے چل پڑا۔ گھر پہنچتے ہی ذہن کو خوشگوار جھٹکا لگا۔ گھر کے اندر
ردوس کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ بنگلہ میں کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے
ے پر دستک دی۔ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولا تھا فریدہ نے، میری حالت دیکھتے ہی
نے چیخ ماری اور پھر اندر داخل ہوتے ہی میرا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ بڑی مشکل سے انہیں
کرایا۔ میرا بیٹا ذوالفقار جواب کھڑے ہو کر چلنے لگا تھا' دور کھڑا مجھے حیرت بھری نگاہوں
یکھ رہا تھا۔ میں نے اسے چمکارتے ہوئے پاس بلایا تو وہ ڈر کر اندر بھاگ گیا۔ فردوس
بردستی اسے لا کر میری گود میں ڈال دیا۔

دن تو ملنے ملانے میں گزر گیا لیکن جب رات آئی تو ایک نئے خطرے نے سر

فردوس سے اتنے دنوں بعد مل رہا تھا مگر دل میں دہشت تھی۔ جنگلیوں کے حکیم کا
بار بار ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ اس نے بیوی سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا اور یہاں بیوی
ہوا رتھی۔ فردوس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''لوگوں نے آپ
رے میں عجیب عجیب باتیں مشہور کر دی تھیں۔ کہتے تھے کہ آپ اب کبھی لوٹ کر
آئیں گے۔''

''ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گی۔'' میں نے کہا

"نہیں۔ کہیے۔" اس نے ہاتھ روک کر کہا۔

"میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ آرام سے سونے دو۔ تم دوسرے کمرے میں جاکر سوجاؤ"۔

"جی اچھا" کہہ کر اس نے بچے کو اٹھایا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ آج تو اسے ہٹا دیا کل کون سا بہانہ کروں گا۔ میرا دماغ رہنمائی سے قاصر تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک میں اپنے آپ سے لڑتا رہا اور پھر نیند آگئی۔

اگلے دن اٹھتے ہی میری ملاقات ابو لبشر سے ہوئی اس نے ایمانداری سے دکانداری کی تھی، حساب دکھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "بھیا! ایک بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے؟"

"نہیں، بولو؟"

"آپ کے طفیل مجھے لمبی چوڑی اراضی مل گئی ہے۔ اب میں وہیں رہوں گا؟"

"گاؤں میں؟ لیکن کیوں؟"

"چاش کرنے والے فصل کی کٹائی کرتے وقت فصل کم دیتے ہیں۔ وہاں رہنے سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ وہ بہانہ بازی نہیں کر پائیں گے۔"

"جیسی تمہاری مرضی؟" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کل سے میں دکان سنبھال لوں گا۔"

اگلے دن صبح صبح رکشا پر سوار ہو کر دکان پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی آس پاس کے دکاندار ملنے کے لیے پہنچ گئے۔ صبح سے شام تک سلسلہ چلا۔ رات کو جب میں لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہکا پہنچ گیا۔ دوسروں کی طرح اس نے بھی میری ٹانگ کٹنے پر افسوس کا اظہار کیا اور پھر بولا۔ "استاد آپ کے دوست نے ناک میں دم کر دیا ہے۔"

"کس دوست نے؟"

"تراب فاروق صدیقی نے۔"

"اچھا!"

"ہر دو تین روز بعد وہ سر پر سوار ہو جاتا ہے کہ مجھے کچھ آدمی چاہئیں ہم اپنی روزی



روٹی دیکھیں یا اس کی مدد کریں۔"

"وہ کرتا کیا ہے؟"

"کنائی سنیال ایک گروہ ہے وہ اس کے آدمیوں کو پکڑتا ہے اور پھر ان کے سر مونڈھ کر پورے علاقے میں گھماتا ہے۔"

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ سانپ کا سر میں کچل آیا باقی کام وہ کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں اسے سمجھا دوں گا اور اب کبھی تمہارے آدمیوں کی ضرورت پڑی تو دیہاڑی دلوا دوں گا۔" میں نے دکان بند کرتے ہوئے کہا۔

صبح ہی رکشا والے سے کہہ دیا تھا کہ وہ ہر روز صبح شام پہنچ جایا کرے۔ اپنے وعدے کے مطابق وہ پہنچ گیا تھا۔ اور ہکا سے مصافحہ کرنے کے بعد میں رکشا پر بیٹھ گیا رکشا والے سے بولا۔ "ممتاز! گھر کی بجائے حسینی دالان چلو۔"

"صاحب جی! واپسی میں کافی دیر ہو جائے گی۔ بی بی جی پریشان ہو جائیں گی۔"

"تم مجھے پہنچا کر خبر کرنے چلے جانا"۔

"کیوں نہ ان کو بتاتے ہوئے چلا جائے۔"

"ہاں، یہ بھی صحیح ہے۔"

رکشا پر بونو گرام پہنچے پھر وہاں سے حسینی دالان۔ تراب فاروق صدیقی گھر پر ہی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گیا۔ میری ٹانگ پر افسوس کا اظہار کرنے کے بعد اس نے اپنی کارگزاری کی رپورٹ دی۔ اس نے اکیلے ہوتے ہوئے کئی کارنامے انجام دیے تھے۔ کنائی سنیال کے گروہ کا اس نے قلع قمع کر دیا تھا۔ وہ سب بکھر کر رہ گئے تھے۔ اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو، دشمنان وطن کی پوری لسٹ لے کر آیا ہوں چن چن کر ختم کروں گا۔"

"ایسا کیوں نہیں کرتے کہ یہ لسٹ اپنے دوست کو دے دو۔" تراب نے کہا۔

"کس دوست کو؟" میں نے پوچھا۔

"وہی، محکمہ خفیہ کا بڑا افسر۔"

"یاد رکھو، سرکاری افسران کے پاس جتنے اختیارات ہوتے ہیں، وہ اتنے ہی مجبور ہوتے ہیں۔ سیاسی پیچیدگیوں کے باعث وہ ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے ہیں اس کا ایک ہی علاج ہے۔"

"کیا؟"

"وقت آنے پر دیکھ لینا۔ فی الحال تم ایسا کرو کہ حمید ابڑو کو یہیں بلوالو کیونکہ میں آدھا ہوگیا ہوں۔"

"جو حکم۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"رات کافی ہوگئی ہے میں چلتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے بیساکھی اٹھالی۔ گھر پہنچتے پہنچتے تھکن نے بے حال کردیا۔ جاتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ صبح آنکھ کھلی تھی فردوس کے جھنجھوڑنے پر۔ اس نے بتایا کہ تراب آیا ہے۔ جلدی جلدی چہرے پر چھینٹے مارے اور باہر نکل آیا۔ اسے ساتھ لے کر دکان پہنچا اور پھر وہاں بیٹھ کر لائحہ عمل پر غور کرنے لگا۔

اس کا کہنا تھا کہ فوراً ان سب پر دھاوا بول دیا جائے مگر میں اس سے متفق نہیں تھا کیوں کہ جن لوگوں کا نام مجھے فائل میں ملا تھا، وہ سب اہم شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ سب کنڈلی مارے زہریلے ناگ تھے۔ ان پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب تھا اپنی موت کو دعوت دینا۔ ان کے پاس میڈیا تھا۔ ان کے پیچھے لوگ تھے اور میں اکیلا تھا اس لیے میں آہستہ آہستہ ان کا صفایا کرنا چاہتا تھا تاکہ حکومت لاعلم عوام کے دباؤ میں آکر مداخلت نہ کرے اور ان کے فریب میں جکڑے ہوئے معصوم ذہن بھی شور نہ مچا سکیں۔ میرا پہلا نشانہ ایک بہت بڑے روزنامے کا ایڈیٹر تھا جس کا قلم لگاتار مملکت خداداد کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ اس کے قلم میں جادو تھا اس لیے سیدھے سادے عوام اس کی باتوں میں آکر اپنے بھائیوں سے نفرت کرنے لگے تھے۔ تعصب پھیلانے میں بہت اہم کردار ادا کر رہا تھا اس لیے اس کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا ہی بہتر تھا۔

میں اس کے گرد اپنا جال پھیلا ہی رہا تھا کہ حکومت کا تختہ پلٹ گیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی جگہ جنرل یحییٰ خان نے لے لی اور میرا سب سے بڑا دشمن شیخ مجیب الرحمٰن رہا ہوگیا۔

ملک میں فوجی قانون نافذ کردیا گیا۔ مفاد پرستوں کا ٹولہ زیرزمین چلا گیا تھا۔ اس قلمکار نے بھی اپنے قلم پر لگام لگادی تھی۔ اس لیے میں بھی خاموش ہوگیا۔ وقت گزرتا رہا اور پھر یحییٰ خاں نے حکومت عوامی نمائندوں کو سونپنے کا اعلان کردیا۔ انتخابی جلسوں کا آغاز ہوگیا۔

ہر انسان اندر سے تشدد پسند ہے خود کو دوسروں سے افضل سمجھتا ہے اور افضل ہونے



کا احساس نفرت کو جنم دیتا ہے اور نفرت تشدد پر ابھارتی ہے۔ اسی کمزوری کا شیخ مجیب نے فائدہ اٹھایا اور نفرت کی آگ کو ہوا دینا شروع کردی۔ نفرت کی بھڑکتی ہوئی آگ نے جذبہ اسلامی کو نگلنا شروع کردیا اور کریسنٹ جوٹ مل کا المیہ رونما ہوگیا۔

سیاست سے کوسوں دور دو وقت کی روٹی کے لیے اپنا خون جلانے والے مزدور سیاست کی سولی پر چڑھا دیے گئے۔ ایک دن میں ڈھائی سو اردو بولنے والے مزدوروں کو جوٹ مل میں بند کرکے قتل کردیا گیا۔ جھم جھم پور، خالص پور اور سانتاہار میں کئی ہزار اردو بولنے والے مزدوروں کو جوٹ مل میں بند کرکے قتل کردیا گیا۔ بڑھتے ہوئے تعصب کو دیکھ کر فوج نے بحالت مجبوری ایکشن لے لیا۔ پچیس مارچ کی درمیانی شب کو فوج نے بیرک سے باہر آکر اردو بولنے والوں پر کیے جانے والے حملوں کو روکنا شروع کردیا۔ فوج کے اس اقدام سے قانون تو نافذ ہوگیا مگر ہندوستان کو بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ہندوستانی ذرائع ابلاغ نے نام نہاد ظلم کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کردیا اور جعلی تصاویر کی نمائش شروع ہوگئی۔

دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں ہندوستانی سفارت خانوں کے باہر جعلی تصاویر لگادی گئیں جو ٹریک فوٹو گرافی کا کمال تھا۔ دوسری جانب ہمارے لیڈر خاموش تھے۔ سرکاری سطح پر قرطاس ابیض شائع کرکے جان چھڑالی تھی۔ یہاں وہاں سے عجیب عجیب خبریں آرہی تھیں جنھیں سن سن کر میں پیچ وتاب کھا رہا تھا لیکن کچھ کر نہیں سکتا تھا ایک کے بعد ایک کئی مہینے گزر گئے۔

اس درمیان ایک بار بھی میں بکرم پور نہیں گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ وہ حادثہ تھا جس نے مجھے اور فردوس کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ فردوس کے والد ابوالکلام صاحب پکے مسلم لیگی تھے۔ جوانی تحریک پاکستان کی نذر ہوئی قید وبند کی صعوبتوں کے بعد پاکستان حاصل کیا۔ اس ملک کے خلاف سازش کو وہ کیسے برداشت کرلیتے؟ وہ کھلے عام تقریریں کررہے تھے۔ ان کی جرأت مکتی باہنی سے برداشت نہ ہوئی ان لوگوں نے انہیں اغوا کرلیا۔ تیسرے دن ان کی لاش ملی۔ لاش کیا تھی' تشدد کا نمونہ تھا۔ اسے دیکھنے والوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں پہلے ان کے پیر پھر ہاتھ اور پھر زبان کاٹی گئی۔ ساٹھ سال کا ضعیف اتنی اذیت کیسے برداشت کرتا؟ وطن کے نام پر قربان ہوگیا۔

آدھی لاش کو گاؤں والوں نے دفنا کر خبر بھیجی تھی۔ مجھے اور فردوس کو آنے سے منع

کر دیا تھا۔ مکتی باہنی کے غنڈوں نے گاؤں والوں کو دھمکی دی تھی کہ اگر خان یہاں آیا تو پورے گاؤں کو آگ لگا دی جائے گی۔ بے چاری فردوس پر الزام عاید کیا گیا تھا کہ اس نے اپنے ہم قوم کو ٹھکرا کر ایک خان سے شادی کی ہے اس لیے واجب القتل ہے۔

حالات انسان کو کتنا مجبور بنا دیتے ہیں' اس کا احساس اس دن ہوا تھا۔ ہم دونوں رو دھو کر چپ ہو گئے تھے۔ وہ زخم بھرا بھی نہ تھا کہ نیا زخم لگ گیا۔ یہ زخم اتنا گہرا تھا کہ اس کی ٹیس آج بھی تازہ ہے۔

میں نے جس شجر زہر بار کو اپنی دانست میں کاٹ کر پھینک دیا تھا' وہ پھر سے تناور درخت بن کر ہماری خوشی کا پھانسی گھاٹ بن گیا۔ مشرقی پاکستان کا نام حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔ اتفاق ہے کہ اس دن میں تراب فاروق کے گھر پہنچا ہوا تھا۔ یہ خبر وہیں ملی تھی۔ میرے ساتھ فردوس اور ذوالفقار بھی تھا۔ تراب نے اپنے گھر میں ہی روک لیا لیکن رات ہوتے ہی ایک نئی آفت نے آ گھیرا۔ شہر کے دوسرے علاقوں کی طرح حسینی دالان میں رہنے والے بہاریوں یعنی اردو بولنے والوں کے گھروں پر جنہیں بہاری کہا جاتا تھا۔ حملہ شروع ہو گیا۔ مکانوں کو آگ لگائی جانے لگی۔ دکانوں کو لوٹا جانے لگا۔ ہر طرف سے چیخ پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی وقت برابر والے مکان کی دیوار پر چڑھ کر پڑوسی نے تراب کو پکارا۔

پڑوسی بنگالی تھا اور ایسے حالات میں لوگ مقابل کے ہر فرد کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ تراب نے بھی اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا ہے؟''

''تم میرے گھر میں چلے آؤ۔ کسی بھی وقت تمہارے گھر پر حملہ ہو سکتا ہے۔''

''اگر موت یوں ہی لکھی ہے تو یوں سہی۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' تراب نے کہا۔

''تم خودکشی پر آمادہ ہو تو کوئی کیا کرے۔'' پڑوسی نے کہا اور دیوار سے نیچے اتر گیا۔

''بھابی!'' تراب نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ بھیا کو لے کر نکل جائیے۔ آپ بنگالن ہیں۔ ذوالفقار بھی بنگلہ ہی بولتا ہے۔ راستے میں بھیا کو بولنے کا موقع نہ دیں۔ اس طرح بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ جائیں گی۔ آپ کا علاقہ نسبتاً محفوظ ہے۔''

''نہیں، تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ سنا دیا۔

''ضد مت کریں۔ اگر آپ معذور نہ ہوتے تو میں زبردستی روک لیتا لیکن آپ کی



حفاظت بھی مجھے کرنا پڑے گی اس لیے مجھ پر رحم کریں۔'' اس کی بات معقول تھی۔ پھر مجھے فردوس اور ذوالفقار کی بھی فکر تھی۔ یہاں رہنے کا مطلب تھا غیر بنگالی کی پہچان جبکہ راستے میں ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ فردوس کی وجہ سے لوگ مجھے بھی بنگالی سمجھتے۔ یہی سوچ کر میں نے تراب سے کہا۔ ''اپنی تہمد دو۔''

اس نے اندر سے لا کر دے دی۔ میں نے شلوار اتار کر تہمد پہنی اور پھر قمیض اتار دی۔ اب میں بنیان اور تہمد میں پوری طرح سے بنگالی نظر آ رہا تھا۔ صرف قد اور رنگ غیر بنگالی ہونے کے چغلی کھا رہا تھا۔ رنگت رات کے اندھیرے میں چھپ سکتی تھی۔

میں نے بیوی بچوں کی خاطر بزدلی کی راہ اختیار کر لی۔ تراب کے گھر سے نکل پڑا۔ بمشکل ایک فرلانگ چلا ہوں گا کہ سامنے سے آتا ہوا ٹڈی دل نظر آیا۔ انہیں دیکھ کر ہم رک گئے۔ ذوالفقار خوف سے ماں کے سینے سے چمٹ گیا۔ مجھے اپنی موت نظر آنے لگی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے ہم پر ہاتھ ڈالا تو میں جان پر کھیل جاؤں گا لیکن انہوں نے توجہ نہیں دی۔۔ وہ سب دوڑتے ہوئے تراب کے مکان پر پہنچے اور پھر بند دروازے پر کلہاڑیوں کی ضربیں پڑنے لگیں۔ صرف چند منٹ اور پھر میں نے وہ روح فرسا منظر بھی دیکھ لیا۔ ایک محبِّ وطن نفرت کی آگ میں بھسم ہو گیا۔ اف! اس مظلوم کی چیخیں آج بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ اسی چیخ سے خوفزدہ ہو کر میں نے فردوس کا ہاتھ پکڑا اور تیز تیز بھاگنے لگا۔ بنگشال پہنچا تھا کہ دوسرے جتھے نے روک لیا۔

''اے بہاری کا بچہ بھاگ کر کہاں جاتا ہے۔'' ایک نے نزدیک پہنچتے ہی میری بیساکھی پر لات ماری۔ میرا توازن بگڑ گیا اور میں اوندھے منہ گر گیا۔ کسی دوسرے نے اوپر سے لات رسید کر دی۔

''دیا کورو امرا بہاری نا۔ امرا بنگالی۔'' فردوس نے چیختے ہوئے رحم کی درخواست کی کہ ہم بہاری نہیں بنگالی ہیں۔

لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بڑے بڑے سورماؤں کو دھول چٹا دینے والا میں معذور ہو کر معمولی غنڈوں سے پٹ رہا تھا۔ کھڑے ہونے کی کئی بار کوشش کی لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ذوالفقار نے بھی ڈر کر چیخنا شروع کر دیا تھا یہ تو اچھا ہوا تھا کہ اس کی پرورش بکرم پور میں فریدہ کے گھر ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ بھی بنگلہ میں چیخ رہا تھا۔ اسی کی وجہ سے

مجھے نجات مل گئی اور مجھے کراہتا چھوڑ کر وہ واپس چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی فردوس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میرا پورا جسم لہولہان تھا۔ پیشانی سے بہتے خون کو فردوس ساڑھی کے آنچل سے پونچھ رہی تھی کہ ایک جیپ آ کر رکی۔ اس میں بیٹھے ہوئے ایک سکھ افسر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

اس نے ہندی میں سوال کیا تھا اس لیے فردوس نے اردو میں جواب دیا۔ ''کچھ لوگوں نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔''

''چلو جیپ میں بیٹھ جاؤ میں تمہیں محفوظ مقام پر اتار دیتا ہوں۔''

دل کہتا تھا دشمن کا احسان نہ لوں مگر جان کے خوف نے مجبور کر دیا تھا۔ مجھے اپنی پروا نہیں تھی۔ ذوالفقار اور فردوس کی فکر تھی۔ مجبوراً مجھے جیپ میں بیٹھ جانا پڑا۔

''کیا کرتے ہو؟'' اس افسر نے پوچھا۔

''پھل کی دکان ہے۔'' میں نے پنجابی میں جواب دیا۔

''او! پنجابی ہو۔ تب تو تمہاری جان بچنا مشکل ہے۔ مکتی باہنی والے خاص طور پر پنجابیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ تم پاک ملٹری کے درمیان ہی محفوظ رہ سکتے ہو۔ کہو تو میں تمہیں کنٹونمنٹ پہنچا دوں؟''

''مہربانی!'' میں نے جواب دیا۔

☆======☆=====☆

صبح کا اجالا پھیلتے ہی ہم کرمی ٹولہ چھاؤنی پہنچ گئے۔ وہاں پورے علاقے سے پاک فوجیوں کو لا کر رکھا گیا تھا۔ ان سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ فوجی قوانین کے تحت انہوں نے ہتھیار ڈالے ہیں ورنہ وہ تو شہادت کا درجہ پانے کے متمنی تھے۔ ان کی رگ رگ میں بہادری تھی مگر افسروں کا حکم کیسے ٹالتے؟ افسروں پر ان کی زندگی بچانے کی ذمے داری تھی اسی لیے انہوں نے فوجیوں کو اسلحہ رکھ دینے کا حکم دیا تھا۔

ان کے درمیان پہنچ کر مجھے یقین ہو گیا کہ موت کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ چھ دن وہاں گزار کر دیگر فوجیوں کے ساتھ ٹرین کے ذریعے نرائن گنج آئے اور پھر وہاں سے اسٹیمر پر سوار ہو کر کھلنا پہنچے۔ اس وقت تک ہمیں کوئی خبر نہیں تھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔



کھلنا سے پھر ٹرین پر سوار ہو گئے۔ وہ علاقہ جو ہمارا تھا اب ہمارا نہیں رہا تھا۔ ہم آگے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد حکم ملا کہ کھڑکیوں کے شیشے گرا دیے جائیں۔ اس کی وجہ کچھ ہی دیر میں سمجھ میں آ گئی۔ مقامی لوگ اسٹیشن پر جمع تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر تھے اور زبان پر گالیاں۔ سیاست دانوں کی غلطیوں کا خمیازہ ہمیں یوں بھگتنا پڑ رہا تھا۔ اگلے اور پھر اگلے۔ ہر اسٹیشن پر ایک سا منظر تھا۔ گالیوں اور پتھروں کی بارش سے گزر کر ہم ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوئے۔ اس علاقے میں بھی اسٹیشنوں پر ہجوم نظر آتا مگر سب خاموش تماشائی بنے ہمیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے۔ ان کی حقارت بھری مسکراہٹ ہمیں گالیوں اور پتھروں سے بھی زیادہ چبھتی محسوس ہوئی۔ دو دن کا سفر طے کر کے ہماری ٹرین الہ آباد پہنچی۔ اس اسٹیشن پر آٹھ گھنٹے گاڑی کھڑی رہی یا یوں سمجھیں کہ ہم چڑیا گھر کے جانور تھے اور ہماری نمائش ہو رہی تھی۔ پورا شہر ہمیں دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتے ہی ہماری ٹرین پھر سے چل پڑی۔ ایک رات کا سفر طے کر کے ہم میرٹھ پہنچے۔ میرٹھ اسٹیشن کے بعد ایک چھوٹا سا ہالٹ اسٹیشن پڑتا تھا۔ اسی ہالٹ اسٹیشن پر ہمیں اتارا گیا۔ اسٹیشن کے باہر بسیں کھڑی تھیں ہمیں ان میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا۔ ایک تو شام کا ملگجا اندھیرا اس پر بسوں کے شیشوں پر کالا رنگ ہم باہر کا نظارہ کرنے سے بھی قاصر تھے۔ شاید وہ یہ راستہ خفیہ رکھنا چاہتے تھے جس پر ہم آگے بڑھ رہے تھے۔

اسی طرح خاصا وقت گزر گیا اور شام رات میں بدل گئی۔ اس اندھیرے میں ونڈ اسکرین سے دور بہت دور ہماری نظروں نے روشنیاں دیکھیں۔ اونچے اونچے کھمبوں پر ٹیوب لائٹیں نصب تھیں اور ان کے درمیان وسیع علاقہ گھرا ہوا تھا۔ ہم سمجھے کہ وہاں کوئی نمائش لگی ہے کوئی میلہ جما ہے لیکن جب دیکھا کہ ہماری بسوں کا رخ انہی روشنیوں کی جانب ہے تو ذرا تجسس پیدا ہوا تاہم اس وقت بھی یہ گمان غالب رہا کہ یہ کوئی رہائشی کالونی ہے جہاں روشنیوں کا نظام بہت اچھا ہے۔ شاید ہمیں اسی کالونی میں رکھا جائے گا۔ اسی خیال میں غرق تھے کہ جلد ہی ہمارے سامنے تاروں کا جال واضح ہونے لگا۔ تقریباً چودہ پندرہ فٹ بلند بانسوں پر تاروں کا جال سا بنا گیا تھا۔ اس کے اندر بیرکس تھیں۔ میں اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ آرمی کا علاقہ ہے جسے انہوں نے تاروں کے ذریعے محفوظ کر رکھا ہے اور شاید عارضی طور پر ہمیں یہاں رکھا جائے گا۔ ہماری گاڑیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں میری

نظروں نے ان خاردار تاروں کے درمیان ایک بورڈ آویزاں دیکھا۔ میں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی۔ سرچ لائٹ کی روشنی میں بورڈ پر لکھی عبارت کو پڑھتے ہی میں چونک اٹھا اس پر لکھا تھا ''جنگی قیدیوں کا کیمپ نمبر 41۔''

کیمپ کے اندر ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا گیا۔ اندر پہنچتے ہی ہماری خوش فہمی دور ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے پنجرے سے بنے ہوئے تھے' ان میں ہم سب کو بند کر دیا گیا۔

رات گزری' صبح ہوئی اور گنتی کے نام پر ہم سب کو قطار میں کھڑا کر دیا گیا۔

آزادی کتنی بڑی نعمت ہے' اس کا احساس ہوگیا تھا۔ قیدی کس طرح اپنی حمیت کو مارنے پر مجبور ہوتے ہیں' اس کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر ہندوستانی سپاہی گالیاں دینے لگتے۔ افسران کا حکم اور عورتوں بچوں کا ساتھ تھا اس لیے ہم سب خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ لائن لگا کر کھانا لینا ہوتا جو میرے لیے ناممکن سا تھا فردوس بھی قریب نہیں تھی اسے عورتوں کے ساتھ الگ بیرک میں رکھا گیا تھا۔ میری حالت پر ترس کھا کر ایک شخص نے میرے برتن لے لیے اور کھانا لا کر دے دیا۔ میں نے سلسلہ جنبانی کے لیے پوچھا۔ ''آپ کس سیکٹر پر تھے؟''

''میں جی راج شاہی میں تھا۔ اینٹی ایئر کرافٹ گن میں ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''راج شاہی میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ پتا نہیں زندہ بچا بھی' یا وطن کے نام پر قربان ہوگیا۔'' میں نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

''کیا نام تھا؟'' اس نے پوچھا

''حمید ابڑو۔ سندھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا تھا۔ نوکری نے اسے اتنی دور لا پھینکا تھا۔''

حمید ابڑو! وہی جو پی ڈبلیو ڈی میں کام کرتا تھا؟''

''ہاں!''

''وہ تعظیم کے قابل ہے۔ فوجیوں کی اس نے بہت مدد کی لیکن قسمت میں تو کچھ اور تھا۔ ہماری کوششیں رائیگاں گئیں اور ملک محکوم ہوگیا۔ جس دن سرنڈر کی خبر آئی وہ میرے ہی پاس تھا اس نے یہ حوصلہ شکن خبر سنتے ہی کہا سائیں میں آزاد پیدا ہوا۔ آزاد ملک کا باشندہ ہوں! آزاد مروں گا۔ جب تم لوٹ کر وطن جانا تو میرے ملک کی مٹی کو چوم کر کہنا۔ اے وطن ہم تیرا



قرض چکا نہ سکے۔'' اور پھر اس نے ایک ایسی حرکت کر ڈالی جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس نے میری رائفل اٹھالی اور اپنے سینے پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ واقعی وہ آزاد مرا''۔ اسے یاد کر کے وہ آبدیدہ ہوگیا۔ میری آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ مجھ سے کھانا کھایا نہ گیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر برتن دھویا اور بیرک میں آ کر لیٹ گیا۔

دوسرا' تیسرا' اور چوتھا دن بھی گزر گیا۔ نہ تو ہندوستانیوں نے کچھ بتایا اور نہ ریڈیو پاکستان سے کوئی حوصلہ افزا خبر سنی جبکہ خبروں کے وقت بیرک کے باسی ریڈیو والے کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

پانچویں دن میں نے راج شاہی والے سپاہی سلطان سے پوچھا۔ ''تمہارا گھر کہاں ہے؟''

''ملتان!'' اس نے جواب دیا۔ ''وہاں میرے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میری بیوی میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔'' وہ افق پر پتا نہیں کیا دیکھنے لگا۔ شاید اسے بچوں کی یاد نے گھیر لیا تھا وہ دل ہی دل میں رو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں ہمیں کب آزادی ملے گی؟ کب اپنے وطن کی زیارت کروں گا؟''

''میرا بس چلے تو ان خاردار تاروں کو کاٹ کر نکل جاؤں۔''

''دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے مگر معذوری اور بیوی بچوں کے ساتھ نے مجبور بنا دیا ہے''۔

''ہمت مرداں مدد خدا۔ اگر تم ہمت کرو تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''

''ایسا کرو کچھ اور آدمیوں کو اپنا ہم خیال بناؤ۔ میں تیار ہوں۔''

''میں آج سے کوشش شروع کر دیتا ہوں۔'' سلطان اٹھ گیا۔

☆======☆=====☆

اس نے کئی دن کی تگ و دو کے بعد کئی سپاہیوں کو تیار کرلیا جو اس بے غیرتی کی زندگی سے عاجز آ گئے تھے ہندوستانی سپاہیوں کی جھڑکیوں طنز اور زیادتیوں نے انہیں بیزار کر دیا تھا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو خود فرار ہونا نہیں چاہتے تھے مگر ساتھ دینے پر رضامند تھے۔ وہ

کیمپ میں رہتے ہوئے مدد کرنا چاہتے تھے۔صبح کے وقت عورتوں کو مردوں سے ملنے کی اجازت تھی۔ میں نے اپنا پلان فردوس کو بتا دیا تھا، وہ بھی ساتھ دینے پر آمادہ ہوگئی تھی۔

فرار کے لیے بقرعید کی اٹھائیس تاریخ مقرر کی گئی تھی ہم سب انگلیوں پر دن گن رہے تھے۔ضروری سامان بھی جمع کرلیا تھا۔خدا خدا کر کے اٹھائیس تاریخ آ گئی۔اس دن ہم سب دھڑکتے دل کے ساتھ رات کے اندھیرے کا انتظار کر رہے تھے۔ایک ماہ سے کی جانے والی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ پلان بھی ہر طرح سے مکمل تھا۔ہم نے جی جان سے محنت کی تھی۔ میں نے اپنی بے ساکھی سے پھاوڑے کا کام لیا تھا اور دن رات کام کیا تھا۔جہاں پر میں سوتا تھا وہاں پر ایک گڑھا بنایا تھا اور اس پر ایک تختہ رکھ دیا تھا ہر روز گڑھے سے تھوڑی مٹی نکالتا تھا اور اسے جیب میں بھر کر تار کی باڑ کے نزدیک جا کر پھیلا دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ گڑھے کو ہم نے سرنگ کی شکل دے دی تھی۔ جس وقت نیچے اترا ہوا آدمی مٹی کھرچتا تھا ہم میں سے کوئی ایک دہانے پر پیڑا رکھ کر بستر ڈال لیتا تھا۔ بند گڑھے میں جہاں سانس لینا بھی دشوار ہو،اتر کر مٹی کھرچنے والے دس منٹ میں بے دم ہو جاتے،اسی لیے دس فٹ لمبی سرنگ بنانے میں ایک ماہ لگ گیا۔فرار ہونے والے اور ساتھ دینے والے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مستعد تھے اور وقت چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا۔ بڑے انتظار کے بعد آدھی رات بیتی۔ میں نے اپنی بیرک کے اصغر سہیل اور انوار کو اشارا کر دیا۔ وہ سب بھی تیار ہوگئے۔ اسی وقت عورتوں کی بیرک سے آگ آگ کا شور بلند ہوا۔ بیرکوں کے دروازے دھڑ ادھڑ کھلنے لگے۔ میں نے بھی باہر جھانک کر دیکھا۔میدان میں عورتیں نکل آئی تھیں۔ بیرک سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے ہر طرف چیخ و پکار تھی فردوس نے اپنا کام بخوبی انجام دے دیا تھا۔اسی وقت سلطان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔

''شروع ہو جاؤ۔'' میں نے حکم دیا۔

فرار ہونے والے یکے بعد دیگرے سرنگ میں اترنے لگے۔ میری نگاہیں فردوس کو تلاش کر رہی تھیں۔ آگ پر قابو پا لیا گیا تھا۔ آگ بجھ جانے کی وجہ سے میں پریشان ہوا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اب تب میں بیرک کا دروازہ بند کر لینے کا حکم ہوگا۔ اسی وقت میری نظر ایک آدمی پر پڑی جو گود میں ایک بچہ اٹھائے چلا آ رہا تھا کچھ اور نزدیک پہنچنے پر میں نے بچے کو پہچان لیا۔ وہ ذوالفقار تھا۔ میرا دل گھبرا اٹھا لیکن اس کے نزدیک پہنچتے ہی گھبراہٹ پر خوشی نے غلبہ



یا۔ وہ فردوس تھی۔ معلوم نہیں اس نے پینٹ شرٹ کہاں سے حاصل کر لی تھی۔ اس کے پر پی کیپ تھی وہ کسی رخ سے بھی عورت نظر نہیں آ رہی تھی میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑا بیرک میں گھسیٹ لیا۔

''بھائی جان جلدی کریں۔'' بیرک میں مستعد بیٹھے ایک شخص نے کہا۔ اس کے ے یہ کام تھا کہ ہمارے باہر نکلتے ہی وہ سرنگ کے دہانے پر پیڑا رکھ کر بستر بچھا لے۔ میں نے لے فردوس کو سرنگ میں گھسنے کا اشارہ کیا اس کے بعد ذوالفقار کو اتارا پھر خود اتر گیا۔

ذوالفقار پر بھی دہشت طاری تھی وہ بالکل خاموش تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے چپ بیماری لگ گئی ہے۔ میں نے اسے بھی نعمتِ خداوندی سمجھا اور سینے کے بل آگے ہی آگے سکنے لگا۔ ذوالفقار گھٹنوں کے بل چل رہا تھا اور فردوس بھی میری طرح آگے بڑھ رہی تھی کچھ دیر بعد ہم تینوں آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔

''لگتا ہے وہ لوگ سڑک کی جانب بھاگے ہیں لیکن ہم ادھر نہیں جائیں گے۔''

''کیوں؟'' فردوس نے بچے کو گود میں اٹھا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''اس لیے کہ سب کو ایک ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح سب کے سب پکڑے ئیں گے پھر تلاش بھی شروع ہوگی تو سڑک سے۔ ہم الٹی طرف جائیں گے۔''

فردوس اسی جانب بڑھنے لگی۔ سرچ لائٹ کی روشنی سے بچتے بچاتے ہم کافی دور آئے۔ سامنے کی جانب کافی دور ایک گاؤں دکھائی دے رہا تھا۔

''گاؤں سے کٹ کر چلنا ہوگا۔'' فردوس نے کہا۔

''نہیں، ہم سیدھے چلیں گے تاکہ دور سے دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ ہم گاؤں میں نا چاہتے ہیں۔''

کچھ دور جاتے ہی کیمپ کی جانب سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔

میں سمجھ گیا کہ ہمارے فرار کی خبر انہیں ہو چکی ہے۔ میں نے قدم تیز کر دیے۔ گاؤں ے نزدیک پہنچتے ہی میں نے راستہ تبدیل کر لیا۔ کچھ دور جا کے مجھے گاؤں سے کچھ فاصلے پر بس کھڑی نظر آئی۔ اس کی جانب کچھ لوگ پیٹرومیکس لے کر بڑھ رہے تھے بس کی چھت پر مسافر بیٹھے تھے۔

''فردوس! ہمیں بس پر سوار ہو جانا چاہیے۔''

''لیکن ہمارے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں ہیں۔''

''فکر نہ کرو کہہ دیں گے کہ پیسے گھر بھول آئے ہیں اور تمہارے گلے کی زنجیر دے دیں گے۔سونے کی چین کے بدلے کچھ پیسے بھی مل جائیں گے۔''

''جیسی مرضی۔''فردوس نے اسی جانب قدم بڑھادیا۔

اگرچہ بیساکھی کے ساتھ تیز چلنا مشکل تھا پھر بھی ہم بھاگم بھاگ بس میں سوار ہوگئے۔

کچھ دیر بعد بس چلی! وہ اندھیری رات کا سینہ چیرتے ہوئے نامعلوم منزل کی جانب بھاگ رہی تھی تھکن اور شب بیداری نے فردوس پر غنودگی سی طاری کردی تھی۔وہ میرے شانے سے ٹک کر سوگئی۔ ذوالفقار بھی سوگیا۔بس کے ہلکے ہلکے جھٹکوں نے مجھے بھی تھپکیاں دینا شروع کردیں اور میں بھی بے خبر ہوگیا۔آنکھ کھلی تو دیکھا صبح کی سپیدی پھیل رہی ہے۔دوسرے مسافر بھی جاگ گئے تھے میں نے نگاہیں گھما کر جائزہ لیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔کئی مسافر ہم دونوں کو گھور رہے تھے۔

کچھ دیر بعد دور سے ایک شہر کے آثار نظر آنے لگے۔میں نے فردوس کو بھی بیدار کردیا۔ہم دونوں سرگوشی میں باتیں کررہے تھے۔کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے شخص نے پوچھا۔''اے ہو بھیا توں کے کا کوٹم ہو؟''

پوری بات تو میری سمجھ میں نہ آئی مگر اس کا مافی الضمیر سمجھ گیا وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کس کا رشتہ دار ہوں۔اس سوال پر میں چکر گیا۔ایک اجنبی رشتے دار کے متعلق کیوں پوچھ رہا ہے لیکن کچھ پل بعد اس کی وجہ سمجھ میں آگئی۔دراصل ہم اندھیرے میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھے تھے وہ بس عام مسافروں کے لیے نہیں تھی۔سامنے کی سیٹوں پر دولہا دلہن بیٹھے تھے یعنی یہ بارات پارٹی تھی۔غلطی کا احساس ہوتے ہی میرا دل گھبرا اٹھا

''کاہو بھیا! بولونائیں۔کیکرا کے کوٹم بنی؟''اس نے پھر سوال کیا۔پوری برات میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''بھائی جان مجھ سے غلطی ہوگئی میں اسے عام بس سمجھا تھا''میں نے سر جھکا کر کہا۔

میرے جواب پر پوری بس زعفران زار بن گئی۔ایک شخص جس نے گلابی پگڑی باندھ رکھی تھی اس نے نزدیک آکر کہا۔''کہاں جایو؟''



''آپ کہاں جارہے ہیں؟''میں نے جواب کی جگہ سوال کردیا۔

''آگرہ!''

''مجھے بھی آگرہ ہی جانا ہے۔''میں نے جلدی سے کہا۔

''واہ ای ہو کھوب (خوب) ہے ہم ہو آگرہ جات رہیں اور آپ ہو۔''اس نے قہقہہ لگا کر کہا پھر اس نے مڑ کر آواز دی۔''اے ہو رام شرن! بھیا کے تنی جلپان کرایو۔''

میں سمجھا تھا کہ اس نے پان لانے کو کہا ہے لیکن ایک نوعمر لڑکا کاغذ کی پلیٹ میں دولڈو اور سیوبندیاں رکھ کر لے آیا۔

''ای ہمار اور سے جلپان ہے۔''اس نے پلیٹ لے کر ہماری جانب بڑھائی۔پھر اس نے فردوس پر نظر ٹکاتے ہوئے کہا۔''ای کا تو ہار چھوٹ بھائی ہے؟''

''ہاں!''میں نے بغیر سمجھے اثبات میں سر ہلادیا۔

''اے ہو رام شرن! چھوٹ بھیا کے نادیہو۔''

''دیت بنی۔''رام شرن نے مزید دو پلیٹ لاتے ہوئے کہا۔

میں نے فردوس کو کھانے کا اشارا کرتے ہوئے خود بھی کھانا شروع کردیا۔اس طرح میں اس خدائی فوجدار کے سوالوں سے بچنا چاہتا تھا۔مجھے کھاتے دیکھ کر وہ لوٹ گیا۔ہم دونوں آہستہ آہستہ کھا رہے تھے تا کہ وقفہ طویل ہو۔

''اے بھیا! جلدی جلدی کھاؤ آگرہ نجیک بنی۔''رام شرن نے کہا

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔شہر نزدیک آچکا تھا پھر بھی میں نے کھانے کی رفتار سست رکھی۔شہر میں داخل ہوتے ہی میں نے کہا۔''بھیا مجھے یہیں اتار دیں۔''

گلابی پگڑی والے نے ڈرائیور سے بس روکنے کیلئے کہا۔بس رکتے ہی ہم دونوں اتر پڑے۔اترتے وقت رام شرن نے مجھے سہارا دیا۔پائیدان سے پیر نیچے رکھتے رکھتے میری بیساکھی لڑکھڑا گئی اور میں نے سہارے کے لیے رام شرن کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا وہ اتنی زور سے اچھلا تھا کہ میں گرتے گرتے بچا۔وہ چلایا بھی تھا۔''رام، رام جوٹھا ہاتھ لگا دیلکے۔''پھر اس نے غصیلی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔''کاہو بھیا توں میاں ہو۔''

میں نے چاہا کہ الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہوں۔''ہاں میں مسلمان ہوں۔بولو کیا کرلوگے؟''لیکن حالات موافق نہ تھے اس لیے زہر کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔فردوس نے

ذوالفقار کو گود سے اتارا اور مجھے سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی۔

''رکشا روکو۔'' میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے فردوس سے کہا۔

فردوس کو رکشا روکنے کی ضرورت نہیں پڑی ایک رکشا والا خود آ کر کھڑا ہو گیا۔ سائیکل رکشا پر چڑھتے ہوئے میں نے بس کی جانب دیکھا جو تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ فردوس کے بیٹھتے ہی میں نے رکشا والا سے کہا بازار چلو رکشا والا چل پڑا حالانکہ مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ بازار کہاں ہے اور کیا نام ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد مجھے ایک سنار کی دکان نظر آ گئی میں نے رکشا روکنے کا اشارہ دیا اور فردوس سے چین لے کر اتر پڑا۔ دکاندار نے چین کی قیمت دو ہزار لگائی۔ میں نے بغیر کچھ پوچھے روپے لے لیے اور واپس رکشا کے پاس آ کر فردوس سے بولا۔ ''تمہارے لیے کچھ کپڑے لے لوں۔''

میں ایک کپڑے والے کی دکان میں داخل ہو گیا وہاں سے سلے سلائے کپڑے خریدے اور پلٹ پڑا رکشا پر بیٹھتے ہی میں نے کہا ''رام باغ۔''

رکشا چل پڑا تو فردوس نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''رام باغ میں کون ہے؟''

''سنا ہے شہید ثالث قاضی نور اللہ شوستری کا مزار مبارک ہے۔ وہاں ٹھہرنے کے لئے کمرے بھی ملتے ہیں۔''

فردوس نے پھر کوئی سوال نہ کیا کچھ دیر بعد میں نے خود ہی کہا کمرے صدر دروازے کے برابر ہیں۔ تم تیزی سے کسی ایک کمرے میں گھس جانا تاکہ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کسی کو حیرت نہ ہو۔''

''جی!'' فردوس نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''صاحب جی! رام باغ آ گیا۔'' رکشا والے نے بریک لگاتے ہوئے بتایا۔

میں نے گردن باہر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے مزار نظر نہ آیا جبکہ میرے ایک دوست نے جو ڈھاکا سے زیارت کے لیے آیا تھا، بتایا تھا کہ رام باغ چورنگی کے پاس ہی مزار ہے۔

''صاحب جی! اب کدھر لے چلوں؟'' رکشا والے نے پھر پوچھا۔

''کسی دکاندار سے پوچھو یہاں کوئی مزار ہے؟''

''ایسا بولیں ناں۔'' کہتے ہوئے اس نے پھر پیڈل ماتے ہوئے رکشا آگے بڑھایا



اور پھر داہنی جانب مڑ گیا۔ کچھ دور جاتے ہی ایک بڑا سا سرخ دروازہ نظر آیا جس کی پیشانی پر لکھا تھا۔ مزار مقدس قاضی نور اللہ شوستری علیہ رحمۃ اسی کے سامنے رکشا والے نے اپنے سائیکل رکشا کو روک لیا میں نے اسے دس روپے کا نوٹ دیا۔

''صاحب! کھلے پیسہ دیں۔'' رکشا والے نے کہا۔

''کتنے پیسے ہوئے؟''

''پانچ روپے۔''

مجھے حیرت ہوئی تھی دو ڈھائی گھنٹے کی محنت کے بعد مزدوری صرف پانچ روپے۔

میں نے کہا۔ ''سب رکھ لو۔''

رکشا والا دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ میں نے ذوالفقار کو گود میں لے کر فردوس کو اشارا کیا۔ وہ تیر کی طرح اندر داخل ہوئی اور ایک کمرے میں گھس گئی۔ میں بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ گیٹ کے اندر وسیع میدان تھا۔ میدان کے درمیان مزار۔ مزار کی عمارت دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ کاظمین مقدس کی شبیہ تھی۔ تعمیر پر بے دریغ روپے بہائے گئے ہوں گے۔ مزار کے سامنے لائن سے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے تھے جو خالی پڑے تھے انھی میں سے کسی ایک میں فردوس داخل ہوئی تھی۔ میں باہر کھڑا انتظار کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے مزار کے برابر والے کمرے سے نکل کر آواز دی۔ ''سنئے!''

میں اسی جانب بڑھتا چلا گیا۔ نزدیک پہنچ کر پوچھا

''جی!''

زیارت کرنے آئے ہیں؟'' اس نے سوال کیا

''جی ہاں!'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں سے؟''

''کلکتے سے۔''

''کمرا بھی چاہیے؟''

''جی ہاں!''

''رجسٹر میں نام درج کرا لیجئے۔'' کہتے ہوئے اس نے رجسٹر کھول لیا۔

''میرا نام ضیغم عابدی ہے پتا اٹھائیس نمبر دھرم تلہ کلکتہ۔'' میں نے جو منہ میں آیا

بک دیا۔

پتا نوٹ کرنے کے بعد اس نے کمروں کی جانب اشارا کیا۔ ''ان میں سے کسی ایک میں ٹھہر سکتے ہیں۔''

''کتنے روپے دے دوں؟'' میں نے جیب سے روپے نکالے۔

''ایک بھی نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ کمرے زائرین کے لیے بنائے گئے ہیں' اگر آپ کو کچھ دینا ہے تو وہ سامنے بکس رکھا ہے اس میں ڈال دیجیے۔''

میں نے بکسوں کے نزدیک جا کر دیکھا' ایک پر لکھا تھا تعمیر مزار اور دوسرے پر برائے مجالس امام مظلوم۔ میں نے دونوں میں پچاس روپے ڈال دیئے پھر اس کمرے کی جانب بڑھتا چلا گیا جس میں فردوس کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ وہ بیٹھی انتظار کر رہی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ میں نے اندازے سے کپڑے خریدے تھے جمپر اس کی جسامت سے بڑا تھا اور شلوار اٹنگی تھی۔

''ایک تو ایسا واہیات کپڑا اس پر آپ کی ہنسی اب مجھے غصہ آ جائے گا۔''

''اچھا بھئی نہیں ہنستا۔'' میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''اب باہر بھی نکلو گی یا نہیں۔''

''نہیں پہلے دوسری شلوار لا کر دیں۔''

''ایسا کرتے ہیں پہلے مزار پر فاتحہ پڑھ لیتے ہیں پھر بازار چل کر لے لیں گے۔''

''چلیے'' اس نے ذوالفقار کی انگلی پکڑ کر باہر کی جانب قدم بڑھایا۔

ہم مزار پر پہنچے۔ فاتحہ پڑھی اور باہر نکل آئے۔ مزار کے باہر لائن سے رکشے والے کھڑے تھے ایک سائیکل رکشا والے کو بلایا۔ وہ نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا ہم اس پر سوار ہو کر بازار پہنچے۔ کندھے پر لٹکانے والا بیگ' ذوالفقار اور فردوس کے لیے دو دو جوڑے کپڑے خریدے ایک برقعہ لیا۔ کیمپ سے فرار کے وقت خوف حاوی تھا اس لیے فردوس نے کچھ کہا نہیں تھا مگر اب وہ بار بار کہہ رہی تھی کہ مجھے لوگوں کی نگاہیں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔

اس کی بات معقول تھی۔ انسان کی سرشت میں لالچ مضمر ہے چاہے اس کے پاس ہفت اقلیم کی دولت کیوں نہ ہو' دوسرے کی دولت پر للچائی ہوئی نگاہ ضرور ڈالے گا۔

دوسروں کو اپنی دولت پر نگاہ ڈالتے دیکھ کر ہر کوئی ناک بھوں چڑھا لیتا ہے مگر خود دوسروں کی دولت پر گدھ ایسی نگاہ ڈالنے سے چوکتا نہیں۔ اسی لیے تو دولت کو تجوری میں بند



رکھا جاتا ہے۔ عورت نامی دولت کو بھی چادر اور چار دیواری کی تجوری میں رکھنا ضروری ہے۔ یہی حکم اسلام کا بھی ہے۔ ہمیں حالات نے ملک بدر کر دیا تھا چار دیواری خواب ہو گئی تھی اس لئے میں نے فردوس کو محفوظ رکھنے کے لیے برقعہ خرید لیا اپنے بھی دو جوڑے خریدے کیونکہ اپنے کپڑوں کو میں پھینک دینا چاہتا تھا ان کپڑوں پر ڈھاکا کی ٹیلرنگ شاپ کے لیبل لگے تھے جو میرے لیے پھانسی کا پھندا بھی بن سکتے تھے۔

خریداری سے فارغ ہو کر لوٹتے وقت میں نے انگریزی اور اردو اخبارات لے لیے۔ کمرے میں پہنچ کر ان کا مطالعہ شروع کیا۔ آخری صفحہ پر وہ خبر نظر آ گئی۔ اخبار نے پی ٹی آئی کے حوالے سے خبر دی تھی کہ کچھ قیدیوں نے کیمپ نمبر ۱۴۱ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی جن میں تین گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ سات پکڑے گئے اور تین بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں ایک لنگڑا ہے اور دوسری عورت ہے جس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے۔

خبر نے مجھے ہراساں کر دیا تھا کیونکہ پورے ملک کی انٹیلی جنس مجھے تلاش کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہو گی کافی سوچ بچار کے بعد میں نے ایک راہ متعین کر لی اور فردوس سے بولا۔ ''تم آرام کرو میں مزید کچھ چیزیں خریدنے جا رہا ہوں۔''

''جائیے!'' اس نے ذوالفقار کو تھپکی دے کر سلاتے ہوئے کہا۔

''اپنے زیوارت میں سے ہار اور چوڑیاں بھی دے دو۔''

اس نے کمر میں بندھی پوٹلی سے چھ چوڑیاں' دو بالے اور ہار نکال کر دے دیئے۔ میں انھیں لے کر بازار پہنچا اور سات ہزار روپے میں فروخت کر دیئے۔ لوٹتے وقت ہندوؤں والی دھوتی۔ دو ساڑھیاں' بلاؤز' لہنگا اور سیندور کی ڈبیا بھی خرید لی۔ کمرے میں پہنچ کر انھیں فردوس کو سونپتے ہوئے بولا۔ ''ہندوستانی انٹیلی جنس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ہندو بننا ہو گا۔''

''آخر کب تک یہ ڈرامہ کریں گے۔ کسی ایجنٹ سے بات کریں وہ ہمیں پاکستان پہنچا دے گا۔''

''پاکستان پہنچنے کے لیے بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے نیپال۔''

''کیوں؟ مشرقی پنجاب سے بھی بارڈر کراس کیا جا سکتا ہے۔''

''وہ علاقہ اس وقت فوجیوں کی نگرانی میں ہے چپے چپے پر فوجیوں کی نظر ہو گی۔''

''تو نیپال ہی چلتے ہیں۔''

''انشاء اللہ کل چل دیں گے۔''

پروگرام کے مطابق صبح کی نماز پڑھ کر میں نے شہید ثالث کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور پھر وہاں کے منشی سے گورکھ پور جانے کا راستہ پوچھا۔اس کی ہدایت کے مطابق ٹیکسی سے ٹنڈلہ جنکشن پہنچا اور پھر وہاں سے بنارس۔ بنارس سے گورکھ پور کے لئے ٹرین پکڑ لی۔ٹرین نے پہلا ہالٹ کراس کیا تھا کہ رک گئی۔سگنل گرا کر ٹرین روک لی گئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا باہر کا منظر دل کو دہلانے کے لئے کافی تھا۔ریلوے لائن کے کنارے کھڑا جم غفیر عجیب عجیب نعرے لگا رہا تھا میں نے ساتھ بیٹھے مسافر سے پوچھا۔''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''بنارس میں ہندو مسلم دنگا ہو گیا ہے اسی کا بدلہ لینے کے لئے گاڑی روکی گئی ہے۔''

''یعنی؟''

''میاں لوگن کے اتار اتار کے مارب'' ایک دوسرے دیہاتی نے کہا۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بنارس پہنچنے سے پہلے ہی میں نے پیشانی پر سیندور سے کھڑی لکیر کھینچ لی تھی۔تلک کی وجہ سے مجھے سب ہندو سمجھ رہے تھے۔فردوس نے بھی مانگ میں سیندور لگا رکھا تھا۔ میں نے فردوس کی جانب والی کھڑکی کو بند کر دیا۔

باہر کی چیخ و پکار نے بے چین کر دیا تھا۔ میں نے پھر جھانک کر دیکھا۔ریلوے لائن پر کئی مسلمان گرے ہوئے تھے جن کی داڑھی تھی۔کئی عورتیں اور بچے بھی مرے پڑے تھے۔ ظالموں نے انھیں لاٹھیوں سے پیٹ پیٹ کر ختم کر دیا تھا۔میرے کمپارٹمنٹ میں بھی کچھ بلوائی چڑھے، وہ سب مسلمانوں کو تلاش کر رہے تھے جن پر شک ہو جاتا انھیں باتھ روم میں لے جا کر چیک کرتے۔میری دھوتی اور تلک نے مجھے ان کی نظروں سے چھپا لیا تھا۔وہ بھی مجھے ہندو سمجھ کر آگے بڑھ گئے تھے۔مسلمانوں پر ہندوستان میں اتنا ظلم ہوتا ہے؟ راہ چلتے کو پاگل کتوں کی طرح مار دیا جاتا ہے؟ یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور مجبوری جکڑے تھی۔ میں خاموش تماشائی بنا دیکھنے پر مجبور تھا۔خدا خدا کر کے گاڑی چلی۔مسافر پھر سے باتوں میں لگ گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔اسٹیشن پر اسٹیشن آتے رہے، گزرتے رہے اور میں بے والی و وارث پڑی لاشوں پر دل ہی دل میں ماتم کرتا رہا۔پتا نہیں اب بے کفن لاشوں کو مردار خور جانور کھینچتے ہیں یا بلدیہ کی گاڑی اٹھا لے جاتی ہے؟



رات بھر کے سفر کے بعد گاڑی گورکھ پور پہنچی۔اسٹیشن پر اترتے ہی میں نے اخبار یدا اور پھر ہم سائیکل رکشا پر سوار ہو کر بس اسٹینڈ پہنچے۔نوتیشوا کے لئے بس تیار کھڑی تھی۔ سوار ہو گئے۔بس کے چلتے ہی میں نے اخبار کھول لیا۔ پہلے ہی صفحہ پر بنارس کے فساد کی خبر ں۔موٹی موٹی سرخی کے نیچے لکھا تھا۔آر ایس ایس کی جانب سے شہر میں جھوٹی افواہ پھیلا کر وں کو ابھارا پھر انہیں مسلم بستیوں پر حملہ کرنے کی ترغیب دے کر شہر کی گلی کوچوں کو خون سے ین بنا دیا گیا۔''

خبر بائی لائین تھی۔ نامہ نگار ہندو تھا مگر اس نے ایمانداری سے کوریج کی تھی صحافتی انت داری نبھانے پر میں اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

میں اخبار میں اتنا محو ہو چکا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ بس بارڈر پر پہنچ چکی ہے۔

''اے، سب نیچے اترو'' ایک سپاہی نے آواز دی۔

سب کے ساتھ میں بھی اتر گیا۔فردوس ذوالفقار کے ساتھ پہلے ہی اتر چکی تھی۔

سپاہی سامان کی تلاشی لینے کے بعد میری جانب بڑھا۔اس کی تیز نگاہیں مجھ پر یں۔میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ جھپٹے گا اور مجھے داب لے گا۔وہ پہچان گیا ہے کہ میں جنگی قیدیوں کے کیمپ سے فرار ہو کر آیا ہوں۔بار بار میرا دل لہہ رہا تھا کہ میں خود پہل کر دوں تا کہ فردوس بچے کو لے کر فرار ہو سکے۔میری مٹھیاں بھنچ گئیں ں حملہ کرنے ہی والا تھا کہ سپاہی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔''نمسکار پنڈت جی۔''

''نمسکار۔'' میں نے جواب دیا۔

''بھوجی کیسی ہیں۔'' اس نے پوچھا

بھوجی کسے کہتے ہیں میرے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا پھر بھی میں نے ہندوؤں کے نداز میں کہا ''سب کوشل ہے۔''

''اور بچے۔''

میں سمجھ گیا کہ پہلا سوال بیوی کے متعلق تھا تبھی تو اس نے بچوں کے بارے میں چھا۔جواباً میں نے کہا ''بھگوان کی کرپا ہے''

کیمپ میں جو تھوڑی بہت ہندی سیکھی تھی وہ کام آ رہی تھی۔

"آیئے، میں آپ کو نیپال کی بس میں سوار کرادوں"

اس نے کہا "چلو" میں نے قدم بڑھا دیئے۔ فردوس بھی ساتھ چل پڑی۔ فردوس کو دیکھتے ہی سپاہی اس کے پیر چھونے کو جھکا اور فردوس گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ بھوجی ہیں نا" اس نے فردوس کے پیر چھو کر مجھ سے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"ماں نے کہا تھا کہ آپ نے شہر میں ہی شادی کر لی ہے۔ آج میں نے بھوجی کو دیکھ بھی لیا۔" وہ مسلسل بولے جارہا تھا۔

اس کی باتوں سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی اور کے دھوکے میں مجھے عزت دے رہا ہے۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "نیپال میں کہاں جائیں گے۔"

"کھٹمنڈو" میں نے جواب دیا۔

"پشوپتی ناتھ کے مندر کا درشن کرنے جارہے ہیں؟"

"ہاں۔"

"میرے لئے بھی دعا کر دیں گے" اس نے بس پر سوار کراتے ہوئے کہا۔

"انشاء" میں انشاء اللہ کہتے کہتے رک گیا۔ لیکن وہ بھی غضب کا کائیاں تھا۔ فوراً تاڑ گیا اور پوچھ بیٹھا۔ "کیا بات ہے، شہر میں رہتے رہتے آپ مسلمانوں ایسی باتیں کرنے لگے۔"

اس کا سوال بڑا خطرناک تھا۔ میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی میں نے پھیکی ہنسی ہنس دی۔

"اچھا بھوجی میں چلا۔" اس نے فردوس سے کہا اور مڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اگلی سیٹ پر بیٹھی فردوس پر نظر ڈالی اسی وقت بس نے ہارن بجایا اور چل پڑی۔ نیچی اونچی پہاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی بس دوڑ رہی تھی، اس سے بھی تیز میرا ذہن دوڑ رہا تھا، میں دل ہی دل میں آگے کا پروگرام مرتب کر رہا تھا۔ تھکن نے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیا اور میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دور پہاڑ پر قمقمے جلتے بجھتے نظر آئے۔ "کوئی شہر ہے۔" میں نے سوچا اور اپنے برابر بیٹھے شخص سے پوچھا۔ "وہ کوئی شہر ہے کیا؟"



"جی ہاں نیپال کا سب سے بڑا شہر کھٹمنڈو ہے" وہ باتونی لگا۔

"ٹھہرنے کی جگہ مل جائے گی۔" میں نے پوچھا۔

"مت پوچھئے بنگلہ دیش بننے کے بعد بہاریوں نے نیپال پر دھاوا بول دیا ہے۔ پال کے راجہ ویر بھدر سنگھ نے انھیں کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اس نے اعلان کر دیا ہے کہ کستانی میرے بھائی ہیں انھیں کوئی نہ ستائے اور ان مسلوں نے ہوٹلوں پر قبضہ کر لیا ہے۔"

"کیا" میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا "ہوٹلوں پر قبضہ کر لیا ہے؟"

"سمجھے نہیں، پاکستانیوں کے پاس بہت پیسہ ہے وہ ہوٹلوں کے کمرے ریزرو کرائے بیٹھے ہیں اور ہم ایسے لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے۔" اس کے لہجے سے میں سمجھ گیا تھا کہ ہ مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے یہ تو اچھا ہی تھا کہ میں نے پیشانی سے سیندور کی تین لکیریں کھینچ ھی تھیں۔ اس تلک کی وجہ سے وہ مجھے ہندو سمجھا تھا میں نے زیادہ باتیں کرنا مناسب نہ سمجھا اور اہر دیکھنے لگا۔

کھٹمنڈو نزدیک آتا جارہا تھا۔

بس رکتے ہی میں اترا۔ فردوس بھی اتر آئی میں نے تجسس بھری نگاہوں سے طراف کا جائزہ لیا۔ بس اسٹینڈ کے ایک کونے میں بیت الخلا کا بورڈ نظر آ گیا اس بورڈ کو دیکھتے ہی میں نے فردوس کو نزدیک پہنچ کر کہا "وہاں جا کر سیندور دھولو۔ اب ہمیں ہندو بنے رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جب وہ واپس آئی تو میں نے بھی جا کر تلک دھولیا اور پھر رکشا والے کو آواز دی۔

"کہاں جانا ہے؟" رکشا والے نے پوچھا

"پاکستانی سفارت خانے" میں نے جواب دیا۔

"پولیس پانی پوکھری میں اتنی رات کو جانے نہیں دے گی۔ اگر کہیں تو پاکستانیوں کے پاس پہنچا دوں۔ باغ بازار میں ایک پوری بلڈنگ پاکستانیوں نے لے رکھی ہے۔"

"چلو"

رکشا والا ہمیں لے کر چل پڑا۔

باغ بازار کی اس بلڈنگ میں پہنچ کر مجھے مایوسی ہوئی تمام ہال بھرا تھا لوگ فرش پر آڑے ترچھے لیٹے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے بتایا کہ پاس میں ہی ایک اور بلڈنگ ہے وہاں

جا کر پتا کرلیں۔

اس بلڈنگ میں ایک کمرا مل گیا۔رات گزار کر میں صبح ہی صبح سفارت خانے پہنچا۔وہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع پڑے تھے۔

''آخران لٹے پٹے لوگوں کی دادرسی کیوں نہیں ہوتی؟''میں نے ایک آدمی سے پوچھا۔

''سفارت خانے والے پاکستانی ہونے کا ثبوت مانگ رہے ہیں۔لٹنے والے بھاگتے وقت کاغذات تو لے کر چلے نہیں تھے۔''

ایسے ہی لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔جن کے رشتہ دار پاکستان میں تھے وہ فارم میں ان کا نام لکھ کر دے رہے تھے۔ایسے لوگوں کا نمبر جلدی آرہا تھا۔وطن کے رشتے پر رشتے داری کا رشتہ حاوی ہو گیا تھا۔رشتے کی مضبوط زنجیر ٹوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔کچھ لوگ مایوس ہو کر ہندوستان میں ہی بس جانے کی سوچنے لگے تھے۔

ان لوگوں کی ابتر حالت دیکھ کر میری حالت غیر ہونے لگی پھر بھی میں نے فارم بھر دیا پاکستان میں پتے والے کالم میں پاڑے کا پتا لکھ دیا۔

علاقہ غیر کے ایک دور افتادہ گاؤں کا پتا دیکھتے ہی مجھے اندر بلایا گیا۔اتفاق سے وہاں زیڑان کا ایک بندہ تھا اسی نے مجھ سے سوالات کیے میں پشتو میں تمام سوالوں کے جواب دیتا رہا پھر میں نے ابوتراب آفندی سے اپنا رشتہ بھی بتا دیا۔اس کی وجہ سے مجھے فوراً کلیرنس مل گیا۔

نیپال سے پاکستان کے لیے کوئی پرواز تھی نہیں اس لیے سفارت خانے نے ہمیں بنکاک بھیج دیا اور وہاں سے ہم کراچی آ گئے۔

کراچی پہنچتے ہی میں نے لوگوں کی نگاہیں بدلی ہوئی پائیں۔ہمیں بوجھ سمجھا جا رہا تھا۔ہماری وطن دوستی اور قربانی کو سب نے بھلا دیا تھا۔

اپنی روٹی سب کو پیاری ہوتی ہے وہ سمجھ رہے تھے کہ ملک کے وسائل کم ہیں۔اتنے کم وسائل میں حصے داری کے نتیجہ سے ہماری روٹیاں بھی چھنیں گی مگر انھیں سمجھانے والا کوئی نہ تھا کہ رزاق خدا ہے۔سب اپنی ڈفلی پر اپنا راگ الاپ رہے تھے۔

میں نے کراچی میں رکنا مناسب نہ سمجھا اور پاڑے چلا آیا وہاں سب فکر مند



تھے۔علی شیر چچا نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔

ضعیفی سب سے قوی ہے۔جوانی کی منہ زوری کو پٹختی ہے انسان کو اندر ہی اندر توڑ دیتی ہے۔علی شیر ایسے شیر دل بھی اندر اندر ہی اندر ٹوٹ چکے تھے مجھے سینے سے لگا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔انھیں دلاسہ دے کر میں چچی کے پاس پہنچا۔

گل میرے آنے کی خبر سنتے ہی آ گئی تھی۔وہ ذوالفقار کو گود میں اٹھائے چوم رہی تھی اور ذوالفقار سہما ہوا تھا۔دراصل وہ اپنے آپ کو ان سب کے درمیان اجنبی محسوس کر رہا تھا اس کے لیے پورا منظر نیا تھا۔ہوش سنبھالتے ہی اس نے ندی نالوں' کھیت کھلیانوں کو دیکھا تھا۔عورتوں کو ساڑھی اور مردوں کو لنگی پہنے دیکھا تھا اس کے لیے یہاں کی طرز رہائش' زبان' لباس' خوراک' پہاڑیاں اور تپتے ہوئے میدان اجنبی تھے۔عورتوں سے تو اتنا خوفزدہ نہیں تھا مگر مردوں کو دیکھتے ہی چیخنے لگتا۔کچھ ہی دنوں میں اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

اس نے بندوق پستول کی تباہ کاری دیکھی تھی۔تڑپتی ہوئی لاشوں کو پھلانگ کر آیا تھا۔اتنا سا تو دل تھا۔خوف کے علاوہ اس میں اور کیا سماتا اسی لیے وہ بندوق دیکھتے ہی چیخنے لگتا۔

ایک دن تو غضب ہو گیا گل کی شرارت نے اس کی آدھی جان نکال دی۔ہوا یوں کہ وہ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اس کے انہاک کا فائدہ اٹھا کر گل نے اس کے تین جانب تین بندوقیں لا کر رکھ دیں۔یکایک جو اس کی نظر بندوقوں پر پڑی تو وہ اس طرح چیخا گویا موت کا چہرہ دیکھ لیا ہو۔

اس کی چیخ سن کر سب دوڑ پڑے۔چچی جان کمرے میں داخل ہوتے ہی سمجھ گئیں کہ کس کی شرارت ہے۔انھوں نے پشتو میں بیٹی کو ڈانٹا۔

''اڑو کے ولے جڑائے''(کیوں بچے کو رلاتی ہو)

چچی کی ڈانٹ نے گل کی کھلکھلاہٹ پر بریک لگا دیا۔وہ سہم کر کمرے سے نکل گئی۔

بڑی مشکل سے میں نے ذوالفقار کو خاموش کرایا اور گود میں لے کر باہر نکل آیا۔

اسے بہلا رہا تھا کہ میری نظر نوشے بھائی پر پڑی۔وہ کندھے پر ایئر بیگ لٹکائے چلے آ رہے تھے۔نزدیک آتے ہی میں نے انہیں سلام کیا اور کمرہ نشست میں لے جا کر بٹھا دیا۔چچا بھی ان کے آنے کا سن کر آ گئے۔علیک سلیک کے بعد نوشے بھائی نے پشتو میں کہا۔''ذوودائی ما

فردوس اور ضیغم دیوتا دلکو اجازت ورکا جزی دیو والیتے اوسی۔'' میں چاہتا ہوں کہ آپ ضیغم وفردوس کو جانے کی اجازت دے دیں یہ اب وہیں رہیں گے۔)

چچا نے جواب دیا۔ دیو دینی پہ سندھ راپروہوتی دیتو آرام ورکا'' (یہ لوگ خون کی ندی پار کرکے آئے ہیں آرام کرلیں۔)

میں خود بھی چاہتا تھا کہ چچا پر بوجھ نہ بنوں۔ پہلی سی بات رہی نہیں، ضعیفی نے آمدنی کی راہ مسدود کر رکھی تھی۔ بیٹوں کی مدد سے ان کی گاڑی چل رہی تھی اسی لیے میں نے خط لکھ کر نوشے بھائی کو کراچی سے بلوایا تھا' کہیں علی شیر چچا ضد نہ پکڑ لیں۔ اسی ڈر سے میں نے بھی جلدی سے پشتو میں کہا۔'' واپخیلا وام چیلاڑ (میں خود بھی جانا چاہتا ہوں)

چچا کا چہرہ بجھ سا گیا۔ انہوں نے دکھی لہجے میں کہا'' چس سنگھ استا مرضی۔'' (جیسی تمہاری مرضی)

ان کی اجازت ملتے ہی میں نے فردوس کو تیار ہونے کا اشارہ دے دیا اور نوشے بھائی کے ساتھ ان کے گاؤں زیڑان کے لیے نکل پڑا۔ میں نے ذوالفقار کو بھی ساتھ لے لیا تھا تا کہ وہ بھی ان پتھریلی راہوں سے آگاہ ہو سکے جن پر میرا بچپن گزرا تھا۔ جس سرزمین نے ایک لٹے ہوئے مسافر کو پناہ دی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بہادروں کی اس سرزمین کا اثر اس پر بھی پڑے۔ وہ بھی یہاں والوں کی طرح غیور و بہادر بن جائے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے بنگلہ میں پوچھا۔ بابا آرکوتو دور'' (ابو اور کتنی دور)

نوشے بھائی نے چونک کر اسے دیکھا اور مجھ سے بولے۔'' تم نے بچے کو اردو یا پشتو نہیں سکھائی؟''

میں نے بھی پشتو میں جواب دیا۔'' اسے پالا ہے خالہ نے اور وہاں اردو بولنے والا کوئی تھا نہیں پھر میں نے بھی اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ زبان کیا ہے؟ فقط اظہار کا ذریعہ۔ روز قیامت تو سب عربی میں باتیں ہوں گی۔''

'' اپنی منطق بھول جاؤ اور بچے کو اردو یا پشتو سکھاؤ ورنہ لوگ اسے بنگالی سمجھیں گے۔''

'' تو کیا ہوا؟ اس کی ذات تو بدل نہیں جائے گی۔ مسلمان ہی کہلائے گا۔''

'' تم آخر سمجھتے کیوں نہیں۔''



'' سب سمجھتا ہوں۔ زبان کچھ نہیں ہے۔ اعمال ہی اصل چیز ہوتے ہیں آپ خود سوچیں باجی پیدا ہوئیں دہلی میں بچپن سے جوانی تک اردو بولتی رہیں لیکن آج آپ کے بچے اردو نہیں جانتے؟ کیا انہیں مسلمان نہیں کہیں گے؟ یا پھر اردو بولنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیں گے۔''

'' چھوڑو تم سے بحث کرنا ہی بیکار ہے۔'' نوشے بھائی نے قدم تیز کر دیئے۔

ہم تینوں شام کے وقت زیڑان پہنچے۔ تقی آفندی صاحب نے مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا اور ڈھاکا کے معرکہ کے بارے میں پوچھنے لگے۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں انہیں مختصراً بتایا اور پھر سونے کے لیے چل پڑا۔ اگلے روز نماز پڑھ کر میں نے نوشے بھائی کو لوٹنے کا اشارہ دیا۔ وہ اپنے ابوامی کی اجازت لے کر گھر سے نکل پڑے۔

زیڑان سے پاڑے لوٹ کر ایک دن آرام کیا اور پھر نکل پڑے۔

فردوس کا ساتھ تھا اس لیے سفر رات میں کرتے۔ پاڑے سے پارہ چنار تک کا راستہ آٹھ گھنٹے میں طے کیا اور پھر وہاں سے راولپنڈی کے لیے بس پر سوار ہوگئے بس کے بعد ٹرین پر سفر شروع ہوا۔ کراچی پہنچتے پہنچتے جوڑ جوڑ ہل گیا تھکن بری طرح سوار تھی باجی کے گھر پہنچتے ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔

باجی نے لائنز ایریا میں مکان لے رکھا تھا۔ وہاں سے نوشے بھائی کا دفتر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ پشاور سے ٹرانسفر ہونے کے بعد وہ کراچی کے ہو کر رہ گئے تھے۔ یوں بھی محکمہ خفیہ میں فیلڈ ورک کے لیے زمین تیار کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد انہوں نے زمین تیار کی تھی۔ مخبروں کا جال سا پھیلا دیا تھا ایسی حالت میں اگر ان کی ٹرانسفر ہو جاتی تو پھر نئی جگہ پر یارانہ بنانے میں وقت خرچ ہوتا، اسی لیے وہ پوری کوشش کر رہے تھے کہ کہیں اور ٹرانسفر نہ ہو۔

انہی کی کوشش سے ان کے ایک دوست نے مجھے اپنے ہاں نوکری دے دی۔ ایک پیر سے معذور آدمی کے لیے وہ بہت بڑی پوسٹ تھی۔ پڑھنا لکھنا تو میں نے بس واجبی سا سیکھا تھا مگر کتابوں سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اس لیے میرا جنرل نالج کافی وسیع تھا۔ جنرل نالج کی وجہ سے لوگ مجھے کافی پڑھا لکھا سمجھتے تھے۔ ویسے میری ڈیوٹی بھی ایسی تھی کہ کسی کو پتا ہی نہیں چل سکتا تھا کہ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک مجھے

کاریگروں پر نظر رکھنا پڑتی تھی کیونکہ ''گارمنٹس'' یورپ کے ممالک کو برآمد کیے، جاتے تھے۔ کمپنی کی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لیے ''مال'' کی الٹی ضروری تھی میں وہی دیکھتا۔

کچھ دنوں تک نوشے بھائی کے ساتھ رہا پھر میں نے الگ مکان لے لیا جو میرے کارخانے سے قریب تھا۔ اپنا جما جمایا کاروبار، مکانات اور بینک بیلنس ڈھاکا میں چھوڑ آیا تھا۔ اتنی قربانی صرف وطن کی محبت میں دی تھی مگر یہاں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ بنگلہ دیش سے آنے والوں کو یہاں والے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ انہیں بوجھ سمجھتے ہیں۔ میں نے بارہا اس کی وجہ جاننا چاہی۔ میں سوچتا، کہیں ہمارے چہروں پر لکھی شکست دیکھ کر تو انہیں ندامت نہیں ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو غلط ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کو بھی شکست ہوئی تھی کیا انہوں نے ترقی کے زینے طے کر کے اس کا منہ توڑ جواب نہیں دیا؟ لیکن میری بات سننے پر کوئی تیار نہ تھا جسے بھی سمجھاتا وہ ''چل بے بہاری'' کہہ کر منہ موڑ لیتا اور میں سوچتا وطن دوستی کی خاطر گھر لٹوانے کا بدلہ اتنی حقارت سے کیوں دیا جا رہا ہے لیکن جواب دیتا تو کون۔ سب مہر بہ لب تھے۔ وطن دوستی کی جگہ سب کی آنکھوں پر عصبیت کی پٹی باندھی جا رہی تھی۔ اسی درمیان میں نے محسوس کیا کہ ڈھاکے والا ڈرامہ یہاں کے اسٹیج پر کھیلے جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ شہر میں منصوبہ بند طریقے سے نفرت کا ماحول پیدا کیا جا رہا ہے۔ میری معذوری ان دشمنانِ وطن سے ٹکر لینے کی اجازت نہیں دے رہی تھی اس لیے سوائے کڑھنے کے کچھ نہ کر سکا۔

ایک دن تو میں ایک اشتہار دیکھ کر پاگل ہو اٹھا۔ اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ بھائی کو بھائی کے خلاف اکسایا گیا تھا۔ اس پوسٹر کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد بھی مجھے سکونِ قلب نہ ملا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے گرد ہزاروں شہیدوں کا مجمع ہے۔ ان شہیدوں کا مجمع جنھوں نے تحریک پاکستان کے لیے اپنے سر قلم کروائے تھے۔ ان کے ساتھ وہ قائدین بھی تھے جو برصغیر کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھتے تھے مگر ایک تھے ان میں نہ لسانی گروہ بندی تھی نہ مسلکی۔ سب کے سب کھرے مسلمان تھے۔ مجھے سندھ کے شیر پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور کی وہ تقریریں یاد آ رہی تھیں جو انہوں نے گوڑگاؤں کی جامع مسجد میں کی تھیں۔ فساد کی مار سے ٹوٹے ہوئے لوگوں کے درمیان جا کر وہ گرج اٹھے تھے۔

''بزدل ہندو سن لیں اگر مسلمانوں کا قتل عام بند نہ کیا گیا تو سندھ کا ایک ایک بچہ محمد بن قاسم بن کر اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے دوڑ پڑے گا اور جب سندھ کے مسلمان



اٹھ کھڑے ہوں گے تو پورا بھارت خون میں نہا جائے گا۔''

میرے کانوں میں وہ تاریخی الفاظ گونج رہے تھے کہ ایک نیا سوال ان سب پر بھاری ہو گیا۔ سب کے سب ایک ساتھ مل کر سوال کر رہے تھے۔ ''کیا ہم نے اسی دن کے لیے پاکستان بنایا تھا؟ کیا ہم نے اپنے سر اسی لیے کٹوائے تھے کہ تم سب گروہ بندی کا شکار ہو جاؤ؟ لسانی اور مسلکی تعصب پھیلا کر ملک کی جڑیں کھوکھلی کرو؟''

میں اپنے آپ میں گم تھا کہ فردوس آ گئی۔

''آپ کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس نئی ہوا کے رخ نے پریشان کر دیا ہے مجھے تو طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا ہے۔''

''آپ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں۔ لیٹ جائیں میں سر دبا دیتی ہوں۔''

دماغ پر بوجھ ہو تو پورا وجود بھاری لگنے لگتا ہے۔ میں بھی تھکن محسوس کر رہا تھا لیٹ گیا۔

فردوس سرہانے بیٹھ گئی اس کی مخروطی انگلیاں میرے بالوں سے کھیلنے لگیں۔ پورے وجود میں سنسنی سی محسوس ہونے لگی۔ دورانِ خون بڑھ گیا۔ کنپٹیاں سلگنے لگیں نسوں میں کھنچاؤ سا آ گیا۔ وہ میری بیوی تھی کُل کی کُل میری تھی لیکن مجھے اس کی زندگی عزیز تھی اسی لیے کئی سال سے درمیان میں دیوار کھڑی کر رکھی تھی وہ اونچی فصیل گرتی ہوئی محسوس ہوئی اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ کھول دیئے۔ اسے اپنی خدمت کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور آگے بڑھتا کہ جنگل والے جوگی کی ہدایت رکاوٹ بن گئی۔ ایسا لگا کہ وہ میرے کان میں کہہ رہا ہو۔ ''خبردار! تمہارے خون میں زہر پھیل چکا ہے اگر بیوی کے پاس گئے تو وہ ہلاک ہو جائے گی۔'' بروقت سرزنش نے مجھے قاتل بن جانے سے روک دیا اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''جاؤ۔ جا کر سو جاؤ۔'' کہتے ہوئے میں باتھ روم میں داخل ہو گیا کوئٹے کی برفانی ہوا بھی میرے جسم میں لگی آگ کو بجھا نہیں پا رہی تھی۔ تنگ آ کر میں شاور کے نیچے بیٹھ گیا۔ سرد موسم میں یخ پانی نے کمال کر دکھایا میرے اندر بھڑکتے ہوئے جہنم کو ایک پل میں سرد کر دیا۔

ایسا لگا جیسے میں نے تھکن کا بوجھ اتار پھینکا ہو۔ میرا پورا وجود ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ میں نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔ صبح اٹھ کر فیکٹری جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ

کچھ لڑکے آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چندے کی رسید بک تھی۔ انہوں نے پچاس روپے مانگے۔

''نہیں میں تمہیں ایک پیسا بھی نہیں دے سکتا''۔ میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں؟''

''نفاق پھیلانے والوں کی مدد کرنا میرے نزدیک جرم ہے۔ ہم پانچ انگلیاں ہیں۔ بند ہو کر مٹھی بنیں گے نہ کہ اکیلے رہ کر فریکچر کا دکھ جھیلیں۔ ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ'' میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔

''ٹھیک ہے بڈھے! تجھے دیکھ لیں گے۔'' کہتے ہوئے وہ سب باہر چلے گئے۔ ان کا زہر آلود جملہ میں نے سنا پھر بھی خاموش رہ گیا۔ بڑھاپا تجربے کار ہوتا ہے اور میں بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ ایسے وقت میں انسان جوش سے نہیں ہوش سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ میں نے بھی جوش کو دھتکار دیا۔ ''یہ بڈھا دلال ہے۔ ہماری خبریں بھی ادھر پہنچاتا ہوگا۔'' اتنا سخت جملہ سن کر بھی میں خاموش رہ گیا اور کارخانے جانے کے لیے نکل پڑا لیکن کارخانے میں زیادہ دیر بیٹھ نہ پایا۔ امن وسکون کا گہوارہ سلگ اٹھا تھا۔ ایک لڑکی کی حادثاتی موت نے پورے شہر کو آگ کے حوالے کر دیا تھا۔ ہر جانب دھواں ہی دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی اپنے گھر کی جانب بھاگا۔ تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ رکشا ٹیکسی نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ چھپتا چھپاتا بچتا بچاتا پیدل گھر پہنچا۔ گھر پہنچتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ گھر کا دروازہ مقفل تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فردوس اور ذوالفقار گئے کہاں؟ میرے پاس تالے کی دوسری چابی تھی۔ اس سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ کچھ دیر تک ان کا انتظار کیا لیکن جب رات کی سیاہی پھیلنے لگی تو میں بے چین ہو اٹھا۔ پڑوس میں فون تھا۔ ان کے ہاں سے باجی کو فون کیا مگر وہاں بھی وہ نہیں گئی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ میری پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ ساری رات ٹہلتے ہوئے گزار دی۔ صبح کی اذان کے ساتھ میں گھر سے نکل آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گئی کہاں اسے کہاں ڈھونڈوں؟ سڑکیں سنسان تھیں۔ کہیں کہیں ٹائروں کی راکھ پڑی تھی۔ انہیں پھلانگتا ہوا میں بڑھا جا رہا تھا کہ آواز آئی۔ ''رک جاؤ۔''



میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک دکان کی آڑ سے نکل کر تین پولیس والے میری جانب بڑھ رہے تھے۔ نزدیک آ کر انہوں نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

''اپنی بیوی کو تلاش کرنے۔''

''بہانہ بناتا ہے۔ لنگڑے!'' ایک سپاہی نے رائفل کی نال سے مجھے دھکا دیا۔ ''چل تھانے' وہیں چل کر صحیح بات بتائے گا۔''

دوسرے سپاہی نے پیچھے سے میرے کالر کو پکڑ لیا۔ میں نے بے چارگی سے ادھر اُدھر دیکھا۔ مجھے کسی افسر کی تلاش تھی لیکن کوئی ہوتا تو نظر آتا۔ لاچار ہو کر میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہ تینوں مجھے اس طرح گھیرے میں لیے ہوئے تھے گویا میں بہت ہی خطرناک قسم کا مجرم ہوں اور موقع ملتے ہی دوڑ لگا دوں گا۔

بے ساکھی کے سہارے کھٹ کھٹ کرتا ہوا میں ان کے ساتھ گھسٹ رہا تھا کہ ایک وین آ کر رکی۔ اس پر بیٹھے ہوئے افسر نے پوچھا کون ہے یہ؟

''سر، یہ کوئی واردا تیا ہے۔ ہمیں دیکھ کر بھاگ رہا تھا' بس ہم نے دوڑ کر دبوچ لیا۔'' ایک سپاہی نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک پیر سے کیسے بھاگ رہا تھا؟'' افسر نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ سپاہی جواب میں کچھ کہتا' میں بول پڑا۔ ''اگر آپ کہیں تو میں حقیقت بتا دوں؟''

''ہاں' بولو۔''

''کل سے میری بیوی اور بچہ غائب ہے۔ انہیں ڈھونڈنے نکلا تھا کہ انہوں نے روک لیا۔ جب کہ یہ خود ڈیوٹی دینے کی بجائے چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے۔''

افسر نے غصے سے سپاہیوں کو دیکھا پھر مجھ سے بولا۔ ''ہاں تو جناب آپ کی بیوی کب سے غائب ہے؟''

''کل سے میں جب کارخانے سے لوٹا تو وہ گھر پر نہیں تھی۔''

''آپ نے رپورٹ لکھائی؟''

''جی نہیں۔''

''آیئے وین میں بیٹھ جایئے۔''

افسر کا حکم سنتے ہی میں وین میں بیٹھ گیا۔ اگلی چورنگی کے بعد ہی تھانے کی عمارت تھی۔ وہاں پہنچتے ہی افسر نے کہا۔ ''آپ ذرا اس پیڑ کے نیچے رکھی لاش کو دیکھ لیں۔ آج صبح ہی ہمیں ایک گلی میں پڑی ملی ہے۔''

''لاش! کس کی لاش؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی عورت کی ہے۔''

''عورت کی لاش!'' کہتا ہوا میں پیڑ کی جانب دوڑا۔ بیس سے پچیس فٹ کا فاصلہ کئی ہزار میل بن گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا میرے اکلوتے پیر میں کئی من وزنی پتھر بندھا ہو۔ پیر اُٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ بہ مشکل میں لاش کے نزدیک پہنچا اور گہری سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ لاش پر پیڑ کا سایہ تھا اس لیے خدوخال نظر نہ آتے تھے پھر ذہن پر بوجھ بھی تھا۔ جبھی تو میں نے کپڑوں پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ لاش کسی ادھیڑ عمر کی گوری عوت کی تھی جب کہ میری فردوس سانولی تھی۔ پُر شباب تھی اور اکہرے بدن کی تھی۔ ساڑھی پہنتی تھی۔ وہ لاش کسی قد آور عوت کی تھی جس کے بدن پر شلوار قمیص تھی۔

انسان صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنے دکھ میں غمگین ہوتا ہے۔ دوسرے کے درد کو اپنا نہیں سمجھتا۔ اس وقت میرے دماغ پر فردوس چھائی ہوئی تھی۔ ہر جانب اسی کا پرتو نظر آ رہا تھا تبھی تو اس لاش کو دیکھ کر میں نے سکھ کی سانس لی تھی اودواپس مڑ گیا تھا۔

پولس افسر کو رپورٹ لکھا کر میں باہر نکل آیا۔ تمام سڑکیں ویران تھیں۔ کرفیو کا نفاذ نہیں ہوا تھا پھر بھی کرفیو کا سماں تھا۔ میں بغیر سوچے سمجھے دیکھے بھالے بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ ایک جگہ سڑک پر اینٹ پتھر بکھرے ہوئے دیکھے۔ جلے ہوئے ٹائروں کی راکھ بھی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں دونوں فریق ٹکرائے ہوں گے۔ یوں بھی یہ سڑک ایک طرح سے بارڈر سمجھی جاتی تھی۔ اس کے دونوں جانب مسلمان تھے۔ ایک خدا، ایک رسول ایک کتاب پر دونوں کا ایمان تھا مگر دنیا کی بولی کو اپنا تشخص سمجھ بیٹھے تھے اور جہنم میں اپنی سیٹ ریزرو کرانے کے لیے احکام خداوندی کا صریحا مذاق اڑا رہے تھے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور وہ کہہ رہے تھے نہیں ہماری زبان جاننے والا ہمارا بھائی ہے۔

میں حیرت بھری نظروں سے کھڑا دیکھ رہا تھا کہ دور سے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ کہیں پھر تھانے کے لئے دوڑ نہ لگانا پڑے، اسی ڈر سے میں ایک گلی میں گھس گیا۔ اس تنگ گلی



میں گھستے ہی میرا دل دھڑک اٹھا۔ وہ گندی گلی تھی ہر جانب گندگی بکھری تھی۔ گھروں سے پھینکی گئی گندگی کے اس ڈھیر پر ایک عورت پڑی تھی۔ اس کے بدن پر سرخ پرنٹیڈ سوٹ تھا۔ مجھے وہ سوٹ جانا پہچانا لگا اور میں تیزی سے نزدیک پہنچ گیا۔ لاش کو سیدھا کرتے ہی میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میری فردوس تعصب کی گندگی کی نذر ہو گئی تھی۔ پتا نہیں اسے کس جرم کی سزا دی گئی تھی۔ اس کی مادری زبان بنگلہ تھی مگر میری خاطر اردو بولتی تھی۔ پاڑے میں رہ کر پشتو بھی سیکھ گئی تھی۔ تینوں زبانیں روانی سے بولتی تھی۔ معلوم نہیں اسے کون سی زبان بولنے کی سزا دی گئی تھی۔ وہ علاقہ مخلوط آبادی والا تھا۔ تمام گھر خالی پڑے تھے۔ سب اپنے اپنے علاقے میں چلے گئے تھے۔ اس لیے میں کسی پر بھی شک نہیں کر سکتا تھا۔

''اے کون ہو تم چیخے کیوں تھے؟'' گلی کے اگلے سرے سے آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ گلی کے سرے پر کئی سپاہی کھڑے تھے سب کی بندوقیں میری جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور پھر اشارے سے لاش دکھائی وہ سب قریب آ گئے۔ ''لاش کس کی ہے؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔

''میری بیوی کی ہے۔'' میں نے رندھے گلے سے جواب دیا۔

''کس نے مارا اسے؟''

''ہماری غلطیوں نے۔ ہماری کوتاہیوں نے۔ ہم نے ماضی سے سبق نہیں لیا۔ پاکستان بنانے کے مقصد کو بھلا بیٹھے۔ اسی غلطی نے اسے مارا۔''

میں کچھ اور بھی کہتا کہ افسر نے سپاہیوں سے کہا ''لاش اٹھا کر وین میں رکھو لگتا ہے لنگڑے کا دماغ پھر گیا ہے۔ اسے بھی لے چلو۔''

سپاہیوں نے لاش اٹھا لی، مجھے بھی وین پر سوار کر لیا اور پھر تھانے لا کر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے اول تا آخر ساری بات بتا دی۔ اس افسر کا نام بھی بتا دیا جس نے مجھے پہلی لاش دکھائی تھی۔ ٹیلی فون پر اس سے بھی رابطہ کیا گیا اس نے تصدیق کر دی۔

پوسٹ مارٹم کے بغیر لاش ملنا مشکل تھی میں آنسو بہانے کے لیے گھر لوٹ آیا۔ بیوی کی لاش مل چکی تھی، بیٹے کے بارے میں فکر مند تھا۔ اسے کہاں تلاش کروں یہی سوچ رہا

تھا۔ مگر گھر آ کر بھی چین نہ ملا فکر مندی کے بوجھ تلے دبا ہوا میں لیٹا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کا لباس بتا رہا تھا کہ اس کا شمار طبقہ امرا میں ہوتا ہے۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔

''آپ کے ہاں کسی بچے کا نام ذوالفقار ہے؟''

''جی، میرے بیٹے کا نام ہے۔'' میں نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔

''اس کی کوئی پہچان؟''

''وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتا ہے۔ مگر بنگلہ ّراٹے دار جانتا ہے۔''

''وہ میرے بنگلے پر ہے۔''

اس کا جواب سنتے ہی میں نے کہا۔ ''وہ زندہ ہے نا؟''

''ہاں، مگر بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے پتا بتایا ہے۔''

''مجھے لے چلیے میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' بے صبری میرے لہجے سے عیاں تھی۔

''ٹھیک ہے چلیے۔'' وہ مڑ گیا۔

میں نے دروازے میں تالا لگایا اور اس کے ساتھ نکل پڑا۔ سڑک پر بڑی سی کار کھڑی تھی۔ اس نے اگلا دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے کار اسٹارٹ کر دی۔ راستے میں اس نے بتایا۔ ''میں اپنے گھر لوٹ رہا تھا کہ مجھے ذوالفقار نظر آ گیا۔ حالات خراب تھے۔ سنسان سڑک پر روتے ہوئے بچے کو دیکھ کر میں رُک گیا تھا اور پھر اسے کار میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ پہلے تو وہ کار میں بیٹھنے کو تیار نہ تھا لیکن میں نے زبردستی اسے بٹھا لیا۔ گھر لا کر رات بھر اس سے سوالات کرتا رہا کچھ خوف اور کچھ اردو سے ناواقفیت کے باعث ذوالفقار کا جواب میرے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میری سمجھ میں بس اتنا آیا کہ وہ ضیغم عابدی کا بیٹا ہے اور اس کی ماں کو شرپسندوں نے مار دیا ہے۔ اس نے اٹک اٹک کر گھر کا پتا بھی بتایا تھا۔''

ان باتوں کے درمیان طویل راستہ طے ہو گیا۔ اب کار ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی کسی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ ایک شاندار عمارت کے سامنے اس نے کار روک دی۔ میں نے عمارت کا سرسری نگاہوں سے جائزہ لیا اور کار سے باہر نکل آیا۔ وہ خود بھی کار سے اتر گیا تھا اور



بند گیٹ کھولتے ہوئے بولا۔ ''میرا چوکیدار کل سے غائب ہے۔ پتا نہیں کہاں گیا؟''

میں نے بے ساکھی پر وزن ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ نے پتا نہیں کیا؟''

''پولیس میں رپورٹ لکھا دی ہے۔'' اس نے گیٹ کھول کر کار کو اندر لے جاتے ہوئے کہا۔ کار کے پیچھے پیچھے میں بھی اندر داخل ہو گیا۔ پورچ میں کار روک کر وہ اتر پڑا اور پھر مجھے سہارا دے کر اندر لے گیا۔ میں تو پہلے ہی اس کی بارعب شخصیت سے مرعوب تھا کمرہ نشست کی سجاوٹ دیکھ کر مزید مرعوب ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو بہت حقیر محسوس کر رہا تھا۔ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس غریب ملک میں اتنی تعیش پسند ہستیاں بھی رہتی ہیں۔ ابھی میں اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ درمیانی عمر کی ایک عورت داخل ہوئی اس نے بہت قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کی انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ بھی تھا۔ اس نے سامنے والے صوفے پر اپنے آپ کو گرا سا دیا پھر لمبا کش لے کر دھواں اگلتے ہوئے بولی۔ ''سنا وہ بابا تمہارا ہائے۔''

''جی''۔ میں نے دھیرے سے کہا۔

''تم اس کو ارڈو نائی سکھایا۔'' اس نے دوسرا کش لیا۔

''جی، وہ ڈھاکے میں پیدا ہوا تھا وہیں کی زبان سیکھی ہے اس نے۔''

''وہاں اتنا سویٹ لینگویج نائی سیکھایا۔ آئی لو ارڈو۔ میں ٹو ارڈو کو بہوت پیار کرتا۔''

اس کے تلفظ سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ یورپی ہے۔ اس سے باتیں کرنے کی خواہش مطلق نہ تھی پھر بھی وقت گزاری کے لیے میں نے پوچھ لیا۔ ''آپ کا نام؟''

''فے ٹی ما۔''

اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ غیر ملکی ہے۔ کس ملک کی ہو گی۔ یہی سوچ رہا تھا کہ وہی بارعب شخص داخل ہوا اور بولا۔ ''فاطمہ! تم نے چائے کے لیے کہا؟''

''جی ہاں۔'' اس عورت نے جواب دیا۔

میں چکرا کر رہ گیا کہ یہ فاطمہ ہے یا فے ٹی ما۔ اس پر غور کر رہا تھا کہ ایک نوکر کے ساتھ ذوالفقار داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے بانہیں پھیلا دیں اور وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

اس نے سسکیوں کے درمیان بتایا کہ جب وہ اور فردوس شاپنگ کر کے لوٹ رہے تھے تو بلوہ ہو گیا۔ وہ دونوں پناہ لینے کی خاطر ایک گلی میں گھس گئے۔ گلی میں پہلے سے ہی بلوائی

جمع تھے۔ انہوں نے دونوں سے سوالات کیے۔ فردوس اردو پشتو دونوں زبانیں روانی سے
سکتی تھی مگر ان زبانوں پر اسے مکمل عبور نہیں تھا بلوائیوں نے اسے مخالف فریق کا سمجھ کر
حملہ کر دیا۔ ذوالفقار نہ اردو بول سکتا تھا نہ پشتو اس لیے اسے بنگالی سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس کی
سن کر میں نے آنسو پونچھے اور دل ہی دل میں سوچا۔ جسے دشمن نہ مار سکے اسے اپنوں نے
دیا۔ جو بنگالن تھی اسے بنگالی نہ سمجھا گیا اور جو بنگالی نہیں تھا اسے بنگالی سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

لیجیے چائے پیجیے۔'' بارعب شخص نے کہا۔

میں نے چونک کر پیالی کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ چائے پینے کے بعد اجازت
کی اور اسلامی ملک کے فرنگیوں ایسے خاندان سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔ اتفاقاً ایک
ٹیکسی مل گئی جس نے مرکزی سڑک تک پہنچا دیا وہاں سے پیدل گھر آ گیا۔

فردوس کے بغیر گھر سُونا سُونا تھا۔ کل تک جو گھر کی زینت تھی، وہ جنونیوں کا شکا
گئی۔ اس کی لاش بے والی وارث مردہ خانے میں پڑی تھی۔ مجھے عجیب سا لگ رہا تھا۔
سے پھٹا جا رہا تھا۔ چودہ سال کا ساتھ ایک پل میں ٹوٹ گیا تھا بلکہ توڑ دیا گیا تھا۔
عفریت نے اسے نگل لیا تھا۔ میں جانتا تھا۔ یہ سب کچھ منصوبہ بند سازش کا ایک حصہ ہے۔

قائداعظم نے فرمایا تھا کہ پاکستان اسلام کا قلعہ ہوگا۔ مگر دشمن کبھی قلعے کا وجو
نہیں کرتے۔ ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اسے ڈھا دیں۔ قلعے کو ڈھا دینے کے لیے س
آنا پڑتا ہے اور مسلمان ہمہ وقت سربکف رہتے ہیں اسی لیے وہ چھپ چھپ کر وار کر
ہیں۔ ان کا سب سے بڑا ہتھیار تعصب کا خنجر ہے۔ وہ اسی سے وار کر رہے ہیں۔ قلع
سینندھ لگا رہے ہیں اور بھائی بند ان کے آلہ کار بن رہے ہیں۔

☆=====☆=====☆



میں نے فردوس کا خون بہا معاف کر دیا تھا۔ کسی شخص یا گروہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا
تھا کیونکہ قتل صرف قاتل کرتے ہیں اور قاتل کبھی ذہنی طور پر نارمل نہیں ہوتے۔ جو نارمل نہیں
ہوتے وہ مکمل انسان نہیں ہوتے اور نامکمل انسان سے قتل کا فعل سرزد ہو جائے تو اسے قومی سطح پر
نفرت کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تعصب کے خلاف جہاد کا فیصلہ کر لیا۔
ابنارمل بننے والے لوگوں کو سدھارنے کا بیڑا اٹھا لیا۔ کچھ ہم خیال بھی مل گئے اور میں مصروف
ہو گیا۔

آہستہ آہستہ میں فردوس کے غم کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خدا کی مرضی سمجھ کر صبر
کر لیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ذوالفقار کا ننھا سا ذہن بھولنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے۔ وہ اس
واقعہ کے بعد سے سہم کر رہ گیا ہے۔ ہر وقت چپ چپ سا رہتا ہے۔ پتا نہیں کیا سوچتا رہتا
ہے۔

میں اکیلا تھا، معذور تھا، اس لئے اسے باجی کے گھر چھوڑ نہیں سکتا تھا ہمارا گھر
قبرستان ایسا بن گیا تھا بس دو چلتی پھرتی قبریں رہا کرتی تھیں۔ ماسی کھانا پکا دیا کرتی تھی اور ہم
کھا لیا کرتے تھے۔

گھر کی زینت گھر والی سے ہوتی ہے۔ چودہ سال تک فردوس نے میرے گھر کو
جنت نظیر بنائے رکھا۔ میں اس کا عادی بن چکا تھا۔ اس کے بغیر گھر جہنم محسوس ہوتا تھا۔ میں
کارخانے سے گھر لوٹنے کی بجائے کبھی صدر اور کبھی طارق روڈ نکل جاتا تھا۔ انسانوں کے
جنگل، میں آوازوں کے شور میں اپنے آپ کو گم کر دینے کی کوشش کرتا تھا۔ اس دن بھی میں
ایمپریس مارکیٹ کے گیٹ پر کھڑا ٹھیلے اور خوانچہ والوں کی صدائیں سن رہا تھا کہ ایک جانی
پہچانی آواز سنائی دی۔ ''کیسے ہو ضیغم؟''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک قدم کے فاصلے پر زبیدہ کھڑی تھی۔ میں نے اس کے

چہرے پر نظر ڈالی جہاں وقت نے اپنی مہر ثبت کر دی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا بھری بہار میں خزاں نے دھاوا بول دیا ہے۔ اس کے ساتھ سات آٹھ سال کی ایک بچی تھی۔ میں نے اس کے گال کو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ بچی تمہاری ہے؟''

''ہاں، دکھ جھیلنے کے لئے میں نے اپنی وارث پیدا کر دی ہے۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''عورت تو دکھ جھیلنے کے لئے پیدا ہوتی ہے ناں، میں نے بھی غم اٹھائے میرے بعد یہ بھی اٹھائے گی۔''

اس کا لہجہ یاسیت کا مظہر تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''آؤ چلو کسی ریستوران میں بیٹھتے ہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''اگر چاہو تو میں تمہیں اپنے گھر لے چلوں۔ قریب ہی میرا گھر ہے۔''

''چلو۔''

میری اجازت ملتے ہی اس نے رکشا روکا اس کے ساتھ میں بھی بیٹھ گیا۔

رکشا فراٹے بھر رہا تھا اس سے بھی تیزی سے میرا ذہن دوڑ رہا تھا میں زبیدہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اتنی بڑی جاگیر کی مالک سینکڑوں ہاریوں پر راج کرنے والی دولت کی گود میں پلنے والی قلبی سکون کے لئے ترس رہی ہے۔ اس نے جو چاہا تھا وہ نہیں پایا۔ ساری تمنائیں راکھ ہو گئیں اس کی تمنا میں پوری کر سکتا تھا مگر مجبور تھا۔ میرے بس سے باہر کی بات تھی۔

''اے، کس خیال میں ڈوبے ہو، اترنا نہیں؟'' اس کی آواز نے چونکا دیا اور میں جلدی سے نیچے اتر آیا۔

رکشا سے اتر کر میں نے کرایا ادا کیا اور اس کے ساتھ فلیٹس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ اس نے فلیٹ کا تالا کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کر کے خود پڑوس کے فلیٹ میں چلی گئی۔

میں نے بچی کو آگے چلنے کا اشارہ دیا اور بے ساکھی کا سہارا لے کر خود بھی اندر داخل ہو گیا۔

وہ دو کمروں کا فلیٹ تھا، اس کے چہرے کی طرح اجڑا اجڑا سا۔ سامان بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھیلا ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ تمام دلچسپیوں کو بھلا کر زندہ رہنے کی چاہت کھو



بیٹھی ہے۔

میں ابھی پہلے ہی کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ زبیدہ واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی اس نے چائے کے لوازمات میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے چائے پی لو پھر باتیں ہوں گی۔''

میں نے بسکٹ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا شوہر کتنے بجے آتا ہے۔''

اس کے ہونٹوں پر یاسیت بھری مسکراہٹ تیر گئی۔ اس نے نگاہیں جھکا کر جواب دیا۔ ''اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔''

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا، اب وہ نہیں آتا؟''

''ہاں! بڑھاپے کی گود میں جوانی مچل سکتی ہے لیکن جوانی کی گود میں بڑھاپا نہیں۔''

اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''ہماری عمر میں تضاد تھا یہ تو تم جانتے ہو؟''

''ہاں۔''

''جب وہ جوانی کی دہلیز پر پہنچا تو میں بڑھاپے کی منزل پر کھڑی تھی۔''

''کون کہتا ہے کہ تم بوڑھی ہو چکی ہو۔''

''میرا شوہر۔'' وہ محو یاس نظر آ رہی تھی۔

''وہ غلط کہتا ہے۔''

''نہیں! وہ سچا ہے۔ عورت بیس کے بعد سے ڈھلنے لگتی ہے جب کہ مرد بیس کے بعد جوان ہوتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب وہ میرے کمرے میں پہلی بار آیا تھا تو اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور میں بائیس سال کی تھی۔ خاندانی روایت کو اس نے چار سال تک نبھایا لیکن اس کے سینے میں بھی دل تھا۔ دل میں ارمان بھی تھے۔ آخر وہ کب تک اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹتا۔ تھک کر ہتھیار ڈال بیٹھا۔'' وہ کھڑکی سے باہر دور افق پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔ ''اسے ڈر تھا والدین کا۔ رشتے داروں کے طعن و تشنیع کا۔ مرد ہوتے ہوئے بھی وہ فرسودہ روایات کی زنجیروں کو جھٹک نہ پایا تھا۔ اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھر رہا تھا۔ اس کا یوں ٹوٹنا بکھرنا مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں نے......''

وہ پھر خاموش ہوگئی۔ کمرے میں بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ میں بھی مہر بہ لب اسے دیکھتا رہا۔ اسے رو لینے کا وقت دینا چاہتا تھا۔ دل میں غبار جمع رہے تو نقصان کا باعث بنتا ہے اسے باہر نکالنے کا موقع دے رہا تھا تاکہ وہ خود بھی گھٹن کے خول سے باہر نکل آئے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ لی تھی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر کوئی شانہ نہیں تھا جس پر سر رکھتی۔

کمرے میں چھائے سکوت کو خود اس نے توڑا۔ ''بارود گیلی ہوئی ہو تو جلتی ہوئی تیلی بھی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ وہ بھڑکتا ہوا شعلہ تھا اور میں گیلی لکڑی جو دھواں تو دے سکتی ہے گرما نہیں سکتی۔ اسے زندگی کی دلچسپیاں مطلوب تھیں جو میں نے اسے خیرات میں دے دیں۔ میرے ایک ہاری کی بیٹی تھی۔ جمالہ نام تھا۔ خدا نے اسے حسین صورت تو دی تھی مگر قسمت کی کھوٹی تھی ماں بچپن میں مرگئی۔ باپ نے بھی موت کی گود میں منہ چھپالیا۔ بے سہارا جان کر میں اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ کچھ ہی دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اس میں دلچسپی لینے لگا ہے۔

مرد جب کسی عورت میں دلچسپی لینے لگے تو سمجھ لو پاپ کا باب کھلنے والا ہے۔ میں نے قاضی کو بلایا اور اپنا حق اس بے سہارا کو سونپ دیا۔ اب وہ دونوں خوش ہیں۔ ان کی خوشیوں کو زمانے کی نظر نہ لگ جائے، اس ڈر سے میں نے دونوں کو امریکا بھیج دیا ہے۔ وہ دونوں وہیں سیٹ ہوگئے ہیں۔ گوٹھ میں کسی کو خبر نہیں کہ میں اب صرف اس کی برائے نام بیوی ہوں۔ اس لئے بنگلہ کرائے پر دے رکھا ہے۔ صرف میرا ذاتی ملازم علی سومرو جانتا ہے کہ میں اس چھوٹے سے فلیٹ میں ہوں وہ فصل کی آمدنی لاکر دے دیتا ہے جسے میں ہر دو تین ماہ کے بعد مختلف ذرائع سے امریکا بھیج دیتی ہوں۔''

اپنی کہانی ختم کرکے وہ خاموش ہوگئی۔ وہ رو دے تو دل کا غبار آنکھوں سے نکل آئے، یہ سوچ کر میں نے پوچھا۔ ''یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کاٹو گی؟''

''میں مشرق کی بیٹی ہوں، اسلام شوہر کی تابعداری کا درس دیتا ہے۔ شوہر کی خوشی میں خوش رہ کر زندگی گزار لوں گی۔''

''اور بیٹی؟''

''اس کے نام پر پانچ لاکھ ڈپازٹ ہے پھر اس کے باپ نے لکھ کر دے دیا ہے کہ میری جائیداد سے اسے کوئی مطلب نہیں ہے۔ وہ بھی اسے ہی ملے گی۔''



''ایک بات کہوں مانو گی؟''

''بولو، تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔''

''اپنی بیٹی مجھے دے دو۔ میں اسے ذوالفقار کے نام پر وقف کرنا چاہتا ہوں۔''

''نہیں۔'' میری چاہت میں دیوانی بن جانے والی کے انکار نے مجھے گنگ کر دیا۔ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''ضیغم! وہ دن قصہ پارینہ بن گئے جب ہر مسلمان دوسرے کا بھائی ہوتا تھا۔ قرآن ہر گھر میں موجود ہے مگر جزدان میں بند۔ اس پر اتنی مضبوط گانٹھ لگا کر رکھی جاتی ہے کہ کہیں اس کے احکام پر عمل نہ کرنا پڑ جائے۔ مفاد پرستوں نے ہمیں اتنے خانوں میں بانٹ دیا ہے کہ اب ہم دریا کے دو کنارے بن چکے ہیں۔''

''دریا پر پل بھی تو بنایا جاسکتا ہے۔''

''کون بنائے گا؟ اگر کوشش کرو گے تو کفر کا فتویٰ لگا کر سنگسار کر دیے جاؤ گے۔ الزام ثابت کرنے کے لئے ہزاروں بہانے ہیں۔ کس کس پھندے سے بچو گے؟ وہ وقت اور تھا جب تم پہلی بار علی گوٹھ آئے تھے تب ہمارا ایمان تازہ تھا۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ یہاں کا ہر فرد مسلمان تھا۔ نہ کوئی سندھی تھا نہ مہاجر، نہ پنجابی تھا نہ پٹھان نہ شیعہ تھا نہ سنی۔ سب کے سب ایک نبی کا کلمہ پڑھنے والے تھے۔ ایک قرآن پر سب کا ایمان تھا۔''

''تو کیا اب ایمان بدل گیا ہے؟'' میں سب کچھ سمجھ رہا تھا پھر بھی پوچھ لیا۔

''ایمان تو ہے مگر ثبوت نہیں۔ قرآن تو ہے مگر عمل نہیں۔ اگر میں نے اپنی بیٹی تمہیں دے دی تو علی گوٹھ سے میرا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ میری بیٹی بھی تمہارے گھر میں خوش نہ رہ پائے گی۔''

سچ کڑوا ہوتا ہے پھر بھی نگلنا پڑتا ہے۔ میں حقیقت کو جھٹلا نہ سکا اور بوجھل قدموں سے لوٹ آیا۔

مجھے زبیدہ کی تباہ حال زندگی پر رونا آرہا تھا۔ گھر آکر میں نے اپنے جسم کو بستر پر گرا دیا۔ میں بھی اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔ کوئی مرجاتا ہے تو اتنا دکھ نہیں ہوتا مگر مرتے ہوئے کو دیکھ کر دل غم سے پھٹ جاتا ہے۔ زبیدہ بھی گیلی لکڑی کی طرح سلگ سلگ کر راکھ ہو رہی تھی۔ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نوشے بھائی آگئے۔ خلاف توقع ان کے چہرے پر سنجیدگی طاری

تھی۔ سمندر ایسا سکوت چھایا تھا جو آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔

انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ضیغم! تم میرے رشتے دار ہو اس لئے میں اپنے پیشے سے غداری کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ ایسا جرم کرنے والا ہوں جس کے بعد اپنی نوکری سے استعفٰی دینا ناگزیر ہے۔ تم جانتے ہو میرا محکمہ ملک کی بقا کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے رہتا ہے اور ملکی سالمیت کے لئے محکمے کا راز افشا کرنا بھی جرم ہے ہم ہر اس مشکوک شخص پر نگاہ رکھتے ہیں جو ملکی سالمیت کے لئے سم قاتل ہے۔ پھر بھی رشتے داری کی وجہ سے میں بتا رہا ہوں کہ ذوالفقار بھی ایسی ہی ایک تنظیم سے وابستہ ہو گیا ہے جو لسانی بنیادوں پر مسلمانوں کو ٹکڑوں میں بانٹنے کی سازش کر رہی ہے۔ اس سازش میں ذوالفقار کا کردار نہایت اہم ہے اسے صراط مستقیم پر چلنے کی ترغیب دو ورنہ تباہی اس کا مقدر بن جائے گی۔''

وہ تو اپنا غصہ دکھا کر چلے گئے مگر مجھے شعلوں میں جلتا چھوڑ گئے۔ غم و غصے کی آگ نے مجھے جنونی بنا دیا۔ اور میں نے زندگی کا سب سے خطرناک فیصلہ کر لیا۔ میں جس کرسی پر بیٹھ کر لکھتا ہوں، وہ لوہے کی ہے۔ اس کے پائے سے میں نے بجلی کا تار منسلک کر دیا ہے۔ صرف بٹن دبانے کی دیر ہے۔ اس لئے میں تیز تیز لکھ رہا ہوں۔ ذوالفقار کے آنے سے پہلے میں آخری سطر لکھ لینا چاہتا ہوں۔ صرف اس امید پر یہ ڈائری لکھ رہا ہوں کہ میری باتیں سند و فقہ رہیں۔ جس کام میں میری معذوری رکاوٹ بن گئی ہے، اسے ہماری نئی نسل پورا کر دے۔ ملکی سالمیت کے لئے سم قاتل جسے لوگ عصبیت کہتے ہیں، اس کے خلاف سینہ سپر ہو سکے۔

نوٹ: جس شخص نے مجھے ڈائری دی تھی اس نے اخبار کا ایک تراشہ بھی دیا تھا اس تراشے کی خبر کے مطابق ایک گھر سے دو آدمیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ ان میں ایک جوان تھا جس کے نرخرے کو کسی درندے نے چبا لیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق درندے کے دانتوں میں مہلک زہر تھا جس کی وجہ سے نوجوان کا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ دوسری لاش درمیانی عمر کے ایک لنگڑے کی تھی جس کی کرسی سے بجلی کا ننگا تار چھو گیا تھا اور بجلی کے جھٹکوں نے اس کی جان لے لی تھی۔

......ختم شد......